ہری ہے شاخِ تمنّا ابھی





آسیہ مرزا

ہری ہے شاخ تمنا ابھی

آسیہ مرزا

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مولوی خضر محمد شاہ نے اشک آلود آنکھوں سے قرآن پاک کو بند کر کے چوما پھر احتیاط سے جزودان میں لپیٹ کر رحل پر رکھ کر بخت بی بی کی طرف دیکھا۔

''ہوں۔کچھ کہنے آئی تھیں؟'' انہوں نے تکیے کے نیچے سے تسبیح نکالی اور اسی تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے۔

''کہنے تو کیا، یاد دلانے آئی تھی۔'' بخت بی بی نے رحل سمیت قرآن پاک اٹھا کر الماری کے اوپر رکھا اور دوبارہ تخت پر آکر بیٹھ گئیں۔

''آج ہماری مومنہ آرہی ہے۔''

''ہاں یاد ہے مجھے۔ بھلا آج کی تاریخ بھی بھولنے والی ہے۔'' مولوی خضر محمد کا بوڑھا باریش چہرہ چمکنے لگا۔ مسکراہٹ کے بہت سے جگنو آنکھوں میں اتر آئے۔

''سر جن مومنہ کہو نیک بخت۔'' وہ بے اختیار مسرور انداز میں بولے۔

''آپ جائیں گے اسے ریسیو کرنے؟''

''میں۔'' انہوں نے چونک کر بیوی کی شکل دیکھی پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولے۔

''نہیں۔اسے ریسیو کرنے والے بہت ہیں۔''

"لیجئے۔ یہ کیا بات ہوئی؟" بخت بی بی نے تعجب سے شوہر کو دیکھا۔

"بھلے سے اور بہت ہوں گے مگر وہ آپ کو دیکھ کر بڑی خوش ہو گی۔"

"ہاں شاید۔ مگر پتا نہیں۔" مولوی خضر محمد نے کچھ کہتے کہتے ایک گہری سانس لی پھر دھیمے لہجے میں بولے۔

"میں چاہتا ہوں وہ خود میرے پاس یہاں آئے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں اسے میں کتنا یاد ہوں۔ وہ کب آتی ہے میرے پاس اور آتی بھی ہے یا نہیں۔" انہوں نے سر جھکا لیا اور پیروں پر لحاف کھینچ لیا۔

"آپ تو بالکل بچوں کی سی بات کر رہے ہیں۔" بخت بی بی مسکرانے لگیں مگر وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ آہستگی سے بولے۔

"وہ اعلیٰ عہدے دار طارق احمد کی بیٹی ہے۔"

بخت بی بی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ عام دنوں سے زیادہ خوش بھی تھے مگر کوئی سوچ انہیں پریشان بھی کر رہی تھی۔ کوئی نادیدہ سا خوف کہیں دل کی دیواروں سے لپٹ رہا تھا۔

"بے شک مولوی جی! پر وہ آپ کے زیر سایہ کئی برس رہی ہے۔ خون سے زیادہ تربیت اور محبت کا رنگ پکا ہوتا ہے۔ کیا آپ کو اپنی تربیت پر اعتبار نہیں ہے۔"

"بسا اوقات فاصلے بہت سے رنگ مدھم کر دیتے ہیں۔ جدائی بڑی جاں سوز ہوتی ہے اور لوگوں کا بدل جانا بھی تو جدائی ہی ہے نا۔ مگر... خدا نہ کرے کہ وہ مجھ سے کبھی اس طرح جدا ہو۔" وہ جیسے اپنے ہی خوف سے لرز گئے جبکہ بخت بی بی ان کی باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولیں۔

"میں تو کہتی ہوں چلے جائیں۔ ناحق بچوں کی سی ضد لے کر بیٹھے ہیں۔ میں تو ضرور جاتی مگر ان پیروں کے درد نے کہیں کا نہیں رکھا اور پھر فلائٹ بھی رات کی ہے۔ ٹھنڈ پہلے ہی خاصی ہے۔"

"ارے نیک بخت! تم کیا جانو محبت میں انسان بالکل بچہ بن جاتا ہے۔ چاہے جانے کا خواہش مند، التفات کا خواہاں۔ اس کا دل کرتا ہے اسے چاہا جائے تو اس کا اظہار بھی ہو۔ محبت انسان کو بچہ ہی بنا دیتی ہے۔" وہ ہلکی سی سانس بھر کر غیر مرئی نقطے کو گھورنے لگے۔

"شاید خوف زدہ بھی ہو جاتا ہے کہ وہ جس کے لئے اپنے دل میں بہت سا پیار محسوس کر رہا ہے دوسرا بھی اسے اتنا ہی چاہتا ہے؟ اسے محسوس کرتا ہے جس کی محبت کے لعل و گہر سینت سینت کر دل میں رکھ رہا ہے۔ وہ اس کی قدر بھی کرے گا کہ نہیں؟ بس نیک بخت یہ دل چیز ہی ایسی ہے۔" مولوی خضر محمد یہ کہتے ہوئے بخت بی بی کا چہرہ دیکھنے لگے پھر ہنس پڑے۔

"بس رہنے دیں۔ مجھے تو آپ کی باتیں بالکل سمجھ نہیں آتیں۔ کیا اول فول بولتے رہتے ہیں۔" وہ جھلا سی گئیں اور اٹھ گئیں۔

"خیر۔ یہ مذاق کی باتیں ہیں۔ میرا در اصل یہاں رہنا بے حد ضروری ہے۔ بہت اہم فون آنے والا ہے۔"

"غازی شاہ کا؟" بخت بی بی جھٹ پلٹ کر خوشگوار مسرت سے لبریز ہو کر پوچھنے لگیں تو مولوی خضر محمد نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں چپ کرا دیا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں نیک بخت۔ کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ آہستہ نہیں بول سکتیں تو چپ ہی رہ لیا کرو۔"

"میں تو ترستی ہوں بچے کی صورت دیکھنے کو۔ خدا اسے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ سرکاری خونی بھیڑیے تو اسے چاروں طرف سے گھیرنے کی تگ ودو میں ہیں۔ الٰہی تو ہی میرے بچے کا حامی وناصر ہے۔ تو اس کی حفاظت فرمانا۔" بخت بی بی دل مسوس کر کمرے سے نکل گئیں۔ مولوی خضر محمد نے ہلکی آواز میں "آمین" کہا تھا۔

☆...☆...☆

سری نگر کا ایئرپورٹ جگر جگر کرتی روشنیوں سے نہایا ہوا تھا۔ لندن سے آنے والی فلائٹ نے ایک گہما گہمی کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اس ہجوم بیکراں میں سرجن مومنہ بھی تھی جو اپنے مختصر سامان کے ہمراہ آشنا چہروں کی تلاش میں تھی۔ جب اسے پاپا کا خوش باش چہرہ دکھائی دیا۔

"ویلکم مائی سویٹ ڈوٹر!" پاپا نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ہیلو مومی!" نورین آپی آگئی تھیں۔ وہ مسرت سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹ گئی۔

"ممی گاڑی میں بے چینی سے تمہاری منتظر ہیں۔ دراصل ان کے پیر میں موچ آگئی ہے نا۔" اس کے ادھر ادھر نظریں دوڑانے پر نورین آپا بولیں۔

"ارے۔ کیا ہوا۔ موچ کیسے آگئی انہیں؟" وہ یک دم پریشان ہو گئی۔

"آج صبح ہی باتھ روم میں پھسل گئی تھیں۔ تمہارے آنے کی خوشی ان کے حواس پر کچھ زیادہ ہی چھا گئی تھی۔" نورین آپی ہنسنے لگیں۔

"ارے گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ معمولی درد ہے اور پھر سرجن بیٹی جو آگئی ہے۔ تمہیں تو بس دیکھتے ہی ان کی ساری تکلیف رفع ہو جائے گی۔" وہ اسے پریشان دیکھ کر اسے تھپک کر گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔

"اور۔ اور کوئی نہیں آیا مجھے لینے۔" اس نے نورین آپی کے نزدیک ہو کر دبی زبان میں پوچھا تو انہوں نے سر اٹھا کر کچھ وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

"اور یہاں ہے کون؟ سبین تو جدہ میں ہے۔ ماہین کے پاس سے ہو کر تم خود آ رہی ہو لندن سے۔"

وہ چپ سی رہ گئی اور بھی بہت سے چہرے تھے۔ بابا کا، بخت بی بی کا اور...

اس کی نظریں ممی پر پڑیں جو اسے دیکھ کر ایک سرخوشی کے ساتھ گاڑی سے اتر رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

"آپ کیوں نیچے اتر رہی ہیں۔ بیٹھئے اندر ہی بیٹھئے۔" وہ جلدی سے انہیں تھام کر دوبارہ سیٹ پر بٹھانے لگی۔

"بس جان! تجھے دیکھ کر تو میرا سارا درد ختم ہو گیا ہے۔ دیکھو بالکل درد نہیں ہو رہا۔" وہ اپنا پیر ہلانے لگیں تو وہ ہنستے ہوئے پچھلی سیٹ پر ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی پھر ان کے کندھے پر سر ٹکا لیا۔

☆...☆...☆

طارق ہاؤس میں رات کے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔

رات دیر تک ممی سے لگی بیٹھی لندن کی باتیں کرتے کرتے اس نے اچانک پاپا کے رویے پر حیرت کا اظہار کیا تو ممی مسکراتے ہوئے بولیں۔

"خوش نہیں ہو، ان کے اس پیار پر۔"

"ابھی تو صرف حیران ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"دراصل بیٹی! تم نے بہت کم وقت ہمارے پاس گزارا ہے نا۔ پہلے مولوی صاحب کے پاس' پھر اتنا عرصہ تعلیم۔ بس اسی وجہ سے تمہارے پاپا تمہیں چاہنے لگے ہیں۔ سبین، ماہین اور پھر نورین کی شادی کے بعد تو یوں

بھی تمہاری کمی بہت شدت سے محسوس کرنے لگے تھے وہ۔" ممی اس کے بال سہلانے لگیں پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

ایک عجیب درد بھری مسکراہٹ اس کے لبوں کی تراش میں بکھر گئی۔ بچپن کی چاہت کے رنگ پکے ہوتے ہیں اور وہ چاہت مجھے بابا اور بخت بی بی سے ملی ہے۔

"ممی! بخت بی بی اور بابا مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟" اس نے کچھ اس طرح تڑپ کر کہا کہ ممی نے چونک کر اسے دیکھا پھر ایک ہلکی سانس بھر کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

"ہاں۔ میں خود بھی سوچ رہی ہوں جبکہ اطلاع تو انہیں میں نے خود دی تھی بلکہ وہ تو خود ہی تمہاری پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ خدا خیر کرے ایسا ہونا تو نہیں چاہئے۔ چلو تم خود ہو آنا۔ یوں بھی تمہیں ہی بزرگوں کے پاس جانا چاہئے۔"

"بس صبح ہو لینے دیں۔" وہ بال سمیٹ کر کھڑی ہوئی۔ پاپا اندر داخل ہوئے تو وہ سکارف اٹھا کر سر پر باندھنے لگی۔

"ہوں۔ کیا کیا باتیں ہوئیں ماں بیٹی کے مابین۔"

"باتیں کیا ہونی ہیں۔ نورین چلی گئی کیا؟" ممی نے ڈھیر لگے کشن ہٹاتے ہوئے ان کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔

''ہاں۔فراز کو صبح ممبئی جانا ہے اور سناؤ بیٹا جان! کیا سوچا ہے فیوچر کے بارے میں۔کوئی پلاننگ کی ہے؟''

پاپا نے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے اس کے چمکتے چہرے کو دیکھا۔

''سوچنا کیا ہے پاپا! بس اب تو عملی میدان میں اترنا ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنسی۔

''گڈ۔تو پھر تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے حیرت اور تجسس سے ان کا چہرہ دیکھا۔

''گورنمنٹ ہاسپٹل میں تمہاری جاب پکی سمجھو۔تم چاہو تو کل سے ہی جوائن کر سکتی ہو۔''

وہ پاپا کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔چاہنے کے باوجود وہ اتنی خوش نہ ہوئی جتنا وہ ہونا چاہتی تھی۔

''بھئی تمہارے پاپا کا اثر ورسوخ بہت ہے۔سرجن جگن ناتھ تو منتظر تھے تمہارے۔وہ تمہارے پاپا کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔'' ممی نے کہا تو وہ صرف مسکرا دی۔

''اور ہاں۔ایک اور گڈ نیوز تمہارے لئے کہ وہاں تمہاری بہت اچھی فرینڈ کویتا بھی ہے۔وہ تم سے ملنے کو بہت بے تاب ہے۔میں نے اسے خبر دی تھی تمہارے انڈیا پہنچنے کی۔''

''ارے۔کوی بھی وہیں ہے۔ویری گڈ۔زبردست۔'' اس خبر نے اسے دلی طور پر مسرور کیا تھا۔

مولوی خضر محمد شاہ' کلام پاک رکھ کر جونہی پلٹے مومنہ کو کمرے کے دروازے پر کھڑے دیکھ کر حیرت اور مسرت سے لحظہ بھر کو گنگ رہ گئے تھے۔دوسرے پل ان کی خوشی کا ٹھکانا ہی نہ رہا۔

''بابا! کیسے ہیں آپ؟'' وہ بے تاب ہو کر ان کی طرف لپکی اور ان کے قدموں میں جھک گئی۔

''پگلی! کب سے آئی ہو اور یونہی چپ چاپ کھڑی ہو۔'' انہوں نے اسے جلدی سے تھام کر اپنے قریب بٹھا لیا اور اس کا سر چوما۔

''بس زیادہ دیر نہیں ہوئی۔آپ ہی نے مجھے یہ آیت سنائی تھی کہ۔''جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ ہو تا کہ تم پر رحم ہو۔''

''جیتی رہو میری بچی۔'' مولوی صاحب نے اس کے سکارف سے ڈھکے سر کو فرطِ محبت سے چوم لیا۔

''بہت ناراض ہوں میں آپ سے۔ایئرپورٹ بھی نہیں آئے۔نہ آپ نہ بی بی آئیں۔کہاں ہیں وہ؟ میں ان سے خوب لڑوں گی۔کتنی مایوس ہوئی تھی جب آپ دونوں مجھے وہاں دکھائی نہ دیئے۔کیوں بابا! کیا بھلا دیا اپنی بیٹی کو؟'' اس نے شکوہ کناں نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔یکایک آنکھوں کے گوشوں سے قطرے پھسل کر رخسار پر بکھر گئے۔اسی دم بخت بی بی اس کی مدھر آواز سن کر چلی آئیں۔

''بخت بی بی۔'' وہ بچوں کی طرح بلکتی ان سے لپٹ گئی۔

مولوی خضر محمد شاہ کا نورانی چہرہ برسوں کی ریاضت کو کامیاب و کامران اپنے روبرو دیکھ کر چمک رہا تھا۔وہ سارے اندیشے جو دل میں ریشم کی طرح الجھ رہے تھے رفع ہو گئے۔

"ارے جھلی! یہ تو خوشی کا مقام ہے۔ ملن کی گھڑیاں ہیں۔ اس میں آنسو کیسے؟" بی بی اسے چمکارنے لگیں۔ وہ آنکھیں رگڑتی بے اختیار ہنس پڑی۔

"آپ لوگوں نے تو مجھے بھلا ہی دیا تھا۔ یہ تو میں ہی دوڑی چلی آئی۔" وہ کم سن ناراض بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔

"چل ہٹ۔ ماں باپ بھلا اولاد کو کبھی فراموش کر سکتے ہیں۔ تیری چہکار مہکار کے لئے تو یہ در و دیوار ترس رہے تھے۔ تو تو میرے جگر کا ٹکڑا' میرے گھر کا اجالا۔ اس آنگن کا تارا ہے۔ تیری یادوں سے تو ہم دونوں جی رہے تھے۔" بی بی نے اس کی کشادہ سنہری پیشانی پر بوسہ دیا۔ تو اس نے ان کے گلے میں بازو حمائل کر کے جواباً ان کے رخسار پر اپنے لب رکھ کر بہت زور سے چوما۔

"تو تو سرجن بن کر بھی نہیں بدلی۔ ویسی کی ویسی ہی ہے۔ آئو ادھر بیٹھو۔" مولوی خضر محمد نے تخت پر اس کے لئے جگہ بنائی۔

"وہ۔ غازی شاہ۔ غازی شاہ کہاں پر ہے؟" اس نے تخت پر بیٹھتے ہوئے مولوی خضر محمد کی طرف دیکھا۔

"وہ آج کل ملک سے باہر ہے۔" انہوں نے یہ کہتے ہوئے نظریں چرا لیں۔

"آج کل۔" وہ یکدم ہنس پڑی۔ خفیف سی تمسخرانہ ہنسی تھی پھر عجیب دل گرفتہ سی ہو کر بولی۔ "آج کل کہاں بابا۔ مجھے تو اسے دیکھے برسوں بیت گئے ہیں۔ بس بچپن کا مدھم سا نقش ہی ساتھ ساتھ رہا ہے۔ اب تو یقیناً وہ سامنے آئے تو پہچان بھی نہ پاؤں۔ اسے تو میرا نام تک یاد نہ ہو گا۔ ہے نا۔"

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ دل گرفتگی سے ہنس پڑی۔ بخت بی بی کے دل میں تیر سا پیوست ہو گیا۔

"نہ بیٹی! وہ ہے ہی بے پرواہ مگر تمہیں بھولا بالکل نہیں ہے۔ لو بھلا بھولے گا کیونکر۔"

"ہاں بیٹی! وہ تم سے ملنا چاہتا تھا مگر تم اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ وہ وہاں کیسے آتا۔ اسے کچھ مناسب نہیں لگتا تھا پھر تم لندن چلی گئیں۔"

مومنہ نے پلکوں کی نم آلود باڑھ اٹھا کر مولوی خضر محمد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نامانوس رنج کی کیفیت اتر آئی۔ پھر بڑی آہستگی سے آنکھوں کی زمینیں گیلی ہو کر چمکنے لگیں۔

"میرا گھر نہیں۔ اسے "طارق ہاؤس" کہئے بابا۔ مجھے نام دینے والے آپ ہیں بابا۔ یہ مت بھولیں میرے منہ کو امرت جیسے دودھ کا ذائقہ چکھانے والی بی بی ہیں۔ بظاہر میرا باپ طارق احمد ہے مگر مجھے باپ کی نرم چھاؤں سے آشنا کرنے والے، شفقت دینے والے، محرومی کی دھوپ سے بچانے والے پہلے انسان آپ ہیں۔ میرا ننھا دل، کچا ذہن آپ کو باپ تسلیم کر چکا تھا۔ میں نے آنکھیں بی بی کی گود میں کھولیں۔ ہمکنا اور پاؤں پاؤں چلنا بی بی کی ہمراہی میں سیکھا۔" وہ جذباتی ہو گئی جیسے اس کی نازک رگ پر مولوی خضر محمد نے بلیڈ پھیر دیا ہو۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے بابا؟"

"ہاں سچ ہے۔ مگر بیٹی! حالات انسان کو کبھی ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ ہوا اسے اس لئے بھول جاؤ کہ تمہارے باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ بس کچھ دیر سے ہی سہی۔" مولوی خضر محمد نے یہ کہتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور اس کے حزن آمیز چہرے سے نظریں چرا لیں۔

"کچھ دیر بابا۔ پورے بارہ سال کے لئے۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تو بی بی نے تڑپ کر اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا لیا۔

"کیا بارہ سال بہت نہیں ہوتے بابا! اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے؟" بارہ سال میں تو کتنے موسم گزر جاتے ہیں۔ کتنے رنگ بکھر جاتے ہیں اور نئے ابھر آتے ہیں۔ کتنے نقش مٹ جاتے ہیں اور کتنے نقش گہرے ہو جاتے ہیں۔" اس نے بی بی کے سینے پر سر ٹکا لیا۔

"میرا سکون آپ ہیں۔ آپ دونوں۔ آپ کیوں مجھے بار بار یہی احساس دلاتے رہتے ہیں کہ میں طارق احمد اور زہرہ احمد کی بیٹی ہوں۔ ہاں ہوں، مجھے دنیا میں لانے والے یہی دونوں ہیں۔ اس سے میں انکار کر بھی نہیں سکتی اور نہ میں ولدیت کے خانے سے ان کا نام کھرچ سکتی ہوں۔ میں تو بس اپنے دل کو سکون دینے، روح کو شانت کرنے آپ کی چھاؤں میں آجاتی ہوں مگر آپ دونوں تو مجھے طارق ہاؤس میں دے کر بھول گئے۔ بالکل بھول گئے اور وہ۔ وہ غازی شاہ بھی جس کی انگلی پکڑ کر میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پار کیا کرتی تھی مجھے سب بھول گئے ہیں۔ میرے اندر کی مومنہ کو اب بھی آپ کی ضرورت ہے بی بی! آپ سب کی۔" وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

بی بی نے اس کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ مولوی خضر محمد نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر تھپکا۔ وہ جانتے تھے یہ برسوں کی جدائی کے بعد ملن کی خوشی کے آنسو تھے۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ یوں پرسکون ہو گئی جیسے سیاہ بادلوں میں گھرا آسمان بارش کے بعد ان بادلوں کے چھٹ جانے پر گہرا نیلا اور پرسکون دکھائی دینے لگتا ہے۔

بخت بی بی اپنے پیروں کا درد بھول بھال کر اس کی خاطر مدارات کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں جبکہ وہ صحن میں ہی تخت پر ہلکی دھوپ سینکتی مولوی صاحب کے ساتھ بیٹھی رہی۔ مولوی خضر محمد کہہ رہے تھے۔

"تم جب میری گود میں آئیں تو مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی' جتنا تمہارے جانے کا غم پہاڑ جیسا لگا تھا۔ پانے سے زیادہ کھو دینے کا احساس اذیت ناک ہوتا ہے مگر بیٹی وقت ہر غم ہر دکھ ہر رنج کو کاٹ دیتا ہے۔ زندگی اگر ٹھہر جائے۔ ایک سی کیفیت ایک سا موسم رہے تو زندگی ایک بدنما، اکتا دینے والی اور بیزار قسم کی شے معلوم ہو۔ ہم اپنے دامن میں صرف خوشیاں سمیٹ لینے کی خواہش رکھیں تو اس کا مطلب ہے کہ دوسروں کی جھولیوں میں غم ہی غم ڈال دیں۔

"نہیں بیٹی! زندگی کے ہر رنگ کو قبول کرنا چاہئے۔ یہ سمندر کی طرح ہیں۔ ساحل پر کھڑے ہوؤں کے پیروں سے پرشور خوفناک موجیں بھی ٹکراتی ہیں کہ اسے کسی طرح ڈبو کر لے جائیں اور پرسکون ٹھنڈی لہریں بھی قدموں کو چومتی ہیں۔ بس استقامت اور تحمل ہماری زندگی سے خارج نہیں ہونا چاہئے۔ تند

موجوں سے جدوجہد کرو، اسے شکست دے کر فاتح بنو اور چومتی لہروں سے ٹھنڈک اور سیرابی کا احساس حاصل کرو۔

''بیٹی! طارق احمد ایک کمزور اعصاب کا مالک تھا۔ وہ دلی خواہشوں کے آگے تنکے کی طرح بہہ گیا تھا مگر اب اپنی غلطی کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کا ازالہ وہ تمہیں ایک مکمل سرجن بنا کر کر چکا ہے۔ تم غور کرو۔ تمہیں کہیں بھی کمی کا احساس ہوا ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا اور جوس کے گلاس پر نظریں جما دیں۔ ایک کمی کا احساس تو ہمہ وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ شاید آپ نہیں سمجھ سکتے بلکہ کوئی بھی نہیں جان سکے گا کہ میں تقسیم کے جس عمل سے گزری ہوں اس نے میرے اندر ایک خلا کو جنم دیا ہے جو کبھی نہ بھر پائے گا۔ وہ سر اٹھا کر ہنس دی۔

''بی بی کو دیکھوں ذرا۔ کچن میں یوں جا کر مصروف ہو گئیں جیسے میں نہیں آئی ہوں کوئی بیس پچیس مہمان چلے آئے ہوں۔'' وہ جوس کا گلاس رکھ کر تخت سے اتر کر اندر چل گئی۔

مولوی خضر محمد کی محبت پاش' پر شفیق نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ یہ چھوٹی نازک سی بچی یک دم اتنی بڑی اتنی سمجھ دار اور حساس ہو گئی تھی۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تقسیم کا عمل اسے اندر سے توڑ پھوڑ چکا ہے۔ ایک کمی ایک خلاء کے ساتھ وہ جی رہی ہے۔ وہ تو زہرہ کو اس کی امانت دے کر پر سکون ہو گئے تھے مگر نہیں۔ کہاں پر سکون ہوئے تھے۔ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے انہوں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

زہرہ طارق کی یہ بیٹی انہیں پہلے پہل کتنا بڑا بوجھ اور بھاری ذمے داری محسوس ہو رہی تھی۔ جب وہ روتی بلکتی ان کے ہاتھوں میں زبردستی سونپی جا رہی تھی تو اسے تھامتے ہوئے ان کے ہاتھ ہی نہیں دل بھی کانپ رہا تھا۔

زہرہ احمد اس گڑیا کو چادر میں لپیٹ کر ان کے تخت پر ڈالے گڑگڑا رہی تھی۔ ''اگر آپ اسے نہیں رکھیں گے تو میں اسے کہیں بھی پھینک آؤں گی۔'' آخر میں وہ اتنا بولی۔

''بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ زہرہ! یہ بڑی جہالت کی باتیں ہیں انہیں بوجھ سمجھ کر دھتکار دینا۔''

مولوی خضر محمد کے لہجے میں بے پناہ درد اور تاسف تھا۔

''میں کب اس رحمت سے منکر ہوں مولوی جی! مگر اس کا باپ کافرانہ حد تک اس رحمت سے متنفر ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ اس بچی کو آگ میں جھونک دے۔ اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دے یا یتیم خانے ڈال آئے۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں بی بی! اسے رکھ لیں۔ اپنی امان میں لے لیں۔ اگر طارق احمد کو خبر ہو گئی کہ میری کوکھ نے پھر بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ مجھے ایسا داغ لگا دیں گے جو مجھے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔''

زہرہ کی گڑگڑاہٹیں جہاں در و دیوار کو ہلا رہی تھیں وہاں مولوی خضر محمد کے سینے کو بھی درد سے ہمکنار کر رہی تھیں۔

''مجھے سوچنے دو زہرہ بیٹی! مجھے سوچنے دو۔'' انہوں نے اضطرابی انداز میں اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹہلنا شروع کر دیا۔

ان کا دل کسی طور اس بچی کو رکھنے پر آمادہ نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرورش کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے بلکہ خوف زدہ وہ اس بات پر تھے کہ بچی کی پیدائش کی خبر سے طارق احمد کو بے خبر رکھا جانا تھا جبکہ وہ اس کا خون تھی۔ اسی کی امانت تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ جرم نہ ہو۔ وہ خدا کی پکڑ میں نہ آجائیں مگر دوسری طرف زہرہ تھی اس کی التجائیں تھیں۔ اس شخص کی ذہنی خستہ حالی کا خمیازہ زہرہ کو بھگتنا پڑتا جو بہت تکلیف دہ ہو سکتا تھا۔ اس کی ساری زندگی کو بے ثمر اور سات سال کی ریاضت کو یکسر بکھیر سکتا تھا۔

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اس کلام پاک کا واسطہ دیتی ہوں جو آپ نے میرے دل میں اتارا ہے۔ آپ کو آپ کے علم کا واسطہ' میں کم مایا سہی آپ جیسے بڑے انسان کی ادنی سی شاگرد رہی ہوں۔ مگر اس علم کا' اس کلام پاک کا واسطہ تو بڑا ہے نا۔" وہ قرآن پاک اٹھا لائی تو مولوی خضر محمد لرز اٹھے۔

"بس کرو زہرہ! مجھے اس جلیل القدر کتاب کا واسطہ نہ دو۔ مجھے سوچنے دو۔"

"سوچنے کا وقت نہیں رہا مولوی جی! وہ کل پہلی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے انہیں۔ وہ جتنی محبت کر سکتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ نفرت بھی کر سکتے ہیں۔ وہ ایک جذباتی اور انتہا پسند انسان ہیں۔ انہیں تو بس اولادِ نرینہ کا تحفہ چاہئے۔ جاتے جاتے کہہ کر گئے تھے کہ مجھے بیٹے کی خوشخبری سنانا۔"

"مان لیں نا مولوی جی!" بخت بی بی اس سارے وقت میں پہلی بار بولیں اور روتی بلکتی بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور زہرہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"مگر۔ مگر تم اسے کہو گی کیا؟" مولوی خضر محمد متفکر ہو کر پوچھنے لگے۔

"چچی اماں بہت اچھی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں اور میرا ساتھ دیں گی۔ وہ طارق احمد سے کہہ دیں گی کہ بیٹا ہوا تھا مگر دنیا میں اس کی سانسیں کم لکھی تھیں وہ انتقال کر گیا۔ گو کہ انہیں دکھ تو ہو گا مگر یہ تسلی رہے گی کہ اب بیٹے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا بیٹا ہی آئے گا۔" وہ سر جھکا کر چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنا اور ساس کا پلان بتانے لگی۔

"خدایا۔ کتنی سطحی سوچ ہے اس مسلمان لڑکے کی۔" مولوی خضر محمد تاسف سے ہونٹ بھینچ گئے۔ پھر بخت بی بی کی گود سے چادر میں لپٹی بچی کو اپنے لرزتے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ سرخ و سپید رنگت پر معصوم آنکھیں، ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ پتلے پتلے سرخ ہونٹ، نرم ملائم ریشم جیسی جلد' وہ اللہ کا تحفہ ہی تھی۔

انہوں نے بے اختیار اسے چوم لیا۔

"دیکھو زہرہ بیٹی! چاند کو دیکھ کر بتلاؤ بھلا کیسا لگ رہا ہے۔" انہوں نے چہرہ اوپر اٹھا کر آسمان کی چادر میں ٹکے چاند کو دیکھا جو آہستہ آہستہ اپنی چمک میں اضافہ کر رہا تھا۔ دالان میں اس کی سنہری روشنی بکھری ہوئی تھی۔

"بہت چمکتا ہوا۔ بہت خوبصورت اور پاکیزہ لگ رہا ہے۔" زہرہ کی نگاہیں بھی روشنی کے اس دمکتے دائرے پر مرکوز ہو گئیں۔ دل میں درد کی اٹھنے والی لہروں میں طغیانی سی آرہی تھی۔

"جس جس گھر میں بیٹیاں ہوتی ہیں نا وہ گھر آسمان پر موجود فرشتوں کو بالکل اس چاند کی مانند دمکتا، روشن اور پاکیزہ دکھائی دیتا ہے۔" مولوی خضر محمد نے یہ کہتے ہوئے زہرہ کو دیکھا۔

"نیک بخت! بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ بیٹیوں والے گھر میں خدا کی رحمت سایہ کئے رہتی ہے۔ یہ ماں باپ کی بخشش کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ بے شک، بیٹے نعمت ہیں مگر نعمت کا حساب دینا ہوتا ہے جبکہ رحمت کا کوئی حساب نہیں۔ بلکہ یہ تو والدین کو جنت میں پہنچانے والی سیڑھیاں ہیں۔"

زہرہ نے بخت بی بی کے کاندھے سے لگ کر بقیہ آنسو بھی بہا ڈالے۔ یہ تو ان کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ اپنے دل کے اس ٹکڑے کو کس حوصلے سے خود سے جدا کر رہی تھیں۔ محض باقی تین بچیوں سے باپ کے سائے کے چھن جانے کے خوف سے، اپنے گھر کے اجڑ جانے کے خوف سے، رسوائی اور ذلت کے خوف سے۔

"پیدا ہوتے ہی یہ بیٹیاں قربانی کا درس سیکھ لیتی ہیں۔" مولوی خضر محمد کا دل سلگتا پھوڑا بن گیا۔

"کتنے دنوں کی ہے یہ؟" انہوں نے بڑی محبت سے بچی کو گود میں سنبھالا اور اس کے نرم گداز ہاتھوں کو چھو کر پوچھنے لگے۔

"تین دن کی۔"

"نام کیا رکھا ہے؟"

"نام۔ ارے اس بدنصیب کا نام ہی کہاں رکھا ہے ابھی۔" وہ دکھ سے بلبلائیں۔

"نہ۔ نہ۔ بدنصیب نہیں ہے۔ یہ تو بہت بخت آور ہو گی۔ دیکھو اس کا چہرہ بالکل چاند کے مانند روشن ہے۔ ارے یہ تو کشمیر کی وادی جیسی خوبصورت ہے۔ میں اس کا نام رکھوں گا۔ "مومنہ" یعنی ایمان لانے والی۔"

"ماشاءاللہ۔ بہت پیارا نام ہے۔" بخت بی بی نے بے اختیار اسے مولوی خضر محمد کی گود سے لے کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"زہرہ! تم نے تو مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ میرے گھر پر بھی اللہ کی رحمت کا سایہ ہو گیا۔ اب اس گھر پر رحمت برسے گی۔ میری خالی گود بھر دی مولا نے۔"

"آپ خالی کہاں تھیں غازی شاہ بھی تو آپ کا ہی بیٹا ہے۔" زہرہ پہلی بار کھل کر مسکرائی۔ اسے اپنے دل پر رکھا بوجھ اترتا محسوس ہونے لگا۔ بخت بی بی اور مولوی خضر محمد کی آغوش میں اپنے جگر گوشے کو سونپ کر ان کا دل پر سکون ہو گیا۔

"ہاں۔ غازی بھی میرا ہی بیٹا ہے۔"

"ہاں بی بی! کوکھ کوئی بھی جنم دے۔ بس بچہ جس کی گود میں پروان چڑھتا ہے جس سے پیار پاتا ہے اسی کا کہلاتا ہے۔" زہرہ آہستگی سے فرش سے اٹھ گئی اور دھیمے قدموں سے مولوی خضر کے گھر کی دہلیز عبور کر گئی۔

☆...☆...☆

مولوی خضر محمد نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ماضی کے کئی منظر ان کے تصور پر اب بھی جھلملا رہے تھے۔ انہوں نے ایک گہری سانس بھر کر دائیں طرف دیکھا۔ وہاں جالی کے دروازے کے پار مومنہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ باورچی خانے میں موجود بی بی سے الجھ رہی تھی۔ انہیں زبردستی پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ وہ اس کی معصومانہ اور بچکانہ حرکت پر مسکرانے لگے۔ پھر یک دم یہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے گم ہو گئی۔ انہوں نے سر جھکا لیا۔

"زہرہ بیٹی! تم نے میری جھولی بھر کر ایک بار پھر خالی کر دی۔ اس خوشبو سے میرا گھر ایک عرصے تک خالی تھا تو احساس تک نہ تھا' اس خالی پن کا۔ مگر تم نے احساس جگا کر ہمیں دکھی کر ڈالا۔ ہم سے سب کچھ چھین لیا مگر مجھے شکوہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ امانت تھی میرے پاس تمہاری اور امانت جتنے برس بھی رہے امانت ہوتی ہے۔ اسے لوٹانا پڑتا ہے اس کے مالک کو۔" وہ ہلکے سے ہنس دیئے۔ کندھے پر رکھے رومال سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگے۔

"آپ کے خیال میں سرجن ہو کر پیٹو ہو گئی ہوں میں؟ بس بی بی! آپ کو خاطر مدارات کی ضروری نہیں ہے۔ میں کھانے پینے نہیں آئی ہوں بلکہ آپ دونوں سے ڈھیر ساری باتیں کرنے آئی ہوں۔" اس کی چہکار نے مولوی خضر محمد کی سوچوں کا تسلسل توڑ ڈالا۔ انہوں نے سر اٹھایا تو وہ بی بی کو پکڑ کر صحن میں لے آئی اور تخت پر بٹھا کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"میرے چاند۔ تیری باتیں ہی تو ہمارے دل کا سکون ہیں۔ یہی ہماری یادیں ہیں۔ یہی بہلاوے۔" بی بی نے اس کے بال سمیٹ کر اس کا شاداب چہرہ چوم لیا۔ وہ آنکھیں موندے ان کے بوسے کے لمس کی تراوٹ سے سیراب ہونے لگی پھر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان کی گردن میں ڈال کر بولی۔

"میں اس گود کی گرمی کو ترس گئی تھی بی بی! مغرب میں سب کچھ ہے مگر ماں باپ جیسی نعمت نہیں ہے۔ وہاں رشتوں کی سکون آمیز ٹھنڈک نہیں ہے۔ وہاں شاید سکون ہی نہیں ہے بلکہ ایسا سکون ایسی طمانیت تو طارق ہاؤس میں بھی نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں بی بی کے مہربان چہرے کی چاندنی میں گم ہو گئیں۔ پھر یک دم وہ مچل کر بولی۔

"بی بی! مجھے وہ گیت سنایئے نا جو آپ گھر کے کام کاج کرتے وقت گنگنایا کرتی تھیں۔"

"ارے۔ تجھے یاد ہے وہ؟" بخت بی بی نے تحیر آمیز بے یقینی سے اس کو دیکھا۔

"سب کچھ یاد ہے مجھے۔ آپ کی آواز۔ وہ ترنم وہ جذب۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی اور یکدم ہنس پڑی۔

"مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ میں اور غازی شاہ آپ کے پیچھے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب آپ کپڑے دھوتے دھوتے یہ گیت گنگنانے لگتیں تو غازی شاہ "آوچھ" کہہ کر آپ کو ڈرایا کرتا تھا اور آپ "ہائے" کہہ کر ڈر جاتیں پھر غازی شاہ کو "شریر" کہہ کر چمٹا لیتیں اور مجھے گود میں بھر لیتیں۔ اس پر غازی شاہ کتنا بگڑتا تھا کہ آپ مجھے پیار زیادہ کرتی ہیں۔ پھر آپ ہم دونوں کو صحن کے اسی درخت کے نیچے تخت پر بٹھا دیتیں اور کہانیاں

سناتیں، کبھی نظمیں اور گیت سنانے لگتیں۔آپ کو خبر ہوتی تھی وہ وقت ہمارے سونے کا ہوتا تھا اور ہم دونوں آپ کی آغوش میں سر رکھ کر آنکھیں موندے آپ کی پیاری آواز سنتے سنتے سو جاتے۔''

وہ دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔بخت بی بی' مولوی خضر محمد بھی جیسے اس کے ساتھ ساتھ ماضی کے سمندر میں اتر کر خوب صورت منظروں اور لمحوں کی یادوں کی سیپیاں چننے لگے۔

''سنائیں نا بی بی کوئی نظم۔کوئی گیت۔'' وہ مچلی تو بی بی ہنس دیں۔پھر اس کے ریشم جیسے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گنگنانے لگیں۔

جاں خالق پر ہیں فدا کرنے کو تیار

دیوانہ ہیں لیلائے شہادت کے طلب گار

ڈھا دیں گے بہت جلد ترے ظلم کی دیوار

ہم غزنی محمود کے پیرو ہیں خبردار

برباد یہ ہندو کا صنم خانہ کریں گے

ہم وادی کشمیر کا سودا نہ کریں گے

ڈھاتے ہیں نہتوں پہ جہاں ظلم و ستم لوگ

ہر روز اٹھاتے ہیں شہیدوں کے الم لوگ

حق گوئی کا پر ساتھ دیا کرتے ہیں کم لوگ

اب عقل کی وادی سے نکل آئے ہیں ہم لوگ

اب خود کو رہ شوق میں دیوانہ کریں گے

ہم وادی کشمیر کا سودا نہ کریں گے

بخت بی بی نے آنکھیں بند کر لیں۔ان کی آواز دھیمی ہونے لگی پھر یک دم جذب سے دوبارہ ابھری۔

مرعوب نہ ہوں گے کبھی ایٹم سے عدد سے

ملتی ہے ہمیں فتح فرشتوں کی رسد سے

سرشار ہیں ہم نعرہ اللہ الصمد سے

بیزار ہیں ہم لوگ یہودی کی مدد سے

اب ہم کسی مردے کو مسیحانہ کریں گے

ہم وادی کشمیر کا سودا نہ کریں گے

ہم وادی کشمیر کا سودا نہ کریں گے

"کشمیر" اسے لگا اس کے دل پر کوئی ایسی شے گری ہو جیسے پتھر کا ٹکڑا جھیل میں گرا ہو اور پانی اچھل کر چاروں کناروں سے جا ٹکرایا ہو۔ مگر یہ پانی نہیں تھا لہو تھا۔

"بی بی! بی بی! کیا آپ یہی گیت سنایا کرتی تھیں ہم کو۔" اس نے پر خیال انداز میں بخت بی بی کو دیکھا پھر مولوی خضر محمد کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جہاں اشک بہہ رہے تھے۔

"ہاں۔ ایسے ہی بہت سے اور بھی گیت۔" بی بی ابھی تک اپنے ہی لفظوں میں گم تھیں پھر یک دم چونک کر اسے دیکھا جو ان کی گود سے جھٹکے سے سر اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا میری بچی۔" پھر ہلکے سے سر جھٹکتے ہوئے ہنسیں۔ "میں بھی پاگل ہوں ایسے ہی کیا بس کچھ گنگناتی رہتی تھی۔"

اس نے سر اٹھایا اور کچھ کہنے کو لب کھولے مگر دوسرے پل ہونٹ بھینچ لئے اور ہلکے سے مسکرا دی۔

"ہاں۔ ماضی کی باتیں یاد کرنے بیٹھیں تو دل پر عجیب سا سحر طاری ہو جاتا ہے۔ آپ کی آواز اب بھی اتنی مترنم ہے بی بی!" وہ بہت نرمی سے بی بی کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگی۔

مولوی خضر محمد اسے دیکھتے رہ گئے۔ ان کا خیال تھا وہ کشمیر کے حالات کے بارے میں ضرور کوئی سوال پوچھے گی مگر انہیں مایوسی ہوئی۔ تاہم انہوں نے خود کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ وہ ایک نرم دل رکھنے والی اور ہمدرد لڑکی ہے۔ یقیناً یہاں رہے گی تو یہاں کے حالات کو ضرور محسوس کرے گی۔ اس کا اس گیت پر چونکنا پھر

مضمحل ہو کر سانس بھرنا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اس نے لفظوں کی گہرائی کو محسوس کیا ضرور ہے۔ چاہے کسی بھی حوالے سے۔

"آؤ بیٹا۔ اندر چلو۔ دھوپ بہت تیز ہو گئی ہے۔" انہوں نے تخت سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مجھے بھی احساس ہونے لگا ہے۔" اس نے ہلکی سی سانس کھینچتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور تخت سے اتر کر ان کے ساتھ اندر چلی آئی۔

☆...☆...☆

ہاسپٹل میں اس کا پہلا دن تھا۔ ڈاکٹر کو بتا جو اس کی بچپن کی سہیلی تھی بڑے تپاک سے ملی۔ دوسرے تمام سینئر ڈاکٹرز اور سٹاف نے بھی اس کا استقبال خوش دلی سے کیا تھا۔ بظاہر ایک نازک ڈال جیسی لڑکی اپنی روایت، اپنے مذہب کے اعتماد کے سہارے ایک مکمل اور مضبوط لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا کھلے کھلے گلاب کے مانند چہرہ ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ہاسپٹل میں زیادہ تر تعداد بڑی عمر کے ڈاکٹرز کی تھی۔ چند ایک کے علاوہ جن میں خود مومنہ، کویتا اور سرجن سنیل شامل تھے۔ سنیل نے بڑی پسندیدہ نظروں سے مومنہ کو دیکھا تھا اور پورا دن مومنہ اس کی نگاہوں سے جز بز ہوتی رہی۔

اس کا پہلا دن تو تعارفی سا تھا۔ وہ سرجن جگن ناتھ کے ہمراہ بس معاون کی حیثیت سے گھومتی رہی۔ جب فارغ ہوئی تو ڈیوٹی روم میں چلی آئی جہاں کویتا چائے سے لطف اٹھاتی نظر آئی۔

"آیئے آیئے سرجن! بتایئے کیا سیوا کی جائے؟" اسے دیکھ کر اس نے اپنا کپ ٹیبل پر رکھ کر میزبانی کے فرائض نبھانے کی ایکٹنگ کی۔ وہ ہنس پڑی۔

"میزبان ڈاکٹر! بس ایک کپ مزے دار چائے کا۔" وہ خود کو کرسی پر گراتے ہوئے بولی۔

"مومی! تو تو اور نکھر آئی ہے۔ کتنے سمے بعد دیکھ رہی ہوں تجھے۔ پوری پدمنی لگ رہی ہے۔" کویتا کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ وہ سکول گرل کی طرح جھینپ گئی۔

"تیری مکھن لگانے کی عادت بچپن سے اب تک ہے کیا؟" اس نے گھورتے ہوئے کہا تو کویتا ہنسنے لگی۔

"اور تجھے یقین نہ کرنے کی بیماری اب تک ہے۔ یاد ہے نہر کے پاس تیرے جانے کے سمے سے پہلے ہم دونوں ٹہل رہے تھے تو۔"

"بس۔ بس۔ اب ذکر نہ لے کر بیٹھنا اس فضول سے لڑکے کا۔" اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید گل افشانی سے روکنا چاہا مگر کویتا ہنستے ہوئے بولی۔

"ہائے مومنہ! بیچارہ کیسے سانجھ سویرے تیرے درشن کے لئے خوار ہوتا تھا۔ پر تو بھی پوری ڈشٹ تھی ذرا بھی تو کرپا نہ کی۔" کویتا اس کے گھورنے کے باوجود اس پرانے قصے کو یاد کر کے لطف اٹھانے لگی۔

سرجن سنیل اندر داخل ہوا تب کہیں جا کر اس کی زبان اور ہنسی کو بریک لگا تھا۔ مومنہ نے شکر ادا کیا۔

"آیئے آیئے سنیل جی! آج تو آپ بہت تھک گئے ہوں گے' زخموں کا اندمال کر کے۔" کویتا اس کیلئے بھی چائے کا کپ تیار کرنے لگی۔

"ہاں۔ آج ہی دو آپریشن نمٹانے تھے۔ کیا کرتا۔ کل تو ہڑتال ہے اور ادھر مریض ہمارے مسائل سمجھے بغیر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اینی ویز، مس مومنہ! آپ سنایئے کیسا لگا ہمارا ہاسپٹل آپ کو؟" اس کی ساری توجہ یک دم مومنہ کی طرف ہو گئی اور لبوں پر خمار آلود مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"ہاسپٹل کو خوب صورت تو کہہ نہیں سکتے۔" وہ چائے کا گھونٹ بھر کر پر مزاح انداز میں بولی۔

"ویسے ہاسپٹل چاہے کسی بھی ملک اور خطے کا ہو سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ وہی بو، وہی تکلیف سے کراہتے مریض۔ وہی نوکیلے خوفناک انسٹرومنٹ، وہی کرب انگیز آہیں۔ سسکیاں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" سرجن سنیل نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے خود کو صوفے کی پشت پر ڈھیلا چھوڑ دیا اور نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا جو اس بدبودار ماحول میں تازہ معطر جھونکے کے مانند آکر ٹھہر گئی تھی اور پھر سارا ماحول بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔

"ہاں۔ مومنہ کی بات درست ہے۔ ہاسپٹل تو سارے ایک سے ہوتے ہیں۔ ان میں آنند کہاں۔" کویتا کا لہجہ دھیما اور بجھا ہوا سا تھا۔ مومنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر دوسرے پل وہ ہنس رہی تھی۔

"بس سنیل جی۔ میں تو کہتی ہوں مومنہ جیسی دو چار ڈاکٹرز اور آجائیں تو یہ ہاسپٹل، ہاسپٹل نہیں رہے گا بلکہ گلستان لگنے لگے گا۔" کویتا کی اس بے ساختہ تعریف نے اسے سٹپٹا دیا۔ اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

ڈاکٹر سنیل کو ایسی مسرت ہوئی گویا کویتا نے اس کے دل کے احساسات کو زبان دے دی ہو۔ اس کے دل کی بات کر دی ہو۔

کمرے میں سریش نے آکر مومنہ کو اس کے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ تب کویتا اسے جھڑکتے ہوئے بولی۔

"بدھو۔ اطلاع کیا دے رہے ہو۔ ان مہمانوں کو یہیں لے آئو۔"

"نہیں نہیں رہنے دو۔ میں دیکھتی ہوں خود جا کر۔" مومنہ جلدی سے کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سریش کی اس اطلاع پر اس کا دل عجیب سی اتھاہ میں ڈوبا تھا اور دوسرے پل خوشگوار انداز میں یوں دھڑکنے لگا گویا پہلو سے نکل آئے گا۔ اسے یقین تھا اس سے ملنے غازی شاہ ہی آیا ہوگا۔ ہاں ایک وہی تو رہ گیا تھا جس سے اس کی ملاقات اب تک نہ ہو سکی تھی۔

وہ مسرت آمیز احساس اور دھڑکتے دل کے ساتھ باہر لپکی۔ سریش نے اسے بتایا تھا کہ اس کا مہمان ہاسپٹل کے گیٹ پر ہی سفید گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔

وہ ڈاکٹرز کی متعدد گاڑیوں سے گزر کر داخلی گیٹ کی طرف آئی تو اسے دور ہی سے سفید گاڑی نظر آگئی جس کے بیک ڈور سے کوئی پشت لگائے کھڑا تھا۔ اس کے قدم ایک سرخوشی سے اس گاڑی کی طرف اٹھنے لگے۔ جونہی وہ قریب پہنچی اس کے اعصاب کو بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ بے حد سرعت اور چابک دستی سے اسے دروازہ کھول کر اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ وہ اس حملے پر اپنے بچائو کی تدبیر بھی نہ کر سکی۔

دوسرے پل گاڑی فراٹے بھرنے لگی تھی مگر وہ مائوف ذہن کے ساتھ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ریوالور کو محسوس کر رہی تھی جو اس کے پہلو سے لگا ہوا تھا اور اس کی ذرا سی حماقت چیخ پر اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر سکتا تھا۔

گاڑی ناآشنا راستوں کی جانب بھاگ رہی تھی۔ بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ تیزی سے پیچھے کی جانب دوڑ رہے تھے۔

یہ ایک انتہائی اعصاب شکن حملہ تھا مگر اس نے بڑی کوششوں سے اپنے منتشر اعصاب اور حواس کو مجتمع کرتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کا چہرہ دیکھا جو بڑھی ہوئی داڑھی اور سیاہ گلاسز میں واضح نہیں تھا۔ اگلی سیٹ پر اسے بجلی کی تیزی سے گاڑی میں گھسیٹنے والا شخص بیٹھا تھا اور کسی مجسمے کے مانند ساکت سپاٹ چہرے کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

اف کیسا دل دہلا دینے والا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی سوچ میں یہ ہیبت بھر رہی تھی کہ وہ اغوا کی جا رہی ہے یقیناً کسی کے دھوکے میں یا پھر اسے ہی ٹارگٹ بنایا گیا تھا مگر کیوں؟ اس کی تو کسی سے دشمنی نہ تھی۔ لاتعداد سوالات، اندیشے اس کے دل کی کانپتی دیواروں پر محوِ رقص تھے مگر لفظوں میں ڈھل کر زبان سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔

گاڑی مختلف راستوں سے ہو کر' ناآشنا راستوں سے گزر کر ایک مخدوش عمارت کے سامنے رک چکی تھی۔

''یہ۔ یہ تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو؟'' اس کے حلق میں پھنسا ہوا گولہ چیخ کی صورت میں نیچے اترا۔ اس کا دل خوف کی دلدلی زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔

''مم۔ میں وہ نہیں ہوں جس کے دھوکے میں تم لوگ مجھے لائے ہو۔ پلیز رحم کرو۔'' اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا مگر اسے اغوا کرنے والے، سرد سرد سی خاموشی کے ساتھ اسے ریوالور کی زد میں نیچے اتار کر آگے بڑھانے لگے۔ پتا نہیں وہ کن کن راستوں سے گزار کر اسے لے جا رہے تھے۔ مارے خوف کے اس کے قدم

تو اٹھ بھی نہ رہے تھے۔ اوپر سے ملگجے اندھیرے کے باعث کچھ سجھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد ایک چوبی دروازے پر اسے روک دیا گیا۔

خوش آمدید۔ سرجن مومنہ طارق احمد!'' دروازے کے عین وسط میں کھڑے شخص نے سر کو ہلکا سا خم دے کر گویا اس کا استقبال کیا۔

اس کی روح تک میں سناٹا اتر گیا۔ اونچا لمبا وجود' سفید شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر سرمئی رنگ کا نقاب تھا۔ البتہ دو سنہری آنکھیں سرد تاثرات کے ساتھ اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

''طلحہ! اتنی نازک سرجن کے لئے اس آتش گیر کھلونے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ اب اس کے پیچھے کھڑے شخص سے مخاطب تھا جو اس کی بات پر خفیف سا ہو گیا اور جلدی سے ریوالور والا ہاتھ نیچے کر لیا۔

''اس۔ اس ساری زحمت کی وجہ۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟'' وہ نقاب سے جھانکتی اس کی سرد آنکھوں سے نگاہیں ہٹا کر خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ بولی پھر لہجے کو کمپوز کرتے ہوئے بولی۔

''آپ لوگ شاید مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔ اگر جانتے تو ایسی حماقت ہرگز نہ کرتے۔''

''یہی تو دکھ ہے سرجن کہ ہم آپ کو جانتے ہیں۔'' نقاب پوش کی آواز اتنی سرد اور کاٹ دار تھی کہ مومنہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

وہ اب پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گیا تھا۔اسے بھی پیچھے لایا گیا۔یہ ایک ہال نما کمرا تھا۔اس کے اعصاب یہاں آ کر بری طرح متاثر ہوئے تھے۔اس کی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت زخمی پڑے تھے۔

ایک لمحے کے لئے اس نے اذیت کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

"نہیں سرجن! انہیں آنکھیں کھول کر دیکھو۔بھارتی حکومت کی طرح چشم پوشی کرنے سے یہ خون بہنا رک نہ جائے گا۔اذیت ناک منظر گم نہ ہوں گے کیونکہ یہ خواب نہیں ہے' حقیقت ہے۔سفاک حقیقت۔اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اور محسوس کرو۔" اس کی بھاری آواز اس کی پشت سے ابھری تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ ہم نے تمہیں یہاں کیوں زحمت دی ہے۔"

وہ ہونٹ بھینچے۔عجیب احساسات کے ساتھ تختوں پر لیٹے زخمیوں کو دیکھتی رہی پھر پلٹ کر مضطربانہ انداز میں بولی۔

"یہ کام تو آپ لوگ کسی میل سرجن سے بھی لے سکتے تھے یا کسی بھی سینئر ڈاکٹر سے۔میرا ہی انتخاب کیوں کیا گیا؟"

"بہت سے سوال ایسے ہوتے ہیں سرجن جن کا جواب وقت دیتا ہے۔تم بھی وقت کا انتظار کرو۔" وہ اسی کھردرے انداز میں بولا۔مومنہ کو لگا وہ ہلکے سے مسکرایا بھی تھا جیسے کوئی شکاری جال میں بلبلاتے شکار کو دیکھ کر اپنی فتح مندی پر مسکراتا ہے۔ہو سکتا ہے یہ اس کا وہم ہو۔اسے بے طرح غصہ آ گیا۔

"اب مزید کسی سوال کی اجازت تمہیں نہیں دی جائے گی۔" وہ یکدم بولا تھا اور وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔پھر وہ ایک لڑکے کو اشارے سے بلا کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لڑکا تمہاری مدد کرے گا اور کچھ سامان ہے۔ہے تو ناکافی مگر ہمارے پاس فی الوقت اتنا ہی ہے اور ہاں۔ایک بری خبر کہ تمہیں اس ساری محنت کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔تمہیں یہ کام بلا معاوضہ کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں ہنسی کا رنگ ابھرا تھا۔مومنہ کو لگا جیسے وہ اس کی ہتک کر رہا ہو۔نقاب کے پیچھے اس کی بے بسی پر جی کھول کر ہنس رہا ہو۔

مومنہ نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے بیگ چھین کر اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔

وہ کل سات زخمی تھے جن میں چند ایک تو بڑی بری طرح مجروح تھے۔یہ اس کے لئے بڑا تلخ تجربہ تھا اور جن حالات میں یہ کام انجام دینے پر مجبور تھی اس کے اعصاب کے لئے خاصا بوجھ ثابت ہو رہا تھا۔اس پر سامان بھی ناکافی تھا۔وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

"کم از کم مجھے اتنا موقع تو دیا جاتا کہ میں کچھ سامان ہی لے آتی۔" وہ بڑبڑائی۔

"اگر موقع دیا جاتا تو آپ یہاں کبھی نہ آتیں۔" اس کی معاونت کرتا لڑکا طنز سے ہنسا تو ایک زخمی کے بازو پر بینڈیج کرتے کرتے اس نے سر اٹھا کر ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے خیال سے کسی قسم کی دھوکہ دہی کے بجائے یہ کام امن اور سچائی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔" اس کے دل میں نقاب پوش کے لئے شدید غصہ تھا۔

تین گھنٹے کی مسلسل محنت نے اسے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا اسے اپنی سوچوں اور ذہنی کوفت نے نیم جان کر دیا تھا۔ وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے پونچھ رہی تھی۔ جب ہال کا دروازہ کھلا اور وہی نقاب پوش اندر داخل ہوا۔

"اتنا سا کام تو ہم بھی بہ آسانی کر لیتے ہیں سرجن۔" اس نے نیم غنودہ پڑے زخمیوں پر ایک اطمینان بھری نظر دوڑائی پھر نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"تو پھر مجھے زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ شکریہ کے بجائے اتنے دل شکن جملے پر راکھ ہو گئی۔

"پتا نہیں کیا سوچ کر تمہیں یہ زحمت دے ڈالی۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پر ملال سی نظریں اس پر ڈالیں۔

اس بار وہ غیر محسوس طور پر چونک گئی۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا یا آنکھوں میں جو مسلسل اسے چونکا رہا تھا۔ اس کی سوچوں کے سمندر میں ایک تلاطم پیدا کر رہا تھا۔

"ایک سرکاری ہاسپٹل میں تو اچھا خاصا معاوضہ مل جاتا ہو گا سرجن! مگر افسوس یہاں تمہیں زیادہ محنت بلا معاوضہ کرنا پڑی۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا اور ایک افسردہ سی سانس بھرتے ہوئے زخمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں کشمیر کے نہتے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ یہاں تو بلا معاوضہ علاج کرنا ہو گا۔ جذبۂ ہمدردی اور جذبۂ ہم مذہبی' خون میں اگر ہیجان پیدا کر رہا ہو تو بلا معاوضہ یہ بھی نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو اس کا معاوضہ تو جمع ہو رہا ہے اوپر کے بینک میں۔ خیر۔" وہ یکدم جذباتی لمحوں کی گرفت سے خود کو نکال کر سر کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گیا۔ "یہ باتیں آپ سرکاری لوگ کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو ہم دیوانوں کی باتیں ہیں۔ آیئے۔ آپکو بہ حفاظت چھوڑ آئیں گے ہمارے آدمی۔" وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی قدم اٹھانے لگی مگر پلٹتے قدموں میں ایک بوجھل سی کیفیت تھی۔

باہر نکلی تو کھلی فضا رخساروں پر خنک سی محسوس ہونے لگی۔ اسے حیرت ہوئی کہ جاتے وقت تو یہ راستہ ہر گز نہیں تھا۔ کوئی دوسرا ہی پیچیدہ قسم کا راستہ تھا۔

"سرجن!" وہ چلتے چلتے رک کر اس کی طرف پلٹا۔ لازماً اسے بھی ٹھہرنا پڑا۔ "میرا خیال ہے تمہاری تھکن اور ناراضی شاید اس سے دور ہو جائے۔" اس نے جیب سے چند بڑے بڑے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

احساسِ تذلیل نے مومنہ کی رگوں میں طوفان مچادیا۔اس کا دل چاہا وہ اسکا منہ نوچ لے۔اس کے رخسار غصے سے لال انگارہ ہو گئے۔

"بے شک۔میں آپ کو سرکاری معاوضہ تو نہیں دے سکتا جس کے لئے آپ نے اتنے سال تعلیم حاصل کی ہے۔"

"مسٹر اپنی حد میں رہو۔میری جاب میرا پرسنل افیئر ہے۔وہاں مجھے کیا ملتا ہے کیا نہیں' اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ گویا پھٹ پڑی اور رخ پھیر کر اپنے اندر کا ابال دبانے کی کوشش کرنے لگی۔واپسی کے راستوں سے وہ ناواقف تھی ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا ایک لمحہ تاخیر کئے بغیر یہاں سے بھاگ جائے۔

"بجا فرمایا۔یہ خالص تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔" اس نے ایک ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر مضمحل سے انداز میں ہنس دیا۔

"پتہ نہیں کیوں ہم دوسروں سے اتنی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں کہ جب ٹوٹتی ہیں تو رگ رگ میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔دل لہو ہو جاتا ہے۔خیر..." اس نے سر کو ہلکے سے جنبش دے کر ایک گہری سانس کھینچی۔

"اوکے سرجن۔خدا حافظ۔"

اس کے اشارے پر سفید گاڑی اس کے پاس آرکی۔وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے بیک ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔

وہ چلتا ہوا نزدیک آیا اور کھڑکی پر دونوں ہتھیلیاں جما کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"ہم تمہیں اپنے مجاہد بھائیوں کے لئے پھر زحمت دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور چہرے پر پڑی نقاب اتار دی۔

گاڑی سست روی سے آگے بڑھ گئی مگر مومنہ کی نگاہیں تو جیسے پیچھے ہی رہ گئی تھیں۔

ہوا کے جھونکوں سے ہلکورے لیتے بھورے بال، چوڑی پیشانی کے نیچے دو سنہری آنکھیں، تراشیدہ تیکھی ناک اور بھورے رنگ کی خوشنما داڑھی۔گاڑی دور ہوتی چلی گئی مگر وہ چہرہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر بھی اوجھل نہ ہوا تھا۔اسے لگا اس نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے مگر کہاں؟

شاید لندن میں جب وہ سٹوڈنٹ تھی یا ہاسپٹل میں جب ہاؤس جاب کر رہی تھی یا مگر کہاں؟اس کے ذہن پر عجیب سا بوجھ آن گرا۔اس نے تھک کر سیٹ کی پشت پر ٹیک لگا کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔تھکن ہر مسام سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔سفید گاڑی اسے ہاسپٹل سے دور اتار کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی مگر وہ کتنی دیر اس جگہ کھڑی اس عجیب و غریب واقعے پر غور کرتی رہی پھر سر جھٹک کر ہاسپٹل کے بجائے گھر چلی آئی۔

مسلسل کئی گھنٹوں کی ذہنی اور جسمانی تھکن نے اسے اتنا نڈھال کر ڈالا تھا کہ بستر پر پڑتے ہی نیند کی وادی میں اتر گئی۔جب آنکھ کھلی تو بخت بی بی اس کے کمرے میں تھیں۔

"بہت تھک گئی ہو کیا؟" انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگیں۔

"میرا تو خیال تھا تم طارق ہاؤس جاؤ گی۔ زہرہ کا فون تھا، پوچھا تمہارا۔ میں نے کہا یہ تو آتے ہی سو گئی ہے۔"

"ہاں۔ جانا تو وہیں تھا مگر۔ بس۔" اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

"مولوی جی کہہ رہے تھے کہ لگتا ہے ہماری بیٹی تو پہلے دن ہی کوئی میجر آپریشن کر کے آئی ہے۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑی اور اٹھ کر بی بی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"یہ خوش فہمی تو انہیں ہو گی نا۔ آخر بیٹی ہوں ان کی۔"

"ارے ہاں۔ ڈاکٹر کویتا کا بھی فون آیا تھا۔ تم سو رہی تھیں میں نے جگایا نہیں۔ اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی جب میں نے کہا کہ تم سو رہی ہو۔"

بخت بی بی کی بات سن کر اس کے مسکراتے لب بے ساختہ سکڑ گئے۔

کویتا اور سنیل یقیناً اس کے اس طرح غائب ہو جانے پر تشویش میں مبتلا ہو گئے ہوں گے کہ وہ تو اپنے گیسٹ کو ریسیو کرنے گئی تھی اور خود ہی اڑن چھو ہو گئی۔ اس کے تصور پر دو سنہری آنکھیں اور وہ سرد سرد لہجہ چھا گیا۔

"بی بی۔ غازی شاہ کب آئے گا؟" اسے بے اختیار غازی شاہ یاد آ گیا اور وہ خود بھی اپنی اس کیفیت پر حیران رہ گئی کہ اسے غازی شاہ کا خیال کیوں آ گیا۔

"اسے خبر تو دے دی تھی میں نے تمہارے انڈیا پہنچنے کی۔ آ جائے گا کسی دن۔" بی بی کے بجائے مولوی خضر محمد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"اسے خبر بھی ہے میرے انڈیا آنے کی پھر بھی نہیں آ رہا ملنے۔" اس کا دل یک لخت برا ہو گیا۔ عجیب سی چوٹ دل پر پڑتی محسوس ہوئی۔

"وہ اگر آپ کا اپنا خون ہوتا تو ایسا بے پروا اور بے مروت ہرگز نہ ہوتا۔" وہ بیڈ سے نیچے اتری اور سلیپر پہن کر باتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

"مو۔ منہ۔" مولوی خضر محمد نے اسے سخت فہمائشی نظروں سے دیکھا۔

بخت بی بی نے سر جھکا لیا اور کانپتی انگلیوں سے بستر کی سلوٹیں ٹھیک کرنے لگیں۔

"وہ میرا خون نہیں ہے تو کیا ہوا۔ تربیت تو اس کی میں نے ہی کی ہے۔ بخت کی گود میں پل کر بڑا ہوا ہے۔ خون سے کیا ہوتا ہے۔ سارا رنگ تو تربیت اور محبت کا ہوتا ہے۔ آج کے بعد میں تمہارے منہ سے ایسی کوئی بات نہ سنوں یاد رکھنا۔" مولوی خضر محمد بڑی ناراضی سے کہہ کر کمرے سے چلے گئے۔

وہ ہاتھ میں تولیا پکڑے مجرموں کی طرح کھڑی رہ گئی۔ بے سوچے سمجھے بول دینے والے جملے پر اتنا شدید رد عمل ہو گا اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

"کیا ہوا جو میں نے اسے جنم نہیں دیا۔ جنم دینے والی بھی تو ایک عورت تھی نا۔ جب اس کی دادی نے اسے میری گود میں دے کر آنکھیں بند کی تھیں تب وہ آٹھ سال کا تھا تب سے لے کر اب تک میں نے اسے ایک بار بھی اپنی سگی اولاد کے سوا کچھ نہیں سمجھا۔ نہ مولوی صاحب نے۔"

"آپ بھی خفا ہو گئیں بی بی!" وہ دل گرفتہ ہو کر ان سے لپٹ گئی۔ خفت اور ندامت کے احساس سے اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

"نہ بیٹی! خفا تو مولوی جی بھی نہیں ہوئے تم سے۔ ہاں بس تھوڑے دکھی ہو گئے۔" بی بی نے اس کا سر تھپکا۔

"میں انہیں منا لیتی ہوں۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا بی بی! میں تو غازی شاہ کی بے پروائی اور بے مروتی کی بات کر رہی تھی۔ اتنے برسوں بعد آئی ہوں مگر وہ مجھ سے ملنے بھی نہیں آیا۔ ایک فون تک نہیں کیا۔ بچپن کی وہ معصوم صورتیں بھی گم ہوتی جا رہی ہیں۔" وہ پلکوں کی لمبی جھالروں کو جھپک کر نمی کی دھند کو جھٹکنے لگی۔

"چلو چھوڑو۔ تم دل برا مت کرو۔ وہ آئے گا تو مولوی جی اس کی خوب خبر لیں گے۔ تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" بی بی محبت بھرے لہجے میں بولیں اور اس کا سر تھپک کر کمرے سے نکل گئیں۔

☆...☆...☆

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ "طارق ہاؤس" آئی تو پاپا اپنے مہمانوں میں مصروف تھے۔ وہ انہیں سلام کر کے ممی کے بیڈروم میں چلی آئی۔ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنی ساڑھی کی فال درست کر رہی تھیں۔ وہ کسی دعوت میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ نیلے رنگ کی سیاہ بارڈر والی ساڑی میں ان کا متناسب سراپا بہت جچ رہا تھا۔

"آ گئیں بیٹا جان! بی بی اور مولوی صاحب کیسے ہیں؟" انہوں نے آئینے میں اس کے ابھرتے عکس کو دیکھ کر مسکراہٹ اچھالی۔

"ٹھیک ہیں۔" وہ ان کے بیڈ پر گر گئی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ ادھر ادھر ایک دو چینل بدلے پھر دوبارہ آف کر کے ریموٹ ایک طرف ڈال کر اضطراری انداز میں بیڈ سے اتر گئی۔

"امی! کشمیر کے مسلمانوں پر تو بے حد ظلم ہو رہا ہے۔ یہاں کے حالات تو بہت خراب ہیں۔ آخر یہ کب تک چلتا رہے گا؟" وہ ان کے نزدیک دیوار سے لگ کر متاسفانہ لہجے میں بولی۔ امی کا ہاتھ اپنی ساڑھی کے پلو پر لمحہ بھر رکا، وہ اس کی طرف پلٹیں۔

"تم نے لنچ کر لیا ہے؟"

"جی۔" اس نے امی کا چہرہ دیکھا پھر صوفے پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سارے زخمی مجاہد پھرنے لگے جن کے زخموں کا اندمال کر کے وہ آئی تھی۔ جن کو نعرۂ تکبیر پڑھنے اور جدوجہد آزادی کے بالکل جائز مطالبے پر ٹارچر سیل کا نوالہ بنایا جا رہا تھا۔ جنہیں غلام بنانے کے لئے بھیانک مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔

ایک ایک مجاہد کا زخم وہ اپنے دل پر لے کر وہاں سے آئی تھی۔ ان کے جذبہ جہاد نے اسے اندر سے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس کی روح نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ کیسے کیسے زخمی تھے مگر کسی کے لب پر آہ یا سسکی نہیں تھی۔ بلکہ یوں مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کر رہے تھے جیسے جنت کے باغوں میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہوں۔ ہاں۔ وہ سارے جنت کے ہی تو مہمان تھے۔ زمین پر اترے تھے اسلام کی سربلندی کے لئے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سر صوفے کی پشت پر ٹکا لیا۔

”مومو!“ امی نے اس کے کندھے کو ہلکے سے تھپکا۔

”کیا سوچنے لگیں بیٹی؟“

”سوچ نہیں رہی ہوں‘ بلکہ دیکھ رہی ہوں۔ وہ سب کچھ جو یہ آنکھیں نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اب سوچنے کا وقت کہاں ہے امی! اب تو میدان عمل میں اترنے کا وقت ہے۔ اب تو مسلمانوں کے یک جا ہو جانے کا وقت ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میرا خیال ہے تم تھک گئی ہو۔ آرام بھی نہیں کیا ہو گا نا۔“ امی اسے پیار سے پچکارنے لگیں۔

”امی!“ اس نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا اور کرب آمیز احساس کے ساتھ لب بھینچ لئے۔

”آرام ہی تو کرتی رہی اب تک اور اسی بات پر دکھی ہوں۔ کیا آج کشمیری مسلمانوں کو آرام نصیب ہے؟ کیا راتوں کی نیندیں انہیں میسر ہیں؟ امی یہ دھرتی تو کھولتا ہوا لہو بن گئی ہے اور کس دھڑلے سے بھارتی حکومت باہر یہ پروپیگنڈہ کرتی پھرتی ہے‘ یہ شرمناک جھوٹ بولتی پھرتی ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے عوام نے الیکشن کے

ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ بھارت کے حق میں کر دیا ہے لیکن یہاں کے حالات کیا ثابت کر رہے ہیں۔ کیا یہ اکھنڈ بھارت کا دھوکہ نہیں ہے۔“ وہ رنج اور غصے سے صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

”تو تمہیں مولوی جی نے اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا؟“ پاپا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے برہمی سے گویا ہوئے۔

”تمہیں آئے ہفتہ بھر ہوا ہے اور تم نے خود کو ان سیاسی معاملوں میں الجھانا شروع کر دیا۔“

”پاپا! یہ صرف سیاسی معاملہ نہیں ہے۔“ اس نے پلٹ کر پاپا کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

”مجھے بابا نے کچھ نہیں بتایا۔ میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ یہاں میڈیا پر سنسر ہے تو کیا ہوا۔ بھارتی درندوں کے مظالم تو کھلی سڑکوں پر دکھائی دیتے ہیں۔“

”اچھا بس۔“ ممی نے گھبرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا دباؤ ڈالا اور پھر طارق احمد کا چہرہ دیکھا۔

”ٹھیک ہے تم بھی جانتی ہو۔ میں بھی جانتا ہوں بلکہ ہر کشمیری باخبر ہے مگر آئندہ تم اس موضوع پر بات نہیں کرو گی۔“ وہ دبنگ لہجے میں بولے۔ پھر ممی کی طرف دیکھ کر بولے۔

”چلو زہرہ۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔“ وہ کمرے سے نکل گئے۔ مومنہ ان کی اس بے حسی، سنگ دلی پر گنگ سی رہ گئی۔

"وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں جان! نہیں چاہتے کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے۔" ممی اپنا پرس اٹھا کر اس کے رخسار کو سہلاتے ہوئے بولیں۔

"ایسا کرو۔ کویتا کے پاس چلی جاؤ یا پھر نورین کی طرف ہو آؤ۔ بہت دنوں سے وہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔ دل بہل جائے گا۔"

پاپا کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا تو ممی اس کی پیشانی چوم کر سرعت سے کمرے سے چلی گئیں۔

☆...☆...☆

وہ ہاسپٹل آئی تو کویتا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ اچھی رہی۔ اپنے گیسٹ کے ساتھ فرار ہو گئیں اور ادھر ہم جناب کی واپسی کی گھڑیاں گنتے رہے۔"

"سوری کوی! مجبوری ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی۔" اس نے چہرہ اپنے بیگ پر جھکا لیا اور زپ کھولنے لگی۔

"اوہو۔ مجبوری کیسی مجبوری؟ کوئی مدماتا راج پوت تو نہیں آگیا تھا اڑن کھٹولے میں۔" وہ اس پر جھکی۔

"کوی۔ بہت مار کھائے گی۔ ابھی تیری صحبت کا اثر نہیں ہوا مجھ پر۔ ایسے راج پوت تجھے ہی مبارک۔" اس نے پرس اسے جڑ دیا۔

"ارے۔ اپنے تو من کے سنگھاسن پر اب کوئی راج پوت سج ہی نہیں سکتا۔ بالکل خالی من ہے سونا سونا۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔

"خیریت؟ پرکاش سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟" مومنہ نے مذاق سے اسے چھیڑا۔

"جھگڑا؟" اس نے ہلکی سی سانس کھینچی۔

"یہ تو بہت معمولی سا لفظ ہے۔ یہاں تک بات ہوتی تو... خیر۔" وہ جیسے کسی جذباتی لمحے کی گرفت سے خود کو نکالتے ہوئے ہنس دی پھر رسٹ واچ پر نگاہیں ڈال کر بولی۔

"اب میں چلوں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے ادھر باتیں بگھارتے بگھارتے۔ ڈیوٹی روم میں میرے مریض بیٹھے مجھے کوس رہے ہوں گے اور جگن جی کے سامنے کوئی بھی بنتی (معذرت) نہیں چلتی۔ او کے۔" وہ ہاتھ ہلاتی نکل بھاگی۔ مومنہ بھی اپنا سامان سنبھال کر کرسی سے اٹھ گئی۔

☆...☆...☆

ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ پارکنگ ایریا میں اپنے شولڈر بیگ پر جھکی گاڑی کی چابی ڈھونڈ رہی تھی جب سرجن سنیل اس کے قریب چلے آئے۔

"مومنہ جی!" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ اکیلی جارہی ہیں۔ میرا مطلب ہے بالکل تنہا۔" وہ بے اختیار اڈنے والی مسکراہٹ کو نہ چھپا سکی۔

"میں سمجھی نہیں سنیل صاحب! میں تو روز ہی اکیلے جاتی ہوں۔" اس نے چابی نکال کر بیگ شانے پر لٹکا لیا۔

"میں اس کارن کہہ رہا ہوں کہ شہر کے حالات اچانک خراب ہو گئے ہیں اور ان حالات میں آپ کا تنہا جانا مناسب نہ ہوگا۔" ڈاکٹر سنیل کا اس طرح تشویش میں مبتلا ہونا مومنہ کے لئے خاصی حیرت انگیز بات تھی۔ تاہم وہ اپنی حیرت ظاہر نہ کرتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی۔

"اس اطلاع کا شکریہ مگر اب تو مجھے ہر قسم کے حالات سے واسطہ پڑے گا اور مجھے تنہا ہی فیس کرنا پڑے گا۔ یہ آنا جانا تو میرے روز کا معمول ہے اور یوں بھی میرے پاس میری اپنی کنوینس ہے۔"

"ہاں۔ مگر پھر بھی۔ اگر آپ کو مجھ پر شواس ہو تو میرے ساتھ آجایئے۔ میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔ اور۔"

"تھینک یو ڈاکٹر سنیل!" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلی بولی۔

"کیا میرے نصیب کی کسی گولی کو آپ روک لیں گے؟ اگر کوئی حادثہ میری قسمت میں لکھا ہوگا تو آپ اسے ٹال سکیں گے؟"

"بھگوان نہ کرے جو کوئی حادثہ آپ کا نصیب ہو۔" ڈاکٹر سنیل نے جیسے تڑپ کر کہا۔ اس کا یہ انداز مومنہ کو لحظہ بھر سٹپٹا گیا تاہم وہ سنبھل کر بولی۔

"ڈاکٹر سنیل! کوئی کسی کو زندگی نہیں دے سکتا اور کوئی اس کے لکھے سے پہلے اسے موت سے ہمکنار نہیں کر سکتا اور پھر میں تنہا ہرگز نہیں ہوں۔ میرے ہمراہ میرے اللہ کی عظیم ذات ہے جس کی موجودگی کا احساس کسی مسلمان کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیتا۔ اسے کسی بھی خوف میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ آئی ایم تھینک فل ٹو یو۔ آپ نے میرے لئے اتنی فکر مندی ظاہر کی۔ اللہ حافظ۔" وہ پلٹ گئی۔

ڈاکٹر سنیل اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب اس کی گاڑی پارکنگ ایریا سے نکل گئی تو وہ سست قدموں سے پلٹا اور ٹھٹکا۔ گول ستون سے ٹیک لگائے کویتا کھڑی تھی۔ اپنے آوور آل کی دونوں جیبوں میں ہاتھ پھنسائے ایک گمبھیر سنجیدگی سے غیر مرئی نقطے کو تک رہی تھی۔

"تم نے دیکھا سنیل! کتنا وشواس تھا، کتنی طمانیت تھی، اس کے چہرے پر، جیسے کوئی بڑی شکتی اس کے ہمراہ ہو۔ ڈاکٹر سنیل! یہ صرف مومنہ کے چہرے پر ہی نہیں، میں نے ہر کشمیری مسلمان کے چہرے پر ایسا ہی وشواس، اسی شکتی کو دیکھا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس بھر کر آنکھیں بند کر لیں پھر مجروح انداز میں مسکرانے لگی۔

"پر کاش میری ایسی باتوں سے نالاں رہتا ہے۔ مجھے مورکھ خیال کرتا ہے۔ کیا میں مورکھ (احمق) ہوں سنیل؟" اس نے آنکھیں کھول دیں مگر راہداری سنسان تھی۔ ڈاکٹر سنیل وہاں سے جا چکا تھا۔

"شاید تم بھی مجھے مورکھ خیال کر رہے تھے۔" اس کے لبوں کے گوشے میں پھیلی مسکراہٹ گہری ہو گئی مگر دوسرے پل یوں سکڑ گئی جیسے کھلنے والے پودے کو کوئی جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔

اس کے دھیان کی رو ماتا جی کی طرف دوڑ گئی۔ انہوں نے جاتے سمے اسے خاصی تاکید کی تھی کہ وہ جوں ہی فارغ ہو سیدھی گھر چلی آئے۔ کہیں بازار یا ادھر ادھر نہ نکل جائے کیونکہ خالی خالی گھر انہیں کاٹنے کو دوڑتا تھا۔

وہ کیا بتاتی ماتا جی کو کہ... اسے تو وہ گھر اس وقت بھی ایسے ہی کاٹنے کو دوڑتا تھا جب بھرا پرا تھا۔ جب انیتا کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب رمیش اور بھابی رادھا کینیڈا نہیں گئے تھے۔ جب ماتا جی ہر وقت اپنے پیروں سے یہاں وہاں بھاگتی دوڑتی تھیں۔

جب پرکاش ہر روز آتا، خوب ہنسی مذاق کرتا۔ اسے اپنی بائیک پر بٹھا کر سڑکوں پر لئے لئے پھرتا رہتا مگر اس کی آتما کو اس وقت بھی آنند نہیں تھا۔ اس کے من کو اس کی آتما کو کسی نادیدہ شے کی تلاش تھی۔

شاید آنند ہی کی۔

☆...☆...☆

مومنہ گھر پہنچی تو بخت بی بی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اسے خود سے لگا لیا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا دل تو سہما جا رہا تھا۔ شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں نا۔"

"کچھ، نہیں بی بی! بلکہ بہت زیادہ خراب ہیں۔" اس نے شولڈر بیگ اتار کر ایک طرف پھینکا اور فرش پر بیٹھ کر سینڈل اتارنے لگی۔

"ہر جگہ بھارتی فوجی درندے مظاہرین پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے ہیں۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں۔ آخر... آخر کیا حق پہنچتا ہے انہیں حق کی آواز کو دبانے کا۔ سری نگر کے سارے اخبارات پر سنسر عائد کر کے سرکار سمجھ رہی ہے کہ وہ لوگوں کو بے خبر رکھنے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر ان کی درندگی تو کھلی سڑکوں پر دکھائی دے رہی ہے۔ کس طرح یہ فوجی بھیڑیئے نہتے مسلمانوں پر قہر بن کر ٹوٹ رہے ہیں۔" غم وغصے کی لہریں اس کے اندر سے امڈ رہی تھیں۔ اس نے سینڈلیں صوفے کے نیچے کھسکا دیں اور دل گرفتگی سے بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ظلم کی انتہا ہے بی بی! ظلم کی انتہا۔"

"یہ مظالم تو اب کشمیریوں کے لئے روز کا معمول ہیں۔ کشمیری مسلمان تو اس سے بھی بڑے بڑے گھاؤ سہہ رہے ہیں جنہیں دیکھ کر مضبوط سے مضبوط دل بھی لرز کے رہ جاتے ہیں۔" مولوی خضر محمد اندر داخل ہوتے ہوئے بولے اور مومنہ کا چہرہ دیکھا جہاں ایسا بے چارگی آمیز کرب پھیلا ہوا تھا جو عموماً حالات پر سوچ بچار کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے آج خود اپنی آنکھوں سے سب دیکھ لیا اور اپنے دل پر آبلے کی طرح محسوس کیا۔"

"بابا!" مومنہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ مولوی صاحب کے لہجے اور آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ اس کے لب کچھ کہنے کی خواہش میں کپکپا گئے۔ اسے لگا کسی نے اس کے دل پر ضرب لگائی ہو۔ جو روح تک میں گھاؤ ڈال گئی ہو۔

"تو کیا آپ مجھ سے بے حسی کی توقع کر رہے تھے۔"

وہ بے پناہ دکھ کے ساتھ فرش سے اٹھتے ہوئے مولوی خضر کو دیکھنے لگی۔

"میری رگوں میں آپ کا خون نہیں ہے اس لئے آپ ایسا سمجھتے رہے کہ میں۔"

"نہیں۔ نہیں مومنہ۔" مولوی خضر محمد نے یکایک نرمی سے اس کے شانے پر اپنا بازو پھیلا لیا۔

"مجھے نہ تمہارے خون پر شک ہے نہ اپنی تربیت پر مگر۔" وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچانے لگے۔

"مگر یہ کہ۔ آپ سوچ رہے تھے کہ مغرب کی آزاد فضاؤں میں رہ کر آنے والی ایک سرجن کی آنکھیں بھلا کشمیریوں کے دکھ پر کیسے آنسو بہا سکتی ہیں۔ اس کا دل مغرب کی آلودہ فضاؤں سے اتنا شقی ہو گیا ہو گا کہ ان مظالم پر سسک ہی نہیں سکے گا۔ ہے نا بابا؟ یہی سمجھ رہے تھے نا آپ؟" وہ خود آزار سی کیفیت میں ہنس پڑی۔

"مومنہ بیٹی!" مولوی صاحب کا ہاتھ اس کے شانے پر لرزنے لگا۔ جسے کرب سے گزرتی مومنہ نے جھٹک دیا۔ اس کا دل دکھ کی اتھاہ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

"آپ نے مجھے گورنمنٹ ہاسپٹل جوائن کرنے سے نہیں روکا۔ مجھے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میری مسیحائی کشمیری مسلمانوں کے لئے ہونی چاہئے۔ ایک بار بھی۔ ایک بار بھی مجھ سے سری نگر کے حالات پر تبصرہ نہیں کیا۔ اس لئے نا کہ آپ کے خیال میں میں طارق احمد کی بیٹی ہوں اور انہی کی طرح مادہ پرست ہوں گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ بخت بی بی تڑپ کر اس کی طرف بڑھیں مگر وہ کرسی پر گر کر اس کی پشت سے چہرہ ٹکا کر رو پڑی۔

مولوی خضر محمد کا چہرہ ندامت سے دھندلا ہونے کے بجائے اس طرح چمک اٹھا گویا گھنے بادلوں سے یک لخت چمکتا سورج نکل آئے۔

مومنہ کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ اسے لگا وہ خود اپنی نظروں میں گر گئی ہو۔ وہ مولوی خضر محمد کو کیسے بتاتی کہ وہ ان حریت پسندوں، ان مجاہدوں کو ایک لحظہ بھی نہیں بھول پائی ہے جن کا علاج وہ کر کے آئی تھی۔ جن کے جذبۂ جہاد نے اسے اندر سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ ان کی عزت ان کی عظمت کو وہ اپنے دل میں سمیٹ کر لے آئی تھی جو اسی دھرتی کی آزادی کے لئے، جو اسلام کی سربلندی کے لئے اپنا آپ قربان کر دینے پر کمربستہ تھے۔

تصور میں وہ تمسخر اڑاتی، سنہری آنکھیں بھی اب تک ذہن و دل پر چھائی ہوئی تھیں۔ وہ طنز میں ڈوبے جملے اور ہتک آمیز رویہ، یک لخت اس کے اعصاب پر زبردست ضرب پڑی۔ ذہن میں کوندا سا لپکا۔

وہ سنہری آنکھیں۔ ستواں کھڑی سرخ ناک۔ تیز سرخ ہونٹ۔ سب مل کر ایک مانوس سی تصویر میں ڈھلتے چلے گئے۔

اس کے بھل بھل بہتے آنسو پلکوں پر ٹھہر گئے۔ اسے لگا اس کے دماغ میں کسی نے وزنی بم رکھ دیا تھا۔ جو اچانک پھٹ گیا ہو۔

وہ کرسی سے جھٹکے سے اٹھی۔ "بابا غازی شاہ کہاں ہے؟" اس کا سوال غیر متوقع تھا یا اس کا بلا کا اعتماد' مولوی خضر محمد لحظہ بھر کے لئے پلکیں جھپک نہ سکے۔ اسے دیکھتے رہ گئے پھر نظریں چرا گئے۔ تب بخت بی بی بولیں۔

"وہ سری نگر سے باہر ہے۔"

"نہیں بی بی!" اس نے ہاتھ اٹھا کر بخت بی بی کو بولنے سے روک دیا۔

"نہ وہ ملک سے باہر ہے نہ سری نگر سے۔ وہ یہیں ہے اسی خطے میں۔" اس کا لہجہ اتنا مضبوط اور مستحکم تھا کہ مولوی خضر محمد بے اختیار مسکرا اٹھے۔ پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اسے بہت نرمی سے تھام لیا مگر وہ کسی کم سن ناراض بچے کی طرح یونہی روٹھی روٹھی سی کھڑی رہی۔

"ہاں۔ وہ کل شام کو آیا تھا اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ میں اس پر بہت برہم ہوا۔ بہت ڈانٹا ہے اسے کہ اس نے تمہارے ساتھ ایسی حرکت کیوں کی؟"

"وہ۔ وہ غازی۔ غازی شاہ ہی تھا نا۔" مارے تحیر کے وہ زور سے چیخی۔ دوسرے پل جلدی سے ہونٹوں پر ہتھیلی جما دی مگر چہرے پر وہ رنگ اترے کہ چھپائے نہ چھپے۔ خوشی۔ حیرت۔ بے یقینی۔ الجھن نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔

"ہاں۔ وہ غازی شاہ ہی تھا بالکل پاگل لڑکا ہے۔ تمہارے آنے کے دن گنتا رہتا تھا مگر اتفاق سے ایسا ہوتا رہا کہ تم چھٹیوں میں ہفتے دو ہفتے کے لئے آئیں اور وہ سری نگر میں موجود نہ ہوتا۔ اس بار تمہارے آنے کا اسے علم تھا۔ تمہارے خطوط وہی تو پڑھ کر مجھے سناتا تھا۔ تم نے مغرب کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ وہاں کے ہاسپٹلز کے ڈسپلن، صفائی ستھرائی اور دوسری کئی باتیں۔ شاید اس نے تمہاری ان باتوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ تم پر مغرب کا جادو چل گیا ہے۔ مادہ پرستی غالب آگئی ہے۔ اس کے بعد اسے پتہ چلا کہ آتے ہی تم نے گورنمنٹ ہاسپٹل کی جاب کر لی ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ تمہاری غیر موجودگی میں میرے پاس آیا تھا اور مجھے روک دیا کہ میں تمہیں تمہارے اپنے ذہن سے کام کرنے دوں۔ وہ بے وقوف تو اتنا دل برداشتہ ہو گیا کہ اس کے خیال میں تمہیں یہاں کے مسلمانوں سے کیا ہمدردی ہو گی تم محض ایک سرجن کے روپ میں آؤ گی اور اپنے باپ کی طرح پیسہ بنانے کی مشین بن جاؤ گی۔ اس کی یہ حرکت بالکل غیر ارادی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ ہو کہ۔" مولوی خضر محمد بولتے بولتے چپ ہو گئے۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے یک دم دکھی انداز میں ہنس پڑی۔

"چھوڑیں بابا! میں مذاق میں بھی خود پر بے حسی، غداری اور مادہ پرستی کا لیبل چسپاں کروانا پسند نہیں کروں گی۔ کتنی غلط سوچ ہے اس کی میرے بارے میں۔" اس نے تاسف سے سسکی بھری پھر ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

"میں نے اس پیشے کو پر آسائش زندگی کے لئے نہیں اپنایا۔ میرا خواب دولت، سٹیٹس اور بلند سوسائٹی کا نہیں ہے۔ بے شک میں اپنی ایجوکیشن کے دوران میں یہاں کے مسلمانوں کے حالات سے بے خبر رہی۔ یہ میری غفلت ہے۔ کوتاہی ہے۔ دراصل وہاں میڈیا پر مسلمانوں کو خصوصاً مجاہدوں کو دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کو مخفی رکھا جاتا ہے۔ بہر حال میں اپنی کوتاہی مانتی ہوں مگر۔ مگر غازی شاہ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسے اس کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔ کیوں بی بی!" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ بخت بی بی نے اسے لپٹا لیا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ آلینے دو اس بدمعاش کو۔ اسے تو ضرور سزا ملنی چاہئے۔ اس نے میری چاند، میری مومو کو اتنا ذہنی ٹارچر کیا اور کچھ سزا تو آپ کو بھی ہونی چاہئے جی!" بی بی پلٹ کر مولوی خضر محمد پر یک دم بگڑ گئیں۔

"اس بدمعاش کے ساتھ مل کر آپ نے میری بچی کو سمجھنے میں غلطی کی۔ آپ کو کیا خبر کہ میری بچی کا دل کشمیر کی طرح خوبصورت ہے۔" مولوی خضر محمد ہنس دیئے۔

☆...☆...☆

آج سری نگر کی سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ کل احتجاجی مظاہرے کے باوجود کرفیو نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ شاید دن بھر کی خاموشی اور کسی مظاہرے کے نہ ہونے کے سبب سے یا پھر بھارتی حکومت کو بدنامی کا اندیشہ تھا۔ حالانکہ اپنی نام نہاد نیک نامی کو تو وہ پچاس سال پہلے ہی ختم کر چکے تھے۔ کون نہیں جانتا کہ کشمیر کے عوام سے وعدہ کیا گیا تھا کہ "جب کشمیر میں حالات معمول پر آجائیں گے تو بین الاقوامی کمشن کی نگرانی میں کشمیری عوام سے یہ رائے لی جائے گی کہ وہ اپنا مستقبل بھارت سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ شامل ہونے کو ترجیح دیں گے۔"

یہ وہ بنیادی حق ہے جس کا مطالبہ کشمیری عوام پچاس سال سے کرتے چلے آئے ہیں اور اس آواز کو دبانے کے لئے کشمیر میں ہندوستان کی ساڑھے سات لاکھ درندہ صفت فوج نہتے کشمیریوں کی بوٹیاں نوچ رہی ہے۔ ہزاروں خواتین کی عصمتیں پامال کر رہی ہے مگر پھر بھی حق کی آواز کو دبا نہیں سکی۔

کل ہونے والے مظاہرے میں کتنے بے گناہ مسلمان شہید ہوئے تھے اس کا ٹھیک سے کسی کو علم نہیں تھا۔ ایک تو سری نگر کے تمام اخبارات پر سنسر عائد تھا اور دوسرے شہروں کے اخبار کی آمد و رفت بھی ممنوع تھی جبکہ بی بی سی کو عموماً ایسے مواقع پر جام کر دیا جاتا تھا۔

مومنہ طارق کی گاڑی ان مانوس راستوں پر گامزن تھی جہاں اسے اغوا کر کے دو اجنبی لے کر گئے تھے۔ کچھ دشواری کے بعد اسے وہ پرانی عمارت دکھائی دی۔

اس نے گاڑی ایک کنارے پر روک دی۔ عمارت کچھ اس ڈھب کی تھی کہ اسے اندر جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ پریشان سی اطراف کا جائزہ لینے لگی کہ یک دم عقب سے کسی نے اس کی پسلی میں ریوالور کی نال چبھو دی۔ اس کا دل ہراساں ہو کر لحظہ بھر سینے کی دیواروں میں دب کر رہ گیا پھر اللہ کا نام لے کر اس نے ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے رخ موڑا تو اطمینان کی لہر اس کے اندر تک اتر گئی۔ وہ طلحہ احمد تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر چونکا۔

"سرجن آپ یہاں؟ خود سے۔" اس نے ریوالور سرعت سے اس کی پسلی سے ہٹا کر اپنی پیٹی میں اڑس لیا۔

وہ اس کی حیرت کا کوئی جواب سوچتی کہ اچانک اس کی ساری توجہ اس برگد کے درخت پر جا ٹھہری جس کے مضبوط تنے کی کھوہ سے ایک شخص برآمد ہوا تھا۔ وہ بھی طلحہ احمد کے ساتھ کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ کر بوکھلا کر رہ گیا تھا اور بڑی تیزی سے جیب سے ریوالور نکال کر لوڈ کرنے لگا۔ اس کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ بے معنی نہیں تھی۔

مومنہ اب اسے نہیں بلکہ اس تنے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ نکلا تھا۔ طلحہ احمد کے لئے بھی یہ صورت حال خاصی ناگوار تھی۔ تاہم اس نے اپنے اس رفیق کو کچھ نہیں کہا بس اشارے سے ریوالور واپس جیب میں رکھ دینے کو کہا۔

"میں تمہارے لیڈر سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ بھی اپنی حیرتوں کو سمیٹ کر طلحہ احمد سے مخاطب ہوئی۔

جواباً طلحہ احمد بڑے عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"ان سے ملنے کیلئے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی سرجن۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ خاتون! کہ جب وہ حکم کریں گے ہم آپ کو ہاسپٹل سے لے آئیں گے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے اس کا تمسخر اڑانا چاہا۔

"شٹ اپ۔" اس کا منہ لال ہو گیا۔ "میں غازی شاہ سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتی ہوں۔" اس کا لہجہ قطعی بے لچک تھا اور تحکم آمیز بھی مگر طلحہ احمد اور اس دوسرے لڑکے کو اس کے لہجے سے زیادہ اس کے منہ سے "غازی شاہ" کا نام ورطۂ حیرت میں دھکیل گیا۔ چونکہ اس نام سے سوائے قریبی عزیز اور دوستوں رفیقوں کے کوئی واقف نہیں تھا۔ طلحہ احمد کا چہرہ بڑی تیزی سے تناؤ کا شکار ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کلبلانے لگی۔ وہ کچھ پر خیال انداز میں اسے دیکھنے لگا پھر دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کی گاڑی میں جھانکنے لگا۔

"طلحہ احمد! مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش مت کرو کہ کشمیر کی آزادی کے خواہش مند صرف تم لوگ ہو۔ قربانیاں تم ہی دے سکتے ہو۔ بھارتی درندوں کی نفرت صرف تمہاری رگوں میں آگ بن کر دوڑ رہی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر کشمیری مسلمان اسی نفرت میں جھلس رہا ہے۔ میں مومنہ طارق احمد، تمہارے کمانڈر غازی شاہ سے یہی کہنے آئی تھی۔ اسے کہہ دینا کہ اس جدوجہد میں میں بھی شامل ہوں۔" وہ غصے سے لال بھبوکا

چہرے کے ساتھ ہی پلٹی مگر وہیں منجمد ہو گئی۔اس کے اعصاب پر ایسا اثر ہوا جیسے سخت اکڑے ہوئے تاروں کو درمیان سے کوئی کاٹ دے اور وہ ڈھیلے پڑ جائیں۔

''خوش آمدید مومنہ !'' اس کی ہیروں کی طرح دمکتی سنہری آنکھیں مومنہ کی چشم خوش سے ٹکرا کر اس کے چہرے کو انوکھے احساس سے سرخ کر گئیں۔نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں وہ دونوں ہاتھ سینے سے باندھے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا اور مومنہ کی رگ رگ کو یہ مسکراہٹ' یہ آنکھیں چھو گئیں۔

اسے دفعتاً محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں موجود دل زبردست انقلاب سے دوچار ہونے لگا ہو۔اس کی ساری ہستی تند موجوں میں آئی کشتی کی طرح ڈول کر رہ گئی ہو۔

بچپن کی تصویر جو معدوم ہوتی چلی جاتی رہی تھی' یک دم توانا ہو کر جس خوب صورت رنگ میں ڈھل کر سامنے آئی تھی اسے نہ صرف دل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا بلکہ فرطِ مسرت سے قوت گویائی بھی چھن گئی تھی۔وہ جانے محویت کے عالم میں اسے کب تک دیکھتی رہتی کہ غازی شاہ کی آواز اسے عالم مدہوشی سے عام خود شناسی میں لے آئی۔

''سرجن مومنہ میں اور میرے رفیق تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔''

''اوہ۔'' وہ ہلکی سی سانس بھر کر پلکیں جھکا گئی اور کچھ محجوب سی ہو گئی۔

غازی شاہ کے علاوہ دوسرے لڑکوں کی موجودگی کا احساس کر کے اس کے گال تمتمانے لگے۔

طلحہ احمد کو لگا جیسے شیرنی پل بھر میں اپنا طنطنہ بھول گئی ہو۔ابھی کچھ دیر پہلے وہ جس طراری اور غصے کا مظاہرہ کر چکی تھی غازی شاہ کے سامنے سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھتا دکھائی دیا۔

''طلحہ۔تم پہلے اس گاڑی کو ٹھکانے لگاؤ۔پلیز مومنہ۔'' اس نے اپنی چوڑی سرخ ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی تو اس نے بغیر حیل و حجت چابی اس پر رکھ دی۔

وہ اب تک جیسے ایک سحر میں تھی۔خوشگواری اس کے اندر پھلجڑیوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ایک خوب صورت دمکتا رنگ وہ غازی شاہ کی آنکھوں میں بھی دیکھ چکی تھی جو اسے یہاں دیکھ کر ابھرا تھا جس میں ستائش تھی' قبولیت کی سند تھی اور ایسی ہی خوشگواری تھی جو وہ اپنے تن من سے ابھرتی محسوس کر رہی تھی۔

''تمہیں یہاں اس طرح نہیں آنا چاہئے تھا۔یہ بہت غیر محفوظ علاقہ ہے اور پھر پیچھا کرتے ہوئے کوئی بھی یہاں تک آسکتا تھا۔آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اپنائیت کے اسی احساس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگا۔

مومنہ ایک عجیب احساس کے حصار میں گرفتار اس کے ساتھ چلنے لگی۔یہ وہی راستہ تھا جہاں اسے ریوالور کی زد میں لایا گیا تھا مگر آج وہ جیسے ستاروں پر چل رہی تھی گو کہ اس روز بھی اس کی دھڑکن غیر معمولی تھی اور آج بھی مگر اس دھڑکن کے شور میں آج کوئی خوف کوئی دہشت نہیں تھی۔یہ بوسیدہ عمارت کا تہ خانہ تھا جو کئی کمروں پر مشتمل تھا جس میں اسلحہ خانہ بھی تھا۔زخمیوں کو امداد دینے کا سامان بھی تھا اور رہائش کی ادنی سہولیات بھی تھیں۔

وہ اسے ایک ہال نما کمرے میں لے آیا جو خالی تھا۔ ایک میز کے سامنے خالی کرسی پر مومنہ کو بٹھا کر وہ خود اس کے مقابل کی خالی کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دونوں کے درمیان ایک چھوٹی مگر اونچی میز تھی جس کی کھردی سطح پر مومنہ طارق نے اپنے لرزتے ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ وہ اب تک ایک سرخوشی کے عالم میں تھی۔

”مومنہ! بابا سے میری رات کو بات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم میرے رویے پر بے حد دکھی ہوئی ہو۔ مجھ سے خفا ہو۔ سچ پوچھو موموّ! مجھے یقین نہیں آرہا کہ...“

”کہ میں بھی اپنے دل میں کشمیریوں کے لئے ایک نرم گوشہ رکھتی ہوں اور یہ کہ میں مادہ پرست نہیں ہوں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

”نہیں۔ نہیں مومنہ۔“ وہ گویا تڑپ اٹھا۔

”خدارا مجھے غلط مت سمجھو۔ ائرپورٹ پر میں پہنچ نہیں سکا۔ یقین جانو باوجود چاہنے کے میں یہاں سے نکل نہیں سکا۔ اس کے بعد تم سے ملنے کو بے قرار تھا مگر پتہ چلا کہ تم طارق ہاؤس گئی ہو پھر تمہاری سرکاری جاب کا سن کر دل بجھ سا گیا۔ یوں لگا امید کی جو چادر بن رہا تھا اس کا کوئی ٹانکا نکل گیا ہو اور چادر ادھڑتی چلی گئی ہو۔ اس کے بعد تم یہاں آئیں۔ تمہیں یوں بلوانا میری بالکل غیر اختیاری حرکت تھی۔ تمہیں اتنے سالوں بعد اپنے روبرو دیکھ کر میرے اندر کیسے کیسے طوفان اٹھے تھے مگر مجھے اس وقت شدید تکلیف ہوئی جب تم مجھے دیکھتے ہی پہچان نہ پائیں۔ میں نے نقاب ہٹا کر بھی صرف تمہارے چہرے پر الجھن ہی دیکھی۔ پہچان کے رنگ نہ دیکھ سکا۔ یہ ساری باتیں میرے لئے اعصاب شکن اور دل برداشتہ کر دینے والی تھیں مگر پھر بھی

میرے دل کے کسی گوشے میں امید کی لو جگمگا رہی تھی۔ میں خود کو ناکام محسوس کر رہا تھا نا امید نہیں اور جب بابا نے کل مجھے بتایا کہ تم نے نہ صرف مجھے پہچان لیا ہے بلکہ کشمیر کے لئے تمہارا دل اتنا ہی گداز ہے جتنا ہونا چاہئے تو بس مت پوچھو موموّ! میں مارے خوشی کے دیوانہ ہو جاتا۔ میرا دل چاہا اسی وقت اونچے اونچے قہقہے لگا کر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کروں۔“

اس نے فرطِ جذب سے اپنے دونوں گرم ہاتھوں میں اس کے یخ بستہ نازک ہاتھ جکڑ لئے۔ اس کے رویے کی بے ساختگی اور جذبوں کی شدت نے لحظہ بھر کے لئے مومنہ کو حیران کر دیا۔ دوسرے پل وہ ایک دل فریب احساس میں ڈوب گئی۔

کتنے پل دونوں کے درمیان سنسنی خیز خاموشی طاری رہی پھر وہ سنبھل کر بولی۔ ”غازی! میں بھی ہر کشمیری مسلمان کی طرح اپنی حیات کا ہر لمحہ اس کی آزادی کے لئے صرف کر دینا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی موقع دو کہ میں اپنے پروفیشن سے اس کھولتی دھرتی کی آگ بجھا سکوں اور آزادی کی اس جنگ میں اپنا خون بہا سکوں۔“

”خدا تمہیں سلامت رکھے مومنہ! میری عمر بھی تمہیں لگ جائے۔ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں تم اپنی آنکھوں سے اس دھرتی کی مانگ میں آزادی کی افشاں چمکتی دیکھ سکو۔ کشمیر بنے گا پاکستان! یہ نعرہ میری قبر پر...“

”نہیں غازی شاہ۔“ اس نے بڑے مضطربانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔ ”خدا کرے تم خود اپنی آنکھوں سے آزادی کے اجالے دیکھ سکو۔“ اس کی آواز میں لرزش تھی اپنائیت کی۔ محبت کی۔

”تمہاری زندگی مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے سر جھکا گئی۔

غازی شاہ چند لمحے اسے دیکھتا رہ گیا۔اس کی چشم خوش میں پھیلنے والی نمی کو دیکھنے لگا۔ بڑے بے ساختہ پن کے ساتھ اس نے مومنہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لئے اور کرسی سے اٹھا مگر دوسرے پل کچھ

خفیف سا ہو کر اپنے ہاتھ کھینچ کر اپنے سینے پر باندھ لئے اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنی بشری کمزوری پر قابو پالیا۔

"موموا! میرا دل چاہتا ہے میں اس وقت تم سے بہت سی باتیں کروں۔ وہ ساری باتیں جو قطرہ قطرہ میرے دل میں جمع ہو کر سمندر ہو گئی ہیں۔ دل چاہتا ہے یہ سارے بندھ توڑ ڈالوں۔ گزرے ماہ وسال کی باتیں، حال کی اور آنے والے دنوں کی باتیں کرتا جاؤں مگر یہ بڑی خود غرضی ہو گی شاید۔ ہماری دھرتی کھولتا ہوا سمندر بنی ہوئی ہے اور جانے کتنی معصوم جانوں کا خون اس سمندر میں انڈیلا جاتا ہے۔ کتنی ماؤں کو بھون ڈالا جاتا ہے۔ کتنی عورتوں کو بے آبرو کیا جاتا ہے۔

"کشمیریوں کے مقدر میں سیاہیاں بھری جا رہی ہیں۔ ان کے لبوں سے ہنسی چھین لی گئی ہے۔ خوشیوں کے سارے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے ہیں مگر ہم آج بھی یہی کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ یہ بھارتی وحشی درندے ہر روز نہتے کشمیریوں کے مکانوں پر ٹوٹتے ہیں' ان کی آواز کو دبانے کے بجائے ان کے خون کو اور گرما رہے ہیں۔ یہاں ہر کشمیری کو ایک ہی سبق آتا ہے کہ اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ کوئی کتنی دیر زندہ رہا۔ اہم بات یہ ہے کہ زندگی کا انداز کیسا رہا۔ یہاں موت سے کوئی خائف نہیں ہے اور جو قومیں موت سے پیار کرنا سیکھ لیتی ہیں در حقیقت آزادی کی نعمت سے بہرہ ور

ہوتی ہیں۔ جینے کا لطف انہی لوگوں کو آتا ہے جو مرنا جانتے ہیں جو موت سے خوفزدہ نہیں ہی۔ جن کی نظریں اخروی زندگی پر جمی رہتی ہیں۔

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا"

مومنہ طارق اس کی آواز کے سحر اور بیان کی دلکشی میں جکڑی اس بہادر مجاہد، دلیر کمانڈر کو دیکھتی رہی۔ اس کے الفاظ اثر انگیز تھے۔ اس کا جذبہ لائق تحسین تھا۔ مومنہ کو اپنی رگوں میں نیا رس سرائیت کرتا محسوس ہونے لگا جس کے ذائقے سے وہ اب تک محروم تھی۔

"مومنہ! یہ ایک اندھا راستہ ہے جہاں سے واپسی ایک معجزے والی بات ہو گی۔ یہاں ہر سانس زندگی کی ڈولتی ناؤ میں سفر کرتی ہے۔ کب ناؤ ڈوب جائے یا ساحل پر آ لگے۔" وہ کرسی کھینچ کر دوبارہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تم ہی تو کہتے ہو جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا اور جینے کا ہنر وسلیقہ اور لطف انہی لوگوں کو آتا ہے جو مرنا جانتے ہیں۔" وہ جواباً ہلکے سے مسکرائی۔

"میں بزدلی۔ خاموشی اور مفاہمت کی موت کو جذبہ قربانی سے شکست دینا چاہتی ہوں۔ بجائے اس کے کہ زندگی مجھے گزار دے میں زندگی کو گزارنا چاہتی ہوں۔ ایک تفاخر کے ساتھ جینا اور عزت کے ساتھ مرنا

"چاہتی ہوں۔" اس کی لرزتی آواز میں یقین تھا۔ عزم ہلکورے لے رہا تھا اور غازی شاہ کے ہاتھوں کے مضبوط حصار میں اس کے نازک ہاتھ اپنا اعتماد پا رہے تھے۔

اچانک اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کھینچ لئے اس گرفت سے جو اس کے دل پر بھی مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ حیا سے اس کی پلکیں جھکنے لگیں۔

طلحہ احمد اندر داخل ہوا تو غازی شاہ اس خوب صورت منظر سے نظریں ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔

"آؤ آؤ طلحہ۔ اسے تم ایک ذہین سرجن کے ناتے تو جانتے ہی ہو گے مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ..." غازی شاہ کے سرخ لبوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ بجلی کی طرح کوند گئی۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بڑی ملائم نظریں مومنہ کے چہرے پر ڈالیں پھر طلحہ احمد سے مخاطب ہوا۔

"طلحہ۔ بچپن کے نقش بہت گہرے ہوتے ہیں۔ مٹائے نہیں مٹتے اور جب کوئی مٹانا ہی نہ چاہے تب یہ نقش روشنی بن کر ابھرتے ہیں اور وجود کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ اندر باہر ہمارا منور ہو جاتا ہے اور پھر اسی روشنی میں آپ اپنا باقی سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔

"طلحہ، انسیت اور محبت تو بہت چھوٹے سے الفاظ ہیں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے مومنہ سے محبت ہے تو میرا خیال ہے کہ میں اپنے جذبات کی مکمل ترجمانی نہیں کر سکا ہوں بلکہ..."

"غازی۔ شاہ۔" مومنہ کو اپنے گال تمتماتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ طلحہ احمد کے سامنے کوئی ایسی بات کر دے گا۔ اس کا مطلب تھا وہ اس کا بہترین رفیق تھا مگر شرم و حیا نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔

طلحہ احمد کے لبوں کی تراش میں بڑی خوش کن مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ بھی غازی شاہ کے دلی جذبات سے آگاہ ہو چکا ہو۔ "تو یہ ہے وہ غازی! جس کی آمد نے جناب کو بے کل کر رکھا تھا۔ جس کی جاب نے ہرٹ کیا تھا جس کی یہاں موجودگی تمہیں بے پایاں مسرت سے ہمکنار کر رہی ہے اور جس کے لئے تم رات رات بھر قہقہے لگاتے رہے تھے بچوں کی طرح۔"

"ارے ارے بد معاش۔ بد تمیزی بالکل بھی نہیں۔" غازی شاہ جھینپ کر رہ گیا اور کرسی سے اٹھ کر طلحہ احمد کی گردن دبوچ لی پھر دونوں کھل کر ہنسنے لگے۔

ادھر مومنہ سر جھکا کر شرم و حیا سے خود کو کٹتا ہوا محسوس کرنے لگی اور سوچنے لگی کہ جذبۂ جہاد سے سرشار یہ مجاہدین ان برستی گولیوں اور ظالموں کے اندھے مظالم میں اپنے لئے کچھ مسکراتے لمحات کشید کر لیتے ہیں کہ ان پر آشوب حالات میں پھر ایک دوسرے سے یوں مل پائیں گے یا نہیں۔ شاید ان کی زندگیوں میں خوشی کے ایسے چند لمحات ہی ہوتے ہیں۔

وہ محبت بھری نگاہوں سے غازی شاہ کو تکنے لگی۔ اس کا پورا وجود ایک انوکھی خوشی سے سرشار ہو رہا تھا۔

اچانک غازی شاہ کی جیب میں پڑے ٹرانسمیٹر کا بٹن سرخ رنگ کی لائٹ دینے لگا اور ہلکی ہلکی گھرر گھرر کی آواز سنائی دینے لگی۔ غازی شاہ کے ساتھ طلحہ احمد بھی چونک پڑا۔

☆...☆...☆

ٹرانسمیٹر کی سرخ لائٹ کے جواب میں غازی شاہ نے کوئی تین نمبر دہرائے۔

''میں۔'' اس کی آواز اور چہرہ اپنے مخصوص رعب میں ڈھلا اور پتھریلے مجسمے کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔

دوسری سمت آواز بے حد ہلکی تھی جسے صرف وہی سن پا رہا تھا۔

''کیا؟ تمہیں یقین ہے وہ کرنل رمیش ورما ہی ہے۔ اچھا۔ اچھا۔ ہوں۔ ہوائی اڈے پر دکھائی دیا تھا۔ گڈ۔ اچھا حلیہ بتاؤ۔''

دوسری سمت ہلکی آواز میں حکم کی تعمیل ہونے لگی۔

مومنہ نے دیکھا غازی شاہ کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہوتا جا رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون صرف چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ اس کی سنہری آنکھوں کے ہیرے کچھ اور چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

سرخ لائٹ بجھ گئی۔ آواز بھی بند ہو گئی مگر غازی شاہ اسی کیفیت میں رہا۔ اس نے دانتوں میں لب اس شدت سے دبا رکھے تھے کہ مومنہ اور طلحہ احمد کو بیک وقت یہی خیال آیا کہ ابھی خون ان سرخ ہونٹوں سے چھلک پڑے گا۔

''کیا بات ہے غازی شاہ؟'' طلحہ احمد نے تشویش کے عالم میں اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا تو وہ یکدم یوں چونکا گویا گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ تاہم اس کے چہرے کے نازک حصوں میں ٹھہرنے والی سرخی موجود رہی۔ اس نے خالی خالی نظریں طلحہ احمد پر جما دیں۔ وہ شاید خود کو اب تک سنبھال نہیں پایا تھا پھر اچانک سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر یوں جھٹکا جیسے کسی تصور کو جھٹک رہا ہو۔ نگاہوں کے سامنے بنتے کسی منظر سے منہ موڑ رہا ہو۔

''کرنل رمیش کی پوسٹنگ پھر سری نگر میں ہو گئی ہے۔ ہاں۔ سلطان دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ لگتا ہے اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔'' اس نے میز کی سطح پر کہنیاں ٹکا کر طلحہ کی طرف دیکھا پھر چونک کر مومنہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''مومنہ تم جاؤ۔ تمہیں طلحہ باحفاظت پہنچا دے گا۔'' اس نے ٹرانسمیٹر اٹھا کر جیب میں ڈالا۔

''میرا ابھی آنا مشکل ہو گا۔ بابا سے رابطہ رہتا ہے تم سے بھی انشاءاللہ رہے گا۔ جاؤ مومو!'' اس نے اس کی اٹھنے والی نگاہ کے سوال نظرانداز کرتے ہوئے قطعی لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ اتنا سپاٹ اور تحکم آمیز تھا کہ وہ حیران ہونے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی۔ بس چپ چاپ طلحہ احمد کے ہمراہ ہال نما اس کمرے سے باہر آ گئی۔

کشمیر کا حسن آج بھی ہر آنکھ کو خیرہ کرتا ہے۔ طلوع ہونے والا سورج اس کی تمام تر رعنائیوں کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ اسے پھولوں کی خوشبو، پھلوں کی فراوانی، بہتے جھرنوں کی سبک پائی، پہاڑوں کی بلندی اور سبزے کی لہلہاہٹ سب مل کر ایک طلسمی وادی کا روپ دیتے ہیں۔

علی الصباح کرنل رمیش کشتواڑ کے لئے روانہ ہوا تھا جو ایک فوجی ہوائی اڈا ہے۔ وہ فوجی جیپ کے بجائے اپنی ذاتی گاڑی میں تھا جسے اس کا ڈرائیور بابو ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی فراٹے سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

کرنل رمیش ورماراشٹریہ سیوک سنگھ کا ایک سرگرم رکن تھا۔ اس نے نہتے کشمیریوں پر جس قدر مظالم ڈھائے تھے اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ جب اور جس کو چاہتا وہ اپنی نفرت کا نشانہ بنا ڈالتا۔ اسے سرکار کی طرف سے کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔

وہ مسلمانوں سے جتنی نفرت کرتا ہوگا اس سے کہیں زیادہ حریت پسند اس سے نفرت کرتے تھے۔ عورتوں کی آبروریزی اس کا پسندیدہ مشغلہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا شکار عموماً بھولی بھالی معصوم اور نوخیز کشمیری لڑکیاں ہوتی تھیں۔ وہ جس گھر میں گھستا وہاں موت کا سناٹا پھیل جاتا۔ اس کا شیطانی مکروہ وجود مسلمانوں کے لئے نفرت اور غلاظت انگیز تھا۔

اس وقت وہ اپنے کسی ذاتی کام سے کشتواڑ جا رہا تھا جب گاڑی ہچکولے کھانے لگی۔

''کیا ہوا۔ یہ گاڑی چلا رہے ہو یا جھولا جھلا رہے ہو؟'' اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مکروہ آنکھیں سکیڑ کر ڈرائیور کو گھورا۔

''سرکار۔ گاڑی تو ٹھیک چل رہی ہے پر میرا خیال ہے ٹائروں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟'' ڈرائیور بابو نے گھبرا کر کہا۔ اسی دم گاڑی مکمل رک گئی۔ وہ جلدی سے نیچے اترا اور ٹائروں کو چیک کرنے لگا۔

''بہت برا شگون ہے یہ تو۔ نکلتے سمے تو نے ٹائروں کو چیک نہیں کیا تھا کیا؟'' کرنل رمیش نے کھا جانے والی نظروں سے ٹائروں پر جھکے بابو کو گھورا پھر خود بھی جھنجھلا کر نیچے اتر گیا۔

میرا کوئی دوش نہیں ہے سرکار۔ یہ دیکھیں یہاں کیلیں بچھی ہیں اور اگلے پچھلے دونوں ٹائروں کا بیڑا غرق ہو گیا ہے۔ یہ دیکھیں کتنی بڑی سی کیل ہے۔'' بابو کی نظریں مضبوط نکیلی کیلوں پر پڑیں۔

کرنل رمیش خود بھی جھک کر فرش پر ایک گھٹنا ٹکا کر کیلوں کا معائنہ کرنے لگا پھر آگے گیا تو اس طرح کی کئی اور کیلیں دکھائی دیں۔ ایسا لگ رہا تھا گویا جان بوجھ کر بچھائی گئی ہوں۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''یہ یقیناً کسی راکشس (شیطان) کی شرارت ہے۔ تم آگے جا کر دیکھو ذرا، یہ سلسلہ کہاں تک ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں کیلوں کو دیکھتے ہوئے بولا اور خود جھک کر ٹائر کا معائنہ کرنے لگا پھر ایک کیل اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ اسے اچانک خطرے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے احتیاطاً جیب میں پڑے پسٹل پر ہاتھ رکھ لیا اور بابو کے آنے کا انتظار کرنے لگا جو آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

سامنے درختوں کے لہلہاتے جھنڈ تھے اور مہیب جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ متفکر ہو گیا کہ جنگل سے پیدل گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

"یہ مورکھ کہاں مر گیا؟" ڈرائیور بابو کا انتظار طویل ہونے لگا تو کرنل رمیش کے جبڑے غصے سے بھینچ گئے۔ اس طرح اس کے بھدے نقوش اور بدہئیت دکھائی دینے لگے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے آگے چلنا شروع کر دیا مگر ابھی چند قدموں کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دھپ سے کوئی شے یکدم اس کے قدموں کے پاس گری۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا۔ دوسرے پل اس کی آنکھیں خوف سے لحظہ بھر کو ساکت ہو گئیں۔

اس کے مخنچو سے ڈرائیور بابو لال کی سکڑی سمٹی لاش اس کے قدموں کے پاس پڑی تھی جس سے گرم گرم خون ابل رہا تھا۔ ٹھیک دل پر خنجر گھونپا گیا تھا۔

مارے خوف کے اس کا دل سینے کی دیوار میں سکڑا، پھیلا مگر دوسرے پل وہ تربیت یافتہ فوجی ہونے کے ناتے خطرے کو محسوس کر کے چوکنا ہو گیا اور پسٹل کے ہمراہ جیب سے موبائل بھی نکال لیا مگر اسے پسٹل کی سیفٹی کیچ ہٹانے میں ذرا سی تاخیر ہو گئی تھی۔ ایک سنسناتی گولی اس کے ہاتھوں سے ریوالور اور دوسری گولی موبائل اڑا کر لے گئی۔

نشانہ اس قدر ماہرانہ تھا کہ اس کی انگلی پر ذرا بھی خراش نہ آئی تھی اور دونوں چیزیں اس کی دسترس سے دور ہو گئی تھیں۔

"کہئے کرنل جی! آپ کو تحفہ پسند آیا۔ گو کہ نہایت گھٹیا قسم کا تحفہ ہے مگر پیش کرنے کا انداز بہر حال اتنا برا نہیں ہے کہ آپ کو پسند نہ آیا ہو۔" اچانک ایک کسرتی بدن کا دراز قد نوجوان کرنل رمیش کے سامنے آگیا۔ وہ قریب کے ایک چوڑے تنے کے عقب سے نکلا تھا۔

"کیسا لگا؟" وہ ہلکے سے مسکرایا۔ مگر اس کی سنہری ہیرے کی کنی جیسی آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ان میں ایک سرد سرد سی کیفیت رچی ہوئی تھی۔

"کون ہو تم اور یہ۔ یہ سب کرنے کا مقصد کیا ہے؟" کرنل رمیش نے اپنے خوف پہ قابو پانے کے لئے لہجے کو تحکم آمیز بنانے کی کوشش کی مگر اس کا دل خوف کی دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔

پتا نہیں یہ اس سامنے کھڑے پر اعتماد سراپے کی دہشت تھی یا پیروں میں پڑی بابو لال کی لاش کی یا پھر نہتے ہو جانے کا خوف۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنے ریوالور کو دیکھا جو اس سے چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔

"میں کون ہوں یہ تو تمہیں میں تفصیل سے بتاؤں گا مگر یہ پوچھو کہ میں کیا چاہتا ہوں کرنل اورماجی۔" وہ دو قدم چل کر اس کے اتنے نزدیک آگیا کہ اس کے اور کرنل رمیش کے درمیان بہ مشکل ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک سرد مہری تھی کہ کرنل رمیش کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی کشمیری مجاہد ہے۔

"کیا۔ کیا چاہتے ہو تم؟" وہ اپنی آواز کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"صرف اور صرف تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔" جواباً اس نوجوان کی گرج دار آواز گونجی۔

"مگر کیوں؟" کرنل رمیش کا یہ تعجب اس نوجوان کی رگ رگ میں دوڑتے لہو میں طوفان لے آیا۔ اس کی سنہری آنکھیں دھیرے دھیرے دہکنے لگیں پھر ان میں جیسے لہو تیرنے لگا۔ اس کے جبڑے اندرونی خلفشار سے بھنچ گئے۔ اچانک اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ کرنل رمیش کے منہ پر دے مارا۔ یہ تھپڑ اس قدر طاقت سے مارا گیا تھا کہ کرنل رمیش توازن قائم نہ رکھ سکا۔

"کتے! ہزاروں معصوم بے گناہوں کا قتل کرتے ہوئے تم نے کبھی ان معصوموں سے یہ پوچھا۔ ان کے اس سوال کا جواب دیا۔ ہزاروں بے گناہ پاکیزہ عورتوں کی آبروریزی کرتے ہوئے کبھی ان کی کراہوں، سسکیوں، التجائوں کا جواب دیا۔" وہ زمین پر لڑکھڑا کر گرنے والے کرنل رمیش کے اوپر جھک گیا اور اسے خون آشام نگاہوں سے تکنے لگا۔

کرنل رمیش اپنی پوری وحشیانہ زندگی میں پہلی بار خود کو ایک مسلمان مجاہد کے آگے پسپا خیال کرنے لگا۔

"دیکھو دیکھو۔ تم میری ہتیا کر کے بہت نقصان اٹھائو گے۔ میری زندگی لینے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ الٹا تم مصیبت میں پھنس جائو گے۔" وہ لرزتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ خوف سے اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھیں دہشت سے ابل پڑیں۔

اس مسلمان مجاہد نے اپنے موزے سے ایک تیز دھار چاقو نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی چمکتی دھار کا رخ کیا۔

وہ عالم وحشت میں سن سا رہ گیا۔ اس کے حلق سے آواز نکلنے کی کوشش میں محض کھرکھرا کر رہ گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"یاد کرو شیطان! اپنے تمام جرم۔ اپنے تمام گناہ۔ اپنے وہ تمام کارنامے جن پر تم فخر سے جام لنڈھایا کرتے تھے اور دھرم سیوک کا نعرہ مارا کرتے تھے۔ یاد کرو ابلیس! جب تم نے اس رات ایک ماں کی عزت کی چادر کو تار تار کیا تھا۔ ایک جنت کو پامال کیا تھا۔ میں نے اسی روز قسم کھالی تھی کہ تجھے جہنم رسید نہ کیا تو چین سے نہ بیٹھوں گا۔ تجھے کتے کی موت ماروں گا۔ تیرا مکروہ چہرہ تو میرے دل پر نقش ہے۔ یاد کرو وہ رات وہ گناہوں سے پر رات۔" وہ بالوں سے اس کا سر پکڑ کر کنکریلی زمین پر ٹکرانے لگا۔

کرنل رمیش کے ہونٹوں سے سسکاری نکل گئی۔

"ہا۔" اس نوجوان نے پوری طاقت سے اس کا سر زمین پر دے مارا۔ اس کی دہکتی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی جو کرنل رمیش کو جلا کر بھسم کر رہی تھی۔

"میں غازی شاہ ہوں۔ غازی شاہ۔ جس طرح تو نے میری اور میرے جیسے کتنوں کی جنت اجاڑی ہے دلوں کو کھنڈر کیا ہے' اسی طرح میں تمہیں کھنڈر کر دوں گا۔ ایک ایک درندے کو اجاڑ دوں گا۔ میرا دل برسوں سے ایک آگ میں جل رہا ہے۔ اس آگ کو میں تمہارے ناپاک خون سے بجھائوں گا۔"

"تت۔ تم۔ وہی غازی شاہ ہو جو سری نگر میں۔" کرنل رمیش کی آواز حلق میں سخت نوالے کی طرح پھنس کر رہ گئی۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے اس مجاہد کو دیکھنے لگا جس کی جواں مردی اور دلیری نے بھارتی فوجی درندوں میں ہلچل مچا ڈالی تھی۔ اسے پاکستانی جاسوس کہا جا رہا تھا تو کبھی دہشت گرد کہا جا رہا تھا۔

"ہاں۔ وہی غازی شاہ۔ اللہ کا سپاہی۔ ایک مجاہد جس نے تم بھیڑیوں اور درندوں کو تگنی کا ناچ نچار کھا ہے۔ یاد رکھنا شیطان! تم جیسے ہزاروں بھی مل کر جتنے بھی مظالم ڈھالو۔ اسلام کی آواز کو نہیں دبا سکو گے۔ مظلوم مسلمانوں کے دل سے جذبہ جہاد کو نہ نکال سکو گے۔ یہ کفر کی یلغار' مسلمانوں کے خلاف کفار کی یہ برپا شورشیں ان کے لہو کو اور گرما رہی ہیں۔ تم جذبہ جہاد کو دبا ہی نہیں سکتے اس لئے کہ مسلمانوں کی بقا کا راز ہی اس میں مضمر ہے۔" اس نے چاقو عین اس کے دل کی جگہ پر رکھا۔

"نن۔ نہیں۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ تمہیں بھگوان کی سوگند۔ تمہیں تمہارے اللہ رسول کا واسطہ۔ رک جاؤ مجھے معاف کر دو۔" کرنل رمیش بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ کر اچھلا۔ اس کی ساری شہ زوری اس کی ساری مکاری ہرن ہو چکی تھی۔ وہ خود کو اس مجاہد کے رحم و کرم پر محسوس کر رہا تھا۔

"تم کافروں کے لئے معافی کا کوئی دروازہ ہے ہی نہیں پھر معافی کا کیا سوال۔ تمہارے لئے تو جہنم کی آگ دہک رہی ہے۔" اس کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا۔ دوسرے پل کرنل رمیش کی دلخراش چیخ فضا میں بکھر گئی۔ اس کے سینے سے گاڑھا سیال خون ابلنے لگا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے کھلی آسمان کو تکتی رہ گئیں۔

فضا میں چھایا سکوت بس پل بھر کے لئے منتشر ہوا تھا۔ کرنل رمیش کی لاش اس زمین پر پڑی اپنی بے بسی اور بے وقعتی کو رو رہی تھی جہاں کبھی وہ اکڑ کر چلتا تھا اور کشمیریوں کے بہتے لہو سے ہاتھ دھوتے ہوئے کہتا کہ وہ اپنے گناہ دھو رہا ہے۔ خود کو پوتر کر رہا ہے اور پھر لاش کے سینے پر ٹانگ رکھ کر قہقہے لگاتے ہوئے جام لنڈھاتا تھا۔

غازی شاہ نے اس کی لاش کو نفرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ اگر اسلام میں لاش کی بے حرمتی ناجائز نہ ہوتی تو وہ اس لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو ڈال دیتا۔ اس نے خون آلود چاقو ایک طرف پھینک دیا۔

اس کے دماغ میں کھولن آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور آنکھوں کے سامنے کئی منظر لہرانے لگے۔ اس کے جبڑے باہم بھنچ گئے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رائفل اٹھا کر ایک طرف چل پڑا۔

☆...☆...☆

یہ رات غازی شاہ کے لئے بڑی بھاری تھی۔ اس نے نہ طلحہ احمد سے رابطہ کیا نہ مولوی خضر محمد شاہ سے۔ اتنے برس اس نے جس آگ کو اپنے اندر سلگتا محسوس کیا تھا اس پر چند چھینٹے پڑے تھے آج مگر وہ کیف و مستی میں ڈوبنے کے بجائے ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھا تھا۔ دل کے اندر اداسیوں کا میلا سجا ہوا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے اس شیطان کی موت پر دکھ تھا بلکہ آج انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے ساتھ وہ سارے زخم یاد کر رہا تھا جو روح کو سلگاتے رہتے تھے۔

اس کی سنہری آنکھوں کی زمینیں آہستہ آہستہ بھیگنے لگیں اور یکایک بہت سا پانی یکدم بہہ نکلا۔ ہمیشہ خشک رہنے والی آنکھ ایسی برسی کہ مولوی اور بخت بی بی دیکھ لیتے تو بجائے غمزدہ ہونے کے مسرور ہو اٹھتے۔ انہیں تو برسوں آرزو رہی کہ یہ لڑکا اپنا غم آنسوؤں میں بہا ڈالے۔ دل کی آگ کو یہی آنسوؤں کی بارش تو بجھا سکتی تھی۔ اور آج

اس آگ کو آنسوئوں کی بارش بجھا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیئے اپنی برسوں کی اس تپش اور جلن کو آنسوئوں کی یورش سے بجھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ماضی کی یادوں سے سلگا بھی رہا تھا۔

وہ ماضی کی ایک دل دوز۔ تاریک۔ وحشت ناک اور خونی رات تھی جس نے اس کی دس سالہ ہنستی مسکراتی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیا تھا۔

اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔ ابھی تو "ممی" کی میٹھی گود میں ہمکتا تھا۔ احمد شاہ (پاپا) کے سینے پر چڑھ کر ناچتا تھا۔ ان کے ہمراہ شرارتوں کی بہار سجاتا تھا۔ نیند آتی تو دادی کی لچ لچ کرتی گود میں دبک کر آنکھیں موند لیتا اور خوابوں کے دیس میں پریوں کے سنگ نکل جاتا۔

ممی کی کہانیوں کی پریاں اسے ہر روز خوابوں میں لوری دیتیں۔ وہ آنکھیں بند کئے ایسی وادی میں چلا جاتا جہاں رنگ و نکہت کی بارش ہوتی۔ جہاں حسن کا دریا بہتا' بالکل وادی کشمیر جیسا۔ مگر اچانک جہاں حقیقی وادی میں آگ لگی' وہاں اس کے خوابوں کی وادی میں بھی شعلے بھڑک اٹھے۔ ایک وحشت ناک شور اٹھا اور وہ وادی کی گود سے ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا۔ دادی کے ہاتھ سے تسبیح گر گئی۔ وہ گھبرا کر پوتے کو پکڑنے دوڑیں۔

"غازی۔ غازی بیٹا۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا مگر وہیں جم کر رہ گیا۔

کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی اور تین بندوق بردار اپنی مکروہ صورتوں کے ہمراہ کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک پاپا کو رسی سے باندھ رہا تھا جبکہ ایک شیطان صفت اس کی من موہنی نازک سی ممی کو دبوچے ہوئے تھا۔ ہمیشہ سے آنچل سے ڈھکا رہنے والا ممی کا سر ننگا تھا۔ وہ مقدس آنچل اس شیطان کے پیروں تلے تھا۔

"خدا کے لئے رحم کرو۔ چھوڑ دو مجھے۔" ممی اس کے ناپاک بازوئوں سے نکلنے کو مچل رہی تھی۔ ادھر پاپا بھی پورا زور لگا رہے تھے مگر وہ انہیں باندھ کر رائفل کے بٹ مارنے لگے تھے۔

غازی شاہ اپنے باپ اور ماں کی بے بسی پر تڑپ اٹھا۔ بچہ تھا مگر اس بچے کے اندر ایک مستقبل کے مرد کا دل تھا۔ وہ اپنی طرف سے مدد کے لئے لپکا مگر پیچھے سے دادی نے کھینچ لیا اور خبردار کر کے پردے کے پیچھے چھپا دیا۔ وہ خود بھی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"آج کشمیر کی آزادی کے سپنے دیکھ رہے ہو مور کھو! تم جیسے سوروں کو ایک ایک کر کے نرک میں نہ جھونکا تو میرا نام رمیش ورما نہیں۔ کشمیر پر راج پاٹ کے سپنے دیکھ رہے ہو۔" ایک بڑی مونچھوں اور شیطان صفت چہرے والا اس کے پاپا کے منہ پر طمانچے مارتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا پھر پیچھے ہٹا اور استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

"احمد شاہ! رن بھومی میں ایسا تو ہوتا ہے۔ آزادی کے لئے یہ سب تو قربان کرنا ہی پڑے گا۔" اس نے اپنی ہوس زدہ نظریں جواں سال ممی کے سراپے پر ڈالیں اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مسکرانے لگا پھر یکلخت ہاتھ بڑھا کر اس نے ممی کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

"ایسی سندر۔ مدماتی بیوی ہے تمہاری احمد شاہ!"

"نہیں۔ نہیں خدا کے لئے یہ ظلم مت کرنا۔ بے شک مجھے جو چاہو اذیت دے لو مگر میری عزت کو یوں تار تار نہ کرو۔" پاپا کی چیخیں در و دیوار کو دہلانے لگیں اور ہر طرف قہقہے امڈ پڑے۔

یکدم اذیت آمیز اور کرب ناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے پاپا نے آنکھیں میچ لیں۔

ممی کی دلخراش چیخیں کائنات کی ہر شے کو منتشر کر رہی تھیں۔ دادی تو وہیں پردے کے پیچھے ہی لڑھک کر بے ہوش ہو چکی تھیں۔

پاپا سر پٹخ رہے تھے اور درندے ان کی عزت کی چادر کو تار تار کر رہے تھے۔

پھر جام انڈیلے گئے۔ قہقہوں کی بازگشت تیز ہو گئی مگر ظلم کو دیکھنے والی آنکھیں اور سہنے والے بدن ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ البتہ ایک بدن اور دو آنکھیں اب بھی زندہ تھیں جو ان گھڑیوں کو اس تاریک منظر کو، چنگاریوں کو لہو میں اترتا محسوس کر رہی تھیں۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑا یوں ساکت تھا جیسے اب کبھی نہ ہل پائے گا مگر دوسرے پل اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔

صبح اس گھر میں کہرام بپا تھا۔ دادی نے جانے اسے کس کی گود میں ڈالا اور پھر دل پر ہاتھ رکھ کر خود بھی ایک طرف لڑھک گئیں۔

ممی کا بدن سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے برابر پاپا لیٹے ہوئے تھے۔ جن کے اوپر بھی سفید چادر تھی پھر جب کسی نے دادی کے بدن اور چہرے کو سفید چادر میں ڈھانپنا چاہا تو وہ چیخ اٹھا۔

"ہٹاؤ۔ اسے ہٹاؤ۔" وہ پاپا کے جسم سے چادر کھینچنے لگا۔ اسے یکلخت سفید رنگ سے وحشت ہونے لگی۔ اس کی ہر پیاری ہستی کو سفید چادر میں لپیٹا جا رہا تھا جو اس کے لئے غیر معمولی بات تھی۔

وہ دیوانہ وار ساری چادریں کھینچ ڈالتا کہ کسی نے پیار سے اسے گود میں بھر لیا اور وہاں سے لے جا کر بہلانے لگا مگر بہلانے والا نہیں جانتا تھا کہ اب اس کے لئے کوئی تسلی، کوئی بہلاوا تریاق نہیں بن سکتا۔ اس کی روح میں جو کہرام برپا ہے وہ یوں نہیں تھمے گا۔

اس کی آنکھوں میں جو سناٹا اتر آیا تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ دبیز ہوتا چلا گیا۔

"کبھی تو رو لو غازی! جی کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" بخت بی بی نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ وہ یہی اصرار کرتی رہیں کہ کبھی رو لو۔ انہیں اس کی خشک آنکھوں سے خوف آنے لگتا جس کے پیچھے ایک آتش فشاں پک رہا تھا۔ جیسے ایک سلگتی بھٹی ہو اور اس میں مسلسل لکڑیاں ڈالی جاتی رہی ہوں۔

"روتے وہ ہیں بی بی! جو کچھ نہیں کر سکتے۔ جن کو اپنا غم بہا دینا ہوتا ہے۔ روتے وہ ہیں جنہیں سب کچھ بھلا دینا ہوتا ہے اور میں کچھ بھولنا نہیں چاہتا۔ میرے اندر کی آگ ان آنسوؤں سے نہیں بجھے گی۔ یہ خون سے بجھے گی۔ بھارتی درندوں کے خون سے۔ کرنل رمیش کے خون سے۔" وہ زہریلا کانٹا بن گیا تھا۔

مگر آج اس کی آنکھیں گیلی تھیں۔اس کی سنہری داڑھی نم نم تھی۔اس کے اطراف وہی مانوس خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔اس پائوڈر کی جو اس کی ممی لگایا کرتی تھیں۔وہ ان کے سینے سے لگتا تو جیسے خود بھی معطر ہو جاتا۔

''آئو کہانی سنائوں۔''

''پریوں والی۔'' وہ جھٹ فرمائش کر ڈالتا۔

''دیکھا احمد۔آپ کا بیٹا ابھی سے پریوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔'' ممی کی کھنکتی ہنسی پھیل جاتی۔

''پریاں کیسی ہوتی ہیں پاپا۔'' وہ ممی کو چھوڑ کر پاپا سے لپٹ جاتا۔

''پریاں۔آں۔پریاں۔'' پاپا سوچنے لگتے پھر ان کے لب مسکرانے لگتے اور آنکھیں ممی کے چہرے کا طواف کرنے لگتیں۔

''پریاں بالکل تمہاری ممی جیسی ہوتی ہیں۔ایسی سنہری آنکھوں اور سنہرے بالوں والی۔تمہاری ممی کو بھی تو ہم پرستان سے لے کر آئے ہیں۔اڑتے قالین پر بٹھا کر۔''

وہ ممی کو غور سے دیکھنے لگتا۔اس کے ذہن میں ممی واقعی کسی پری کی طرح اتر آتیں۔دو سنہرے پر لگا کر چمکدار میکسی پہنے ہوئے۔سنہرے بالوں کی لٹیں۔سنہرا تاج۔کاجل سے سجی آنکھیں اور بے حد تیز گلابی ہونٹ۔ یکلخت سب کچھ ٹوٹ گیا۔پری کی چیخیں' اس کی بے بسی اور اس کی آہیں، کراہیں۔سارا تصور دھڑام سے نیچے آ گرا۔کہاں گیا وہ تاج۔وہ لہراتا پروں کے مانند اڑتا آنچل۔بس سفید چادر ہر منظر پر پھیل گئی۔

''غازی۔غازی شاہ۔'' یکدم کوئی اسے جھنجھوڑنے لگا۔اس نے سر اوپر اٹھایا۔

''تت۔تم۔تم رو رہے ہو؟'' وہ طلحہ احمد تھا جو اس کے سر اٹھاتے ہی جیسے بدکا تھا پھر تحیر آمیز بے یقینی سے اس کی سنہری آنکھوں کی زمینوں پر چمکتے شفاف آنسوئوں کو دیکھنے لگا اور فرش پر اس کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم رو رہے ہو غازی؟کیا۔کیا تم نے کرنل رمیش کا سراغ لگا لیا؟'' وہ کچھ سوچ کر پوچھنے لگا اور غازی شاہ کے تیز سرخ ہونٹوں کی تراش میں بڑی دلفریب مسکراہٹ لہرا گئی۔

ایسی مسکراہٹ جو یقینا فاتح جرنیل کے چہرے پر ہوتی ہو گی یا اس شیر کے لبوں پر جب وہ شکاری کو خود شکار کر لیتا ہو گا۔

''نہ صرف سراغ بلکہ اسے جہنم رسید کر کے آیا ہوں۔'' وہ کھڑا ہو گیا جبکہ طلحہ احمد ہکا بکا رہ گیا گویا کسی بٹن سے اسے منجمد کر دیا گیا ہو۔مگر ایسا صرف لمحہ بھر رہا۔دوسرے پل وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگا رنگ جہاں اُمڈ آیا۔وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور غازی شاہ کو بازوئوں میں بھر لیا۔

''کانگریچولیشن غازی شاہ۔کانگریچولیشن!مگر۔کیسے؟کب تم نے یہ کارنامہ سرانجام دے دیا اور اتنی بڑی خوشخبری مجھے آکر کیوں نہیں بتائی۔اوہ میرے خدا۔وہ سیوک دھرم کا نعرہ مارنے والا۔کشمیری مسلمانوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنے والا۔کشمیریوں کو نرک میں جھونکنے کی خواہش رکھنے والا خود نرک کا ایندھن بن گیا۔ہاہا غازی!'' طلحہ احمد پاگلوں کی طرح اچھلنے لگا۔اور غازی شاہ کو ایک بار پھر بازوئوں میں بھینچ لیا۔

"اس خوشی میں مومنہ کو شریک نہیں کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی خوشی کہاں ملی ہے۔ ابھی تو ادھوری خوشی ہے۔ ابھی خواب کہاں پورے ہوئے ہیں۔" وہ اس کے شانے پر سر رکھے دھیرے سے بولا۔ طلحہ احمد کو اپنے کندھے پر نمی کا احساس ہونے لگا۔

خود اس کی سیاہ آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔

"ابھی خوشی کو پایا ہی کہاں ہے۔ ابھی خوشیاں منانے کے دن نہیں آئے ہیں۔" وہ طلحہ احمد سے الگ ہوا۔

☆...☆...☆

ادھر کرنل رمیش ورما کی ہیبت ناک موت پر سرکاری ایوانوں میں گویا زلزلہ آگیا۔ حریت پسندوں کے بڑے بڑے لیڈر ہٹ لسٹ پر آنے لگے۔ غازی شاہ نے پھر ہلچل مچا کر رکھ دی تھی۔

کرنل رمیش کوئی معمولی سپاہی نہ تھا۔ سرکار کا خاص منظورِ نظر اور پر جوش ذمے دار کرنل تھا۔ اس کی ایسی بے بس موت کیسے کہرام نہ مچاتی جبکہ کشمیری مسلمانوں میں گویا زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر زبان اس عظیم کارنامہ انجام دینے والے کو دعائیں دے رہی تھی۔

مولوی خضر محمد مسلسل غازی شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر رابطہ نہ ہو پا رہا تھا۔ آخر طلحہ سے بات ہو گئی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کہاں ہے وہ لڑکا؟ اس سے کہو وہ اتنی بڑی خوشی کی خبر لے کر میرے پاس کیوں نہیں آیا؟" ان کی آواز مسرت سے مغلوب ہو کر لرزنے لگی۔

طلحہ احمد نے ایک لمحہ توقف کے بعد گہری سانس بھری۔ "وہ ابھی اپنی خوشی مکمل نہیں سمجھ رہا مولوی جی! میں اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے ہی والا ہوں۔ بس ذرا حالات بہتر ہو جائیں۔ میرا خیال ہے ابھی بہت شور اٹھا ہوا ہے۔ بھارتی فوجی درندے سڑکوں پر نفرت اور غصے میں بلبلاتے پھر رہے ہیں۔ ہر شخص پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی ہے۔"

"ہاں۔ مجھے اس کا خیال ہے مگر اس لڑکے سے کہو۔ کوئی رابطہ تو کرے۔"

"اس نے تو کسی سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ مجھے بھی۔ اس نے نہیں بتایا تھا بس میں ہی اسے کھوجتا' اس تک پہنچ گیا۔ وہ بہت اداس ہے مولوی جی! برسوں کی آگ کو بجھایا بھی ہے اور سلگایا بھی ہے۔ رنج اور خوشی نے اس کے اندر ایک طوفان اٹھایا ہوا ہے۔ آپ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کے متمنی تھے نا۔ تو وہ میں نے دیکھے ہیں۔ وہ بہت رویا ہے مولوی صاحب! بہت رویا ہے۔ اب ایک دن کھل کر ہنسے گا بھی۔"

"انشاءاللہ وہ دن ضرور آئے گا جب ہر کشمیری کے لبوں پر مسکراہٹوں کے جگنو چمکیں گے۔" مولوی خضر محمد کی آواز آنسوؤں کی یورش سے بھاری ہو گئی۔

"اسے لے آؤ طلحہ! میرے پاس لے آؤ یا مجھے اس کے پاس۔"

"جی بہتر۔ جونہی موقع ملا ہم حاضر ہو جائیں گے۔" دوسری طرف طلحہ احمد نے رابطہ منقطع کر دیا۔

مولوی خضر محمد نے چھوٹے سے ٹرانسمیٹر کا اپریٹس پش کر دیا پھر آستین سے آنکھیں پونچھنے لگے۔ مومنہ نے ان کے کندھے پر اپنا سر ٹکا لیا۔

"کتنے دن ہو گئے نا بابا! اس نے ہم سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتا۔" اس کے لہجے میں بے چارگی آمیز شکوہ تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی تڑپ مچی ہوئی تھی غازی شاہ سے ملنے کی۔ اس دن کے بعد سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔

"وہ آئے گا تو میں اس سے خوب جھگڑا کروں گی۔"

مولوی صاحب ہنس پڑے۔ وہ اس لمحے سرجن نہیں بلکہ معصوم سی سکول گرل دکھائی دے رہی تھی۔

"ارے پگلی۔ اس نے اپنے آپ کو جہاد کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی شکایتوں اور شکوئوں پر ہنستا ہے۔ ہاں مگر تم اس سے شکوہ ضرور کرنا۔ وہ تمہاری بات ضرور سنے گا۔ تمہارے شکوے کو اہمیت دے گا۔"

انہوں نے بہت سادے سے انداز میں کہا مگر جانے کیوں مومنہ کا دل معمول سے ہٹ کر بڑے مختلف انداز میں دھڑکا۔ لہو میں تندی سی آ گئی۔ اس کی خوشنما پلکیں ایک انوکھے احساس سے بھاری ہو کر آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گئیں۔

یہ بڑا انوکھا سا تجربہ تھا خود اس کے لئے۔ یوں بے اختیار ہو کر دل کا دھڑک جانا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ خود بھی نہ سمجھ پائی کہ یہ یکایک عام سے جملے نے اس کے اندر ایسی ہلچل کیوں مچا دی کہ وہ بنیادوں تک سے ہل کر رہ گئی۔

وہ مولوی خضر محمد کے پاس سے آہستگی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔

☆...☆...☆

ماتا جی کویتا کو جھنجھوڑ کر اٹھا رہی تھیں مگر وہ کسلمندی سے پڑی رہی۔ بس آنکھیں کھول دیں۔

"اوں۔ کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ ہسپتال نہیں جانا کیا۔ اٹھ۔" بے نور چہرے والی ماتا جی اس کے بدن سے چادر کھینچتے ہوئے سخت اکتائی اور بے زار سی دکھائی دے رہی تھیں۔

"من نہیں ہے آج میرا جانے کا؟" اس نے کروٹ بدل لی۔

"میں کہتی ہوں اٹھ کوی۔ ہسپتال نہیں جاتی تو نہ جا پر مندر چلنا ہے آج تجھے میرے ساتھ۔ ہر روز بہانے سن سن کر تنگ آ گئی ہوں۔ شرم نہیں آتی۔ بھگوان سے منہ موڑے بیٹھی ہے۔ دیکھ کویتا اٹھ۔ اری آنند تو اسی در پر جانے سے ملے گا آتما کو۔ چل۔ اتنی شبھ گھڑی ہے نیستی نہ پھیلا۔" ماتا جی بولتے ہوئے کمرے میں بکھری چیزیں بھی اٹھا اٹھا کر قرینے سے لگاتی جا رہی تھیں۔

کویتا نے سخت بے زاری کے عالم میں بدن سے چادر نوچ کر پھینکی اور اپنے سیاہ بکھرے بالوں کے ریشمی لچھوں کو پکڑ کر جوڑے کی شکل دینے لگی۔

"کتنی بار کہا ہے سحر کے وقت ایک چکر لگا آیا کر مندر کا۔ آشا روز پوچھتی ہے کہ کویتا نے پوجا کے لئے مندر آنا کیوں چھوڑ رکھا ہے۔"

"مندر۔ مندر۔ پوجا۔ تنگ آگئی ہوں میں روز ایک ہی چخ چخ سے۔" وہ بھنا کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

"آپ پرارتھنا کرآتی ہیں۔ بہت نہیں ہے کیا؟ مجھے وشواس نہیں ہے کسی بھگوان پر۔" وہ دھم دھم کرتی غسل خانے میں جا گھسی۔

ماتا جی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہ گئیں۔ پھر اپنے گال پیٹنے لگیں۔

"ارے کم بخت ماری۔ تو نے بھگوان کا اپمان کر ڈالا۔ اری شرم کر۔ بے شرم۔ چار جماعتیں پڑھ کر خود کو کیا سمجھ بیٹھی ہے۔ ٹھیک ہی کیا ہے پرکاش نے جو یہاں آنا چھوڑ رکھا ہے۔"

"اونہہ۔ میں کب چاہتی تھی وہ یہاں آئے۔" وہ تولیہ پھینک کر باورچی خانے میں چلی آئی مگر جیسے ہی ہنڈیا کا ڈھکن اٹھایا۔ بھاجی (سبزی) دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کبھی تو گوشت پکالیا کرو ماں!" اس نے منہ نکال کر باورچی خانے سے باہر جھانکا۔ "تنگ آگئی ہوں میں تو ان بھاجیوں سے۔ آخر جانور انسانوں کے لئے ہی ہیں نا؟"

"کویتا۔ کویتا۔ مت من جلا میرا۔ میں تو تیرے انت (انجام) سے ڈرنے لگی ہوں۔ جانے کیا ہوگا تیرے ساتھ اس بھومی میں بھی اور۔ اگلے جنم میں۔"

"ہر منش کے انت کا ایک دن اس کے بھاگ میں لکھا جا چکا ہے۔ آپ کو چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ باورچی خانے سے باہر آگئی اور اسی بگڑے موڈ کے ساتھ کپڑے بدل کر ہسپتال چلی آئی حالانکہ

آج اس کا ہسپتال جانے کا قطعی موڈ نہیں تھا مگر ماتا جی سے خواہ مخواہ کی چخ چخ سے بچنے کے لئے وہ چلی آئی۔

بقول ماتا جی کہ "تیری تو آتما سے آنند خارج ہو گیا ہے۔"

شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ اس کی بے چین آتما کو قرار نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ اضطراب یہ بے سکونی اس کے جیون میں کیسے اور کب داخل ہو گئی تھی۔

شاید چند برسوں سے یا پھر جب شعور سنبھالا تھا یا اس سے بھی پہلے۔ جنم لینے سے بھی پہلے۔ وہ خود اپنی اس کیفیت کو کبھی نہ سمجھ پائی تھی۔

ماتا جی کہتیں مندر جا کر آنند ملتا ہے۔ پوجا میں بڑی چاشنی ہے۔ وہ مندر بھی گئی اچھے بھگتوں کی طرح دیوتاؤں کا پرساد بھی لیا مگر آنند کہاں۔ کہاں ملا آنند؟ کب ملی اس کی بے چین آتما کو راحت؟ اسے تو جانے کیوں بچپن سے ہی یہ سب ایک مذاق لگتا تھا۔

اب تو کائنات کی ہر شے سے ہی اس کا دل اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ پر کاش اس کے بچپن کا ساتھی جو نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے تک اسے کائنات کی ہر شے سے عزیز لگتا تھا۔ اس کی باتیں وہ سن کر ہنستی تھی اس کے ساتھ بائیک پر گھومنا، سینما جانا اچھا لگتا تھا مگر پھر یکایک وہ غیر محسوس طور پر اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ جس طرح مندر سے، بھگوانوں سے پھر ہر شے سے۔ شاید اس بھومی میں شانتی اور سکھ ہے ہی نہیں یا پھر اس کے اپنے من میں اتنا اندھیارا ہے کہ کہیں کوئی روشنی کی کرن پھوٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

اس نے سخت بے دلی کے عالم میں کندھے پر جھولتا چرمی بیگ کرسی پر پھینکا۔ مومنہ اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"تم تو آج نہیں آنے والی تھیں۔ خیریت۔ کیا سر نے تمہاری لیو ایکسیپٹ نہیں کی؟"

"رات تک تو موڈ آنے کا بالکل نہیں تھا مگر سویرے موڈ بن گیا۔" اس نے خود کو کرسی پر گرالیا۔

"کیا بات ہے کوی! پریشان لگ رہی ہو۔" مومنہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا کویتا؟"

کویتا نے اپنی سیاہ آنکھیں اٹھائیں پھر ہلکی مسکان کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم چنتا مت کرو۔ میری تو صورت ہی ایسی منحوس ہے کہ۔"

"کویتا! بکواس بند کرو اور مجھے تم بالکل ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ کیا ماتا جی سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟" مومنہ نے اس کو کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ اسی پل سریش اندر داخل ہوا۔ اس کی کیجولٹی سے کال آگئی تو وہ کویتا کو وہیں بیٹھا رہنے کی تاکید کر کے کمرے سے نکل گئی۔

جب وہ کیجولٹی سے لوٹی تو چائے کا وقت تھا مگر کویتا وہاں موجود نہیں تھی۔

"آیئے آیئے ڈاکٹر مومنہ! ہمارے ساتھ شیئر کیجئے۔" ڈاکٹر سنیل اسے دیکھتے ہی خوشگواری سے اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کے سواگت کو۔

"نو۔ تھینکس۔ میں چائے پی چکی ہوں۔ آپ پلیز پیجئے۔" اس نے مسکرا کر معذرت کرلی۔

"اب ایسے مایوس تو نہ کریں۔ چائے نہ سہی بسکٹ ہی لیجئے۔ یہ خصوصی میرے جیب خرچ سے خریدے گئے ہیں۔" وہ شرارت سے بولا تو دوسری ساری ڈاکٹرز ہنسنے لگیں۔

"ہاں ہاں مومنہ! ڈاکٹر سنیل بے چارے اتنے پیار سے کہہ رہے ہیں اور ان فیکٹ۔ یہ خریدے ہی تمہارے لئے گئے ہیں۔ ہمیں تو یہ مجبوراً کھلا رہے ہیں۔" ڈاکٹر لتا بڑی شرارتی اور بذلہ سنج تھی۔ اکثر مومنہ کو چھیڑا کرتی تھی۔

مومنہ جھینپ کر رہ گئی۔

"پھر کبھی آپ کی اس خاطر کا سواد اٹھاؤں گی۔ اس وقت میں کچھ جلدی میں ہوں۔" وہ کہتی سرعت سے کمرے سے نکل بھاگی۔

کویتا اسے لان کے ایک گوشے میں بیٹھی مل گئی۔

"بدتمیز لڑکی! یہ کون سا وقت ہے باغ میں بیٹھنے کا۔ میں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئی اور محترمہ یہاں استراحت فرما رہی ہیں۔" اس نے اپنا بیگ اس کے سر پر ہلکے سے مارا۔

کبھی بستیاں بن، کبھی کوہ ودمن
رہا کتنے دنوں، یہ جی کا چلن
جہاں حسن ملا وہاں بیٹھ رہے
جہاں پیار ملا وہاں صاد کیا

وہ چنبیلی کی ڈالی توڑ کے ہولے سے گنگنائی۔

"اوہو۔ تو شاعرانہ مزاج ہو رہا ہے جناب کا؟"

"پتا نہیں کون سا مزاج ہو رہا ہے۔ میں خود نہیں سمجھ پائی ابھی تک۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"کوی!" مومنہ نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"اتنی ڈپریس کیوں ہو رہی ہو۔ پرکاش سے جھگڑا وگڑا تو نہیں ہو گیا؟"

"اس سے دوستی ہی کب تھی۔" وہ کپڑے جھاڑتی کھڑی ہو گئی۔ اس کی ہنسی بڑی عجیب تھی جیسے خالی برتن میں بہت سے پتھر لڑھکا دیئے ہوں۔

مومنہ نے اس کا ہاتھ کھینچا اور اسے دوبارہ گھاس کے فرش پر بٹھا دیا۔

"اس قدر اداس تو تم کبھی نہیں لگیں کویتا۔ کیا مجھے نہیں بتاؤ گی۔ مجھ سے شیئر نہیں کرو گی؟" وہ اس کے چہرے کے آگے جھکی اپنائیت آمیز محبت سے بولی تو کویتا اپنے ہونٹوں کو اضطرابی انداز میں دبا کر رہ گئی۔

"اچھا چلو۔ ایسا کرتے ہیں آؤٹنگ پر چلتے ہیں۔ کھلی تازہ ہوا میں۔" وہ دلدارانہ انداز میں کہتی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ گئی اور پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی۔ مگر کویتا نے کسی پارک میں جانے یا آئس کریم بار جانے سے منع کر دیا اور اس کے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی مگر کچھ اس انداز سے کہ مومنہ تحیر اور رنج سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"مومنہ! پتا نہیں مجھے تمہارے گھر میں قدم رکھنا بھی چاہئے یا نہیں مگر میری بڑی آرزو ہے بخت بی بی اور مولوی جی سے ملنے کی۔ کیا میں اس قابل ہوں کہ۔"

اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کی خوش نما آنکھوں میں ایک اداسی ہلکورے لیتی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے مومنہ پر نظر ڈال کر پلکوں کی لرزتی باڑھ جھکالی۔

"مولوی صاحب کا گھر کوئی عام سا گھر تو نہیں ہو گا نا۔ تمہاری تربیت میں انہی کا رنگ ہے نا مومو! وہ خود کتنے عظیم۔ کتنے معتبر ہوں گے اور میں ایک پاپی ہوں۔ میرے قدم ناپاک ہیں۔ نہیں۔ نہیں مومنہ رہنے دو۔ ہاں مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ میں نے تو بس یونہی کہہ دیا۔" اس نے یکدم گھبرا کر سٹیئرنگ وہیل پر رکھے مومنہ کے نرم ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ایک مسلمان کے گھر ہندو کے قدم وہ بھی شودر ہندو کے۔"

"کویتا! گاڈ سیک۔" چپ ہو جاؤ اس سے زیادہ فضول بکواس اور کیا ہو سکتی ہے۔" مومنہ انتہائی کرب اور دکھ سے چلائی۔ اس کے چہرے کو ایک تکلیف دہ رنگ چھو گیا تھا۔

کویتا کا ذہنی اضطراب' اس کے دل کی پراگندگی' اسے حیرت کے ساتھ دکھی کر گئی۔

اس نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر ہلکی سی سانس بھری اور نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"اسلام میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد بڑا درجہ انسانوں سے پیار کرنا ہے۔ یہ طبقاتی تقسیم ہماری اپنی بنائی ہوئی ہے۔ بابا اور بی بی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ یقین کرو کوی! بی بی تو میرے منہ سے تمہارا اتنا ذکر سنتی ہیں کہ اکثر مجھ سے کہتی ہیں کہ کویتا کو کسی دن لے آؤ گھر؟" اس نے کویتا کی حیرت سے اٹھنے والی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یقین دلایا۔ گاڑی مولوی خضر محمد کے گھر کے سامنے رک گئی تو کویتا کے دل کے اندر عجیب سا نامانوس احساس بکھر گیا۔ اس کے سینے کی دیواروں پر نادیدہ سا بوجھ ہمکنے لگا۔

اس نے بے اختیار مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر لرزتا قدم اس دہلیز پر رکھا۔

مومنہ کو پہلی بار اس کی کیفیت نے یہ احساس دلایا کہ کویتا ڈاکٹر بننے کے باوجود خود کو کس قدر کم مایہ اور بے حیثیت سمجھتی ہے۔

شاید یہ ان کی ذات پات اور طبقاتی تقسیم کا اثر تھا جس نے انسانوں کو اتنے طبقوں اور درجوں میں منقسم کر کے رکھ دیا تھا۔ برہمن۔ شودر۔ کھتری اور اسی طرح کی درجہ بندی از خود کر کے کتنوں کو برتری کے احساس اور کتنوں کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر رکھا تھا مگر المیہ کمتری کے احساس میں جکڑے ہوؤں کا تھا جو بدترین ذہنی اذیت میں زندگی گزار رہے تھے بلکہ زندگی انہیں گزار رہی تھی۔

"بی بی! دیکھیں ذرا کون آیا ہے؟" مومنہ نے کویتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بخت بی بی کے سامنے کر دیا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر جانماز پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں۔

"بوجھیں تو جانیں۔" ان کے سر اٹھانے پر وہ شرارت سے ہنسی۔

"ارے شریر مجھے پہیلیاں بجھوائے گی۔ یہ تو کویتا ہے۔ اسے نہ پہچانوں گی کیا؟" بخت بی بی کے پرنور چہرے پر شفیق سی مسکراہٹ کی چاندنی پھیل گئی۔ وہ اٹھیں اور پرتپاک انداز میں کویتا کو بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"ارے بی بی! کمال ہو گیا۔ آپ نے کیسے پہچان لیا۔ اتنے برسوں بعد۔" مومنہ مصنوعی حیرت سے چلائی۔ پھر کھلکھلا دی اور بی بی کی بانہوں کے حصار میں کھڑی کویتا کا سرخ سرخ چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں نے کہا تھا نا بی بی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔"

"ارے لڑکیو! تم لوگوں نے اطلاع ہی کر دی ہوتی تو میں کچھ چیزیں پکا لیتی۔ اچھا اب بیٹھو بس ذرا یہ تسبیح پوری کر کے تم شریروں سے نمٹتی ہوں۔ کویتا بیٹی! یہ سخت نامعقول لڑکی ہے۔ غازی شاہ کی طرح اسے بھی ہر وقت سرپرائز۔ وہ کیا کہتے ہیں ہاں بس وہی دینے کا شوق ہے۔" بی بی مومنہ کو پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ دیکھنے لگیں۔

غازی شاہ کے نام پر ایک لحظہ مومنہ کے دل پر وہی مانوس سی دھند چھا گئی۔ دو سنہری آنکھوں کا رنگ دل کے ساحل پر پھیلا اور سکڑ گیا۔

"تم بیٹھو کوی۔ میں پہلے ظہر کی نماز پڑھ لوں۔ بابا کہتے ہیں کہ نماز ترک کرنے والا اللہ سے تعلقات قطع کرتا ہے اور اللہ سے تعلق نہ رہے تو پھر ایک مسلمان کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔" وہ اسے تخت پر بیٹھنے کو کہہ کر اندر کی طرف بھاگ لی۔

"کتنی اچھی باتیں بتاتے ہیں تمہارے بابا۔ خوش نصیب ہو مومنہ طارق! کہ تمہاری پرورش ایسی ہستیوں نے کی ہے۔"

وہ تخت پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی اور بخت بی بی کو دیکھنے لگی جن کا چہرہ سفید براق چادر کے ہالے میں کوئی نورانی سی شے محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن کی سکرین پر ماتا جی کا چہرہ ابھر آیا۔ بے نور۔ پھیکا۔ ہر دم ملول رہنے والا جیسے بے آب و گیاہ صحرا۔

مولوی خضر محمد شاید کسی قریبی مسجد میں نماز پڑھ کر آئے تھے۔ ان سے مل کر کویتا کا وہ سارا خوف، بے نام سے اندیشے رفع ہو گئے۔ اونچے لمبے۔ سرخ و سپید چہرے اور سفید لمبی داڑھی والے مولوی خضر محمد بارعب شخصیت کے ساتھ انتہائی شفیق، وضع دار اور باوقار دکھائی دے رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر ٹھنڈے بادل کا احساس ہونے لگے۔ کسی میٹھے چشمے کا تاثر ابھر آئے۔ آنکھیں اور دل خود بخود احترام کرنے لگے۔ ایسے چہرے کویتا نے شاید اپنی زندگی میں آج تک نہیں دیکھے تھے۔ اسے بے اختیار مومنہ پر رشک آیا جو ایسی محبت کرنے والی ہستیوں کے درمیان حیات گزار رہی تھی۔ ان کی گفتگو میں بہت ٹھہراؤ تھا۔ لہجے میں لوچ تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو کویتا کو سائبان کا احساس ہونے لگا۔ اس کے اندر کی محرومیاں چیخنے لگیں۔ وہ خوش ہوتے ہوتے اندر سے جیسے یکدم خالی ہو جانے کے احساس کے ساتھ غمگیں ہو گئی۔

"بڑا ذکر کرتی رہتی ہے مومنہ تمہارا۔ یوں سمجھو۔ ہسپتال سے آ کر تمہاری باتیں کئے بغیر اس لڑکی کے حلق سے کھانا نہیں اترتا۔"

وہ حیران رہ گئی۔ مومنہ کو دیکھا جو بی بی سے لگی اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں اتنی محبت کے کہاں قابل ہوں؟" بے ساختہ ہی لبوں سے پھسل پڑا۔

اس کے جملے پر مومنہ کے دل میں اداسی پھیل گئی۔ مولوی خضر محمد نے پہلی بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ مومنہ کی ہم عمر تھی۔ معصوم اور سادہ چہرے والی یہ بچی انہیں قلبی طور پر مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔اس کی کالی خوش نما آنکھوں میں کچھ پالینے کی خواہش مگر کچھ نہ پاسکنے اور لاحاصلی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔

”محبت حاصل کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔وہ اپنے پیدا ہونے سے بڑے ہونے تک اپنے اطراف لوگوں سے مختلف رشتوں، ناتوں سے پیار وصول کرتا رہتا ہے۔یہاں قابل یا ناقابل کا کیا سوال؟“ مولوی صاحب نے نرماہٹ بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے سرزنش کی۔

”چور۔لٹیرے۔ڈاکو سب ہی اپنے اپنے حصے کی خوشیاں اور محبتیں وصول کرتے ہیں۔تم تو بہت معصوم۔ پاکیزہ اور چھوٹی بچی ہو۔تمہارا دامن تو ابھی خوشیاں اور محبتیں سمیٹنے کے لئے پھیلا ہونا چاہیئے۔“

”اسے سمجھایئے بابا! ایسی ہی فضول باتیں سوچتی رہتی ہے۔میں زبردستی اسے پکڑ کر لائی ہوں یہاں۔“ مومنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تخت پر آکر بیٹھ گئی۔

”ارے نہیں۔یہ یونہی بول رہی ہے۔“ کویتا پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی۔

”کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ ایک ہندو شودر کو مسلمانوں کے گھر نہیں آنا چاہیئے۔“ مومنہ نے اسے گھورا۔

”بات یہ نہیں ہے۔“ کویتا کے چہرے پر سنجیدگی آمیز کرب سمٹ آیا۔

”یہاں کشمیر میں جو حالات ہیں اس نے یقیناً مسلمانوں کو ہندوؤں سے بددل کر دیا ہوگا۔بھارت راج پاٹ کشمیری مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھے ہوئے ہے وہ دوسرے ہندوؤں کی نظر میں جائز ہو یا ناجائز

مگر میری نظر میں یہ ایک ظالمانہ فعل ہے۔میں اسی کارن یہاں نہیں آنا چاہ رہی تھی کہ شاید آپ کو نہ بھائے۔ یوں بھی میں بڑی پاپن ہوں۔ماتاجی کہتی ہیں تیرا انت (انجام) بڑا برا ہوگا۔تو بھگوان کا اپمان کرتی رہتی ہے پر میں کیا کروں مولوی جی! میں جان کر تو ایسا نہیں کرتی۔بس پتا نہیں کیوں مجھے ان پر وشواس نہیں رہا۔سوانگ لگتا ہے یہ سارا کچھ۔پر کاش بھی میری ان باتوں سے مجھ سے دور چلا گیا۔میرے اندر سے شانتی نکل گئی ہے مولوی جی! ماتاجی ٹھیک ہی کہتی ہیں شاید۔میں پاپن ہوں اور پاپی کی ناؤ منجدھار میں ڈوبتی ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔اس نے سر جھکا لیا۔بخت بی بی نے پیار سے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

”ایسا نہیں کہتے۔ہو جاتا ہے کبھی کبھی‘ انسان یونہی بے سبب اداس اور بے کل۔اسے ہر شے بے کار اور بری لگنے لگتی ہے۔مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔“

مولوی خضر محمد سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔انہیں کویتا کی یہ کیفیت عارضی ناراضی، مایوسی یا وقتی ناامیدی کی نہیں لگی بلکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس لڑکی کو ”سچائی“ کی تلاش ہے۔اس کی آتما سکون کی متلاشی ہے۔ایسا سکون اور طمانیت بھان متی، سوانگ میں ہرگز نہیں مل سکتا تھا۔

انہوں نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس سینے میں کھینچی۔

”زندگی میں حقیقت بھی ہے اور ناٹک بھی۔بس حقیقت کو پہچاننے والی آنکھ موجود ہونی چاہیئے۔حقیقت اور جھوٹ میں فرق صرف نقطہ نظر کا ہوتا ہے اور تم ایک پڑھی لکھی۔ سمجھدار لڑکی ہو۔اپنے اندر کو ٹٹول سکتی ہو۔تبدیلی کو محسوس کر سکتی ہو۔اپنے ضمیر پر پڑے اس بوجھ کو تم درحقیقت شدت سے محسوس کر رہی ہو۔

تمہیں ''راستی'' کی تلاش ہے۔ تمہارے اطراف کا ماحول تمہارے ضمیر پر بوجھ کی طرح لدا ہوا ہے اور یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے کہ تمہارے پاس سچائی کی روشنی اور بدی کی تاریکی میں فرق محسوس کرنے والی آنکھ ہے۔

''جس طرح خوبصورتی ہمارے اندر ہوتی ہے اسی طرح سچائی بھی ہمارے اندر فطرت نے ودیعت کی ہے۔ بس اسے ڈھونڈنے کی، تلاشنے کی ضرورت ہے اور صد شکر کہ تمہارے پاس حق آشنا ایک قوت ہے۔'' مولوی خضر محمد اپنے حلیمی لب ولہجے میں کویتا کے دل کو گویا جھنجھوڑ رہے تھے۔

''تم اپنے ماحول سے بے زار نہیں ہو بلکہ اس بدی سے۔ مکر وفریب اور جھوٹ سے بے زار ہو جو تمہارے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ بیٹی! خدا کو جب کسی کو سچائی کا راستہ دکھانا مقصود ہوتا ہے تو اس کی روح میں ایک اضطراب برپا کر دیتا ہے۔ اسے تاریکی کا ادراک ہونے لگتا ہے اور روشنی کی تلاش میں وہ سرگرداں ہو جاتا ہے۔ تمہارے اندر وہ دریچہ کھلنا چاہتا ہے جس سے آگہی کا سورج چمکتا دکھائی دے۔''

کویتا دم سادھے مولوی صاحب کے منہ سے نکلنے والے لفظوں کا قطرہ قطرہ پیتے ہوئے ایک عجیب لذت، ایک انوکھی چاشنی روح میں سرایت کرتی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے وجود میں عجیب ٹھنڈی لہریں دوڑنے لگیں۔ اسے لگا مولوی صاحب اس کے اندر جھانک رہے ہوں۔ ان کا لفظ لفظ اسے اپنے اضطراب کا ترجمان لگا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی چمکیلا سیال جسم میں ایسے سرایت کر رہا ہو جیسے صحراؤں میں ٹھنڈی پھوار' جیسے

روح کے ویرانے میں بادوباراں کے جھکڑ۔ مگر یکدم اس کی آنکھوں میں جمی دکھ کی کائی دبیز ہونے لگی۔ اس کی روح کا اضطراب پہلے سے کہیں اور زیادہ بڑھ گیا۔

''ہاں۔ میرے اندر بہت اندھیارا ہے مولوی جی۔ اتنا اندھیارا کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایک سیاہ تاریک جنگل۔ ایک ہولناک خلا اور خلا کے اندر گھور تاریکی۔''

اس کی آواز ایسے ابھری جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔

''میرے من کے اندر بہت گرد ہے مولوی جی! یہ بھلا کیسے صاف ہو گی۔ نہیں۔ نہیں مولوی جی۔ میری روح کی گرد جھاڑنا چاہیں گے آپ تو خود پورے اٹ جائیں گے۔ مگر یہ تو وراثتی گرد ہے۔ یہ تو پیدائشی اندھیرا ہے یہ کیسے چھٹے گا؟'' وہ ایک جھٹکے سے تخت سے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اس کی آنکھوں میں بجھے دیے کا سا دھواں پھیلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''مولوی جی۔'' وہ اچانک مولوی خضر محمد کے قدموں میں جھک گئی۔

''ساحل کی تمنا وہ شخص کیسے کر سکتا ہے جو سمندر کے بیچ تند موجوں میں گھرا ہوا اور چاروں طرف بھنور کے دائرے ہوں۔ آپ۔ آپ مجھے روشنی دکھا رہے ہیں مولوی جی مگر آپ کو کیا خبر کہ میں جہاں ہوں وہاں تاریکی بھوت کی طرح مسلط ہے میرے جسم وروح پر'' وہ شدت کرب سے اپنے باریک خوش نما لب دانتوں سے کچل رہی تھی۔

"باریک سے باریک روشنی دبیز سے دبیز تاریکی کا سینہ چیر دیتی ہے۔ گھپ اندھیرے میں اک ذرا سا دریچہ وا کر کے دیکھو۔ روشنی کی باریک لکیر کمرے میں بکھرے اندھیرے کا دم توڑ دیتی ہے۔" مولوی خضر محمد کا لہجہ تسلی آمیز تھا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ہٹا لیا۔

وہ اچانک اٹھی اور پلٹ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔ مومنہ نے جو ایک طرف گم صم عجیب سے احساسات سے دوچار بیٹھی تھی اس کے یوں بھاگنے پر اس کے پیچھے جانا چاہا تو مولوی صاحب نے اسے روک دیا۔

"اسے جانے دو۔ اس کا اس وقت چلے جانا ہی بہتر ہے بیٹی!"

"مگر بابا!" اس نے الجھ کر مولوی صاحب کو دیکھا جو سر کو ہلکی سی اثباتی جنبش دے کر بولے۔

"ہاں۔ اس کا جانا ہی بہتر ہے ابھی۔ اس کے اندر جو دریچہ کھلنا چاہتا ہے جو روشنی پھوٹ رہی ہے اس کا سہارنا اسے بہت مشکل ہوگا کیونکہ اس کی روح کے دریچے سے جو روشنی اندر آنا چاہ رہی ہے وہ کوئی عام سی فانی روشنی نہیں ہے بلکہ ایمان کی روشنی ہے۔"

بخت بی بی اور مومنہ نے بیک وقت چونک کر پھر قدرے بے یقینی سے مولوی صاب کے چہرے کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئیں۔

"تو۔ تو کیا کوئی۔ مسلمان ہونا چاہتی ہے؟" مومنہ کو خود اپنی آواز بہت نئی نئی سی لگی جبکہ اس کی خوش نما آنکھوں میں ایک انوکھی خوشی کے دیپ جلنے لگے تھے۔ مولوی صاحب اس پر ایک نگاہ ڈال کر رہ گئے۔ کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بہت سی باتوں کے جواب وقت کے پاس ہوتے ہیں اور مولوی خضر محمد بھی وقت کے منہ سے ہی سننا چاہ رہے تھے جوان کا دل گواہی دے رہا تھا۔

☆...☆...☆

دوسرے دن مومنہ ہسپتال آئی تو پتا چلا کو یتا نہیں آئی۔ اس نے سوچا واپسی پر وہ اس کے گھر جائے گی مگر کچھ سوچ کر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور طارق ہاؤس کے بجائے مولوی صاحب کے یہاں چلی آئی۔

"اخاہ۔ خیرت تو ہے بی بی! کون مہمان آرہے ہیں جو اتنی خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں؟" وہ باورچی خانے میں بی بی کو بڑے جوش و خروش سے مصروفِ عمل دیکھ کر چونکی۔

"غازی شاہ آیا ہوا ہے۔" بخت بی بی نے بغیر پلٹے اپنے کام میں منہمک رہتے ہوئے ہی اسے جواب سے نوازا اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

اسے لگا بی بی نے بڑے زور سے اس کے دل کے ساز پر مضراب مار دیا ہو۔ ہر تار ہی جھنجھنانے لگا اور ایک مدھر موسیقی رگ رگ میں بجنے لگی۔

”ملو گی نہیں اس سے؟“ بی بی اسے خاموش دیکھ کر پلٹیں۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر یونہی جھانکا۔

”اتنا سارا کچھ اس کے آنے پر کرتی ہیں آپ؟ مگر اسے کون سا احساس ہے آپ کا۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہے اور جھونکے کی طرح گزر جاتا ہے۔ اسے کب پرواہ ہے آپ کی۔ بس آپ ہی ہیں جو اس کے لئے ہلکان ہوتی رہتی ہیں۔“

اس کی آواز میں رنجش تھی۔ شکوہ تھا۔ بی بی اسے اتنا دل گرفتہ دیکھ کر سنجیدہ ہو گئیں۔ قہوے کا چولہا آہستہ کر کے اس کی طرف چلی آئیں۔

”پگلی۔ وہ جان کر تھوڑا ہی ایسا کرتا ہے۔ بھارتی درندے کتوں کی طرح اسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ وہ اس طرح کھلے عام آجا نہیں سکتا۔ حالات دیکھ کر آنا پڑتا ہے۔ اس نے یہ جوکھم اپنی ذات کے لئے تو نہیں لیا نا۔“

”مگر بی بی! وہ بابا سے رابطہ رکھتا ہے مگر مجھ سے ایک بار بھی اس نے... چھوڑیں بی بی۔ آپ تو ہمیشہ اسی کی حمایت کرتی ہیں۔“ وہ خفا ہو گئی۔

”چل ہٹ بے وقوف لڑکی! میں بھلا کیوں اس کی حمایت کرنے لگی۔ جتنا وہ مجھے پیارا ہے اس سے زیادہ تو مجھے پیاری ہے۔ تو تو میرے آنگن کا چاند ہے۔ چل آ۔ میں اس کے کان پکڑوا کر تیرے سامنے ہاتھ جڑواتی ہوں پھر

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

دیکھو۔ وہ معافی مانگتا ہے تجھ سے کس طرح۔“ بی بی نے پیار سے اسے تھاما مگر وہ کم سن نادان بچی کی طرح بدک کر دور ہٹ گئی۔

”رہنے دیں بی بی! زبردستی احساس دلانے سے کیا حاصل۔ یہ کوئی پوشاک تو نہیں ہے کہ آپ نے زبردستی پہنا دی۔ احساس تو خود دل کی زمین سے پھوٹنے والا پودا ہے۔ اسے خود ہی احساس کیوں نہیں کہ بابا اور آپ کے علاوہ کوئی تیسرا بھی اس کا منتظر ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”میں تو یونہی خوش فہم ہی رہی اتنے برسوں کہ...“ وہ دانتوں میں لب کچلنے لگی اور آنکھوں میں امڈنے والے قطروں کو چھپانے کی غرض سے باورچی خانے سے باہر نکلنے کے لئے پلٹی تو دھک سے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہیں تو کھڑا تھا۔ آنکھوں سے ہم رنگ شلوار سوٹ اور سادہ سی چپل کوئی اہتمام نہیں تھا مگر پھر بھی وہ بہت خاص لگ رہا تھا۔

اس کی غیر متوقع موجودگی نے مومنہ کو اچھا خاصا خفیف کر کے رکھ دیا جبکہ وہ اس کے چہرے پر ابھرتے اور معدوم ہوتے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے خاصا محظوظ ہوا تھا۔

”مومنہ طارق! آپ پانچ سال باہر رہ کر کیا ہمیں بھول گئیں کہ یہاں بھی کتنے لوگ منتظر رہتے تھے آپ جناب کے۔ یونہی خوش فہم سے لوگ۔ کبھی یاد آئے کیا؟“ اس کی بھاری آواز چھوٹے سے باورچی خانے میں بڑی گونجدار اور بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ میری مجبوری تھی۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"مجبوریاں انسان کی اپنی خود ساختہ ہوتی ہیں۔" وہ جیسے ماننے کو تیار نہ ہوا۔

" بی بی! اگر میں سری نگر میں ہی ہوتی تو کیا آپ لوگوں سے رابطہ نہ رکھتی؟" اس کی بات پر برا مان کر مومنہ نے بی بی کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

اس کی آنکھوں کے سحر انگیز رنگوں میں بڑی مدھر سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بھئی اب تم دونوں آپس میں الجھو۔ مجھے تو درمیان میں مت گھسیٹو۔" بخت بی بی دامن بچا گئیں۔

"میرا خیال ہے دوریاں محبت کی شدت کا احساس دلاتی ہیں۔ فاصلے زیادہ قریب لانے کا باعث ہوتے ہیں۔" بی بی کے باورچی خانے سے جانے کے بعد وہ ہولے سے بولا۔

مومنہ نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن تابناک آنکھیں اس کی سنہری آنکھوں کے سمندر سے ٹکرائیں تو غازی شاہ کو اپنا وجود لحظہ بھر پانی کے مانند لرزتا محسوس ہوا دوسرے پل وہ جیسے چونک سا گیا اور ایک گہری سانس کھینچی۔

"سوری مومنہ! میں جہاں ہوں اور جو حالات میرے ارد گرد ہیں وہاں ایسی باتوں کے سوچنے کے لئے بھی وقت نہیں ملتا۔ دو گھڑی ساتھی مل بیٹھ کر ہنس بول لیں تو بھی ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جرم کر لیا ہو۔

اطراف میں سسکتے انسانوں کا ہجوم۔ بھارتی درندوں کے مظالم کا نشانہ بننے والے بے گناہ کشمیریوں کی آہ و بکا، ایک وقت میں دس دس جنازے۔ یہ سارے حالات اور واقعات ہماری سوچوں اور مسکراہٹوں کو یوں چوس لیتے ہیں جیسے آکاس بیل ہرے بھرے پودے کا پتا پتا۔ پھر بھی میں تم سے شرمندہ ہوں۔ بسا اوقات ہمارے اندر سے بہت سی تمنائیں، خواہشیں سر اٹھاتی ہیں مگر ان کا یا تو گلا گھونٹنا پڑتا ہے یا پھر ان پر دبیز نقابیں چڑھانی پڑتی ہیں۔" اس کا لہجہ دھیما لو دیتا ہوا تھا جو مومنہ کی سماعت پر بھلا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں صحن میں چلے آئے جہاں خوشگوار دھوپ بکھری ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے تم نے مجھے معاف تو کر دیا ہو گا؟" وہ اس کی جھکی جھکی پلکوں پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔ وہ پلکوں کی باڑھ جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

"معاف تو کر دیا ہے مگر شکوہ تو اب بھی ہے غازی شاہ۔" وہ چند لمحے توقف کے بعد بولی۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی تنظیم میں مجھے ضرور شامل کرو گے مگر ابھی تک وعدہ وفا نہیں ہوا۔ کہاں تو میری سرکاری جاب نے تمہیں مجھ سے متنفر کر دیا تھا اور اب جتنی بار اس جاب کو خیر باد کہنے کا کہا تم نے بابا سے کہلوا دیا کہ میں ابھی ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔ کیا تم پاپا (طارق احمد) کی وجہ سے مجھے روک رہے ہو اگر ایسا ہے تو پاپا سے میں خود بات..."

"نہیں مومنہ! یہ بات نہیں ہے۔ تم تو ہماری تنظیم میں بہت اہم پوسٹ پر ہو گی۔ تمہاری اہمیت تو بہت زیادہ ہے۔ سرجن ہونے کی حیثیت سے بھی اور۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک ہلکی سی سانس بھری پھر سر جھٹک کر بولا۔

"میرا خیال ہے یہ جگہ ان باتوں کے لئے نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے اس جگہ لے جائو نا جو مناسب ہے۔ میں خود آنا چاہتی ہوں تو وہاں تمہارے باہر کھڑے چمچے مجھے اندر نہیں جانے دیتے۔"

"وہ چمچے نہیں مجاہد ہیں۔" غازی شاہ نے سخت برا مان کر فہمائشی نظروں سے اسے ٹوکا۔

"سوری مگر اس وقت وہ مجھے بہت برے لگتے ہیں جب مجھے تم سے ملنے نہیں دیتے۔" وہ پوری سچائی اور سادگی سے کہہ گئی۔

غازی شاہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کی خوش نما جھیلوں میں وہ اپنے لئے پسندیدہ رنگ دیکھ رہا تھا بلکہ محبت آمیز چمک بھی۔ وہ سادہ لوح یا کم فہم نہیں تھا کہ وہ رنگ نہ پہچان پاتا جو شفق کی طرح دل کے آسمان پر سج کر آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنے دل میں محبت کی ایسی ہی روشنی پھوٹتی محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ تعلیم کے لئے لندن چلی گئی تھی' وہ ہر ہر آہٹ پر اس کا گمان کرتا رہا تھا۔ ہر ہر لمحے اسے یاد آتی رہی تھی۔ کبھی رات کی تاریکی میں آسمان پر چمکتے ستاروں میں اسے تلاشتا تھا تو کبھی پھولوں میں اس کی کھلکھلاہٹیں

ڈھونڈتا پھرتا۔ اس کی ہنسی کے موتی ہمیشہ اس کے دل کی سیپ میں محفوظ تھے مگر اب وہ جذباتی نوجوان بن کر نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ محبت کی مسرور کن مہک اور دل گداز رنگوں کے ہمراہ سفاک حقیقت بھی اس کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مولوی خضر محمد کی نہیں طارق احمد کی بیٹی تھی جو ایک سرکاری آفیسر تھا جسے کشمیری مسلمانوں کے مفاد سے یقیناً کوئی دلچسپی نہ تھی جسے صرف اپنی نوکری' اپنے اثرورسوخ اور سٹیٹس کی فکر رہتی تھی۔ پھر بھلا وہ ایک حریت پسند لیڈر کو دامادی میں کیسے قبول کر سکتا تھا اور پھر جن حالات سے وہ نبرد آزما تھا اس کے آس پاس زندگیاں سسک رہی تھیں۔ اذیت اور دکھ کا سفر تھا جو کانٹوں سے پر تھا اور جانے کتنا طویل تھا۔ جہاں اتنے بہت سے نہتے، بے گناہ ظلم کی چکی میں پستے انسانوں کی حق خود ارادیت اور آزادی کی جنگ جاری تھی ایسے میں وہ اپنی خوشیاں وقت کے کشکول سے کس طرح چن سکتا تھا۔

اور ضروری نہیں اس کے ہاتھ خوشیوں کی ان مہکتی کلیوں کو چننے کے لئے بڑھتے تو وہ کامیاب رہتا۔ خالی ہاتھ رہ جاتا۔ بہت سی ایسی سوچیں اسے اپنے جذبوں کے آگے تنکے کی طرح بہنے سے روکے ہوئے تھیں۔

"بھارتی حکومت میڈیا پر پابندی لگا کر یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ وہ اپنے مظالم جو کشمیریوں پر روا رکھے ہوئے ہے وہ چھپانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس کی بربریت کے کھلے مظالم تو سڑکوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ غازی شاہ! ایسے میں میرا دل چاہتا ہے میں یہ ہسپتال چھوڑ دوں جہاں انہی درندوں، ظالم ہندوئوں کے زخموں کا اندمال ہوتا ہے جہاں ایک زخمی مسلمان کے ساتھ تعصباتی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔"

"دھیرج سرجن! دھیرج۔ تمہارا جذبہ قابل تحسین ہے مگر ہر کام سوچ اور حکمت عملی سے کیا جانا چاہیئے۔ ہماری محض چند جذباتی باتیں ہمیں آزادی نہیں دلائیں گی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جذباتی کیفیت سے نکالنے لگا۔

"ہاں۔ غازی ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا۔ ہر کام مضبوط ارادے اور بہترین حکمت عملی سے کیا جائے تو کامیابی کا امکان رہتا ہے۔" مولوی خضر محمد بھی ادھر چلے آئے۔

"بھارتی سرکار جس طرح ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت پوری دنیا میں اپنا ہندو مت کلچر پھیلا رہے ہے میڈیا کے ذریعے یہ کوئی وقتی نہیں ہے اس کا اثر دیرپا ہوگا۔ جس طرح مغربی کلچر بڑے منصوبے اور سازش کے تحت غیر محسوس طریقے سے آدھی دنیا میں پھیل کر بربادی کا باعث ہوا اسی طرح اب بھارتی کلچر بے ہودہ فلموں کے ذریعے معصوم ذہنوں میں بٹھایا جا رہا ہے۔ چند دیدہ زیب اور وقتی خیرہ کن رنگوں کے ساتھ یہ زہر نس نس میں اتارا جا رہا ہے جو منشیات سے زیادہ مہلک ہے جو روحانی اور جسمانی تباہی کا باعث ہے۔ بس رب العالمین اس زہر سے عالم اسلام کو محفوظ رکھے۔ یہ زہر جسم کی نہیں روح کی موت

ہے۔ دنیا ہی نہیں آخرت بھی برباد ہے اس سے۔" مولوی خضر محمد کے چہرے پر تاسف اور دکھ کے سائے لرزنے لگے۔

"بابا۔ اسلام کسی انسان کا تخلیق کردہ دین نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ماننے والوں کے قلوب میں اس طرح سرائیت کئے ہوئے ہیں جس طرح شریانوں میں خون بھاگتا دوڑتا ہے۔ اگر شریانوں سے خون نکال دیا جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔"

"یہ ہزاروں کشمیری بھارتی درندوں کے تیروں کا استقبال کرتے ہیں۔ اپنے سینوں پر، تلواریں تمغوں کی طرح سجا لیتے ہیں۔ ذہنی اور جسمانی اذیتیں سہہ رہے ہیں۔ کیسے کیسے ظالمانہ طریقوں سے انہیں ٹارچر کیا جاتا ہے کہ عام آدمی دیکھ کر لرز جائے مگر یہ کشمیری مسلمان ہی ہیں جو زخموں سے چور، کٹے ہوئے اعضا کے ساتھ بھی چیخ چیخ کر یہی کہتے ہیں "نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر۔" یہ جذبہ جہاد ہے جو دنیا کے بڑے بڑے ایٹم بموں سے زیادہ پاورفل ہے۔ ایمانی طاقت ہے جو ان کے کمزور اور نحیف جسموں میں موجزن رہ کر انہیں کمزور نہیں پڑنے دیتی۔" غازی شاہ کے انداز بیاں اور جملوں میں ہلکورے لیتا جوش ماحول پر عجیب سا سحر طاری کر رہا تھا۔ مومنہ کی پلکوں پر یک بیک ستارے جھلملانے لگے۔ اسے تختوں پر لیٹے وہ زخمی یاد آئے جو بھارتی فوجیوں کی بربریت کا نشانہ بنائے گئے تھے۔ محض اللہ اکبر کہنے کے جرم میں۔

اتنا بڑا بھارت اور اتنی ہزاروں فوج بھی نہتے کشمیریوں کی آواز کو دبا نہیں پا رہی تھی۔ اس لئے کہ یہ حق کی آواز تھی۔ سچائی کی پکار تھی۔

اس نے ایک گہری پر ملال سانس بھرتے ہوئے پلکوں پر اترتے نمی کے قطروں کو پونچھا۔

"میرے اندر بھی وہی خون ہے غازی شاہ اور ایسے ہی طوفان اٹھائے ہوئے ہے جو تمہاری رگوں میں موجزن ہے۔ کشمیر کو میں بھی بھارت کے ظلم و ستم سے آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اب تمہیں اس طرح ہرگز نہیں جانے دوں گی جب تک تم میرے لئے کوئی فیصلہ نہیں کرو گے۔"

"بہت ضدی لڑکی ہو؟" غازی شاہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"نہیں غازی شاہ۔ میری بیٹی حقیقتاً اس قابل ہے کہ تم اسے ایک بار آزما کر دیکھو۔ یہ کیسے پورا اترتی ہے۔" مولوی خضر محمد اس کی حمایت میں بولے تو وہ کھل اٹھی۔

"اب تو بابا بھی میری حمایت کر رہے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟" وہ فرضی کالر جھاڑنے لگی۔

"ارے میں تو کہتی ہوں لڑکی ذات کی صلاحیتیں تو اس کے شوہر کا گھر چلانے اور بال بچوں کی پرورش میں صرف ہونا چاہئیں۔" بخت بی بی دستر خوان پر برتن رکھتے ہوئے بول اٹھیں۔

"اب طارق سے کہو کہ اس کی شادی کا سوچے۔ کیا بٹھائے رکھنا ہے اسے۔"

صحن میں لحظہ بھر بڑی خاموش سی فضا تن گئی۔ بی بی کے جملے بڑے غیر متوقع تھے۔ مومنہ اور غازی شاہ کے دل یکبارگی ایک ہی احساس سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکے تھے۔ بے ساختہ نگاہیں ملیں مگر نگاہوں کا یہ تصادم لمحہ بھر کا تھا۔ مومنہ کی خمدار پلکوں میں حیا کا بوجھ سمٹ آیا۔ وہ چہرہ جھکا کر تخت سے اٹھ گئی۔

"بی بی! آپ کو تو بس ایک ہی موضوع یاد رہتا ہے۔" وہ رخ موڑ کر دستر خوان پر پلیٹیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ عجیب سی شرم نے اسے آگھیرا تھا۔

"لو۔ میں کوئی غلط کہہ رہی ہوں مولوی جی! میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ طارق اور زہرہ سے بات کریں۔ ہمارا غازی شاہ لاکھوں میں ایک ہے خیر سے۔ کتنا ارمان ہے میرا کہ اس کا گھر بس جائے اور وہ بھی اپنی مومو سے۔ اب تو بس دل چاہتا ہے یہ کام جلد از جلد ہو جائے۔" بی بی کے لہجے میں خواہشیں، آرزوئیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ ادھر مومنہ پلیٹ ہاتھ میں پکڑے گویا سانس لینا بھی بھول گئی۔ اس کے اندر اتنی سکت بھی نہ رہی کہ پلٹ کر غازی شاہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ ہی لے لیتی۔ بھلا اس وقت اس کے چہرے پر کون سا رنگ تھا۔ اس کی سنہری آنکھیں بی بی پر تھیں یا اس کی جانب اٹھی تھیں۔

وہ خاموش نظریں اور عنابی لب جنہوں نے کبھی کھل کر اظہار نہ کیا تھا تو کیا ہوا۔ وہ پہلی ملاقات کی بے تابی، سرخوشی۔ طلحہ احمد کی شرارتوں پر اس کا محظوظ ہو کر مسکرانا اس بات کی غمازی ہی تو کرتا تھا کہ وہ بھی اس سفر کا مسافر ضرور ہے۔

"اے لو۔ تم سب لوگ تو یوں چپ ہو گئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے آپ سے کہا ہے مولوی جی!"

"ارے بی بی۔ آپ بہت دور کا سوچنے لگی ہیں۔ بھلا ایک مجاہد۔ حریت پسند طارق احمد جیسے بڑے آفیسر کی بیٹی کے قابل کہاں۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے یقیناً کسی اعلیٰ عہدے دار داماد کے خواہش مند ہوں گے۔ آپ ناحق خواب دیکھنے لگی ہیں۔" غازی شاہ آستین فولڈ کرتے ہوئے تخت سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے لہجے میں استہزا آمیز مسکراہٹ تھی جو تیر بن کر مومنہ کے جگر کو چھلنی کر گئی۔ احساس تذلیل سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے پلیٹ پٹخنے کے انداز میں دستر خوان پر رکھی اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

مولوی خضر محمد شاہ بے حد خاموشی سے اٹھ گئے اور جا کر نلکے پر ہاتھ دھونے لگے جیسے اس موضوع پر بات کرنا ان کے لئے قطعی غیر ضروری تھا یا پھر قبل از وقت۔ یوں بھی وہ کم گو تھے اور عملی انسان تھے۔

"غازی! پھر خفا کر دیا میری بچی کو؟ یہ جانتے ہوئے کہ یہ تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچتی۔" بی بی کی آواز دھیمی تھی۔ وہ فہمائشی نظروں سے غازی شاہ کو دیکھ رہی تھی اور باورچی خانے کے دروازے کو تھامے کھڑی مومنہ کا دل دھک سے رہ گیا کہ یہ اس کے جذبے بی بی پر کیسے عیاں ہو گئے۔

☆...☆...☆

وہ بی بی کو باورچی خانے کی طرف آتے دیکھ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔ بی بی بڑی خاموش رازداں تھیں۔ اس کا ادراک اسے آج ہوا۔ اس نے ان پر دزدیدہ نگاہ ڈالی اور صحن کے اس حصے میں چلی آئی جہاں غازی شاہ کھڑا تھا۔

"میں یہ کبھی بھی پسند نہیں کروں گی غازی شاہ کہ تم بی بی کی بھیک میں مجھے ملو۔ میں کوئی کشکول لے کر نہیں کھڑی ہوں کہ ان کے کہنے پر تم اپنی عنایت، توجہ اور محبت کا سکہ ڈال دو۔" وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"رفاقت میں آدمی دل و جاں سے شامل نہ ہو تو وہ سراب ہوتی ہے۔ محبت تو ایک دوسرے کے اندر اگنے کا نام ہے غازی شاہ۔ کوئی کسی کے اندر زبردستی اپنی جڑیں نہیں ڈال سکتا۔ یہ تو خود کونپل کی طرح پھوٹتی ہے اور آہستہ آہستہ نمو پا کر پتھریلی زمین کو بھی نرم کر دیتی ہے۔ دوسرے کے دل میں آپ زبردستی اگ نہیں سکتے چاہے وہ زمین کتنی ہی زرخیز کیوں نہ ہو۔"

اس نے یہ کہہ کر غازی شاہ کی آنکھوں سے جھلکتے تحیر کو ایک نظر دیکھا پھر پلٹنے ہی لگی تھی کہ اس کی کلائی غازی شاہ کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ اس کی آنکھوں کے تحیر میں ایک وارفتانہ سی چمک بھی اتر آئی تھی۔

اس کے لمس کی کرنوں نے مومنہ کی رگ رگ میں طوفان مچا دیا۔ یہ لمس کسی معصوم بچے کا نہیں تھا۔ یہ بچپنے کا الہڑ لمس نہیں تھا۔ یہ ہاتھ اس بچے کا نہیں تھا جسے تھام کر وہ مزے سے گڑھے پار کیا کرتی تھی۔

یہ ہاتھ تو ایک بھرپور مرد کا تھا جس نے پورے استحقاق کے ساتھ اسے تھاما تھا۔

اس کے اس ہاتھ میں وہ دل دھڑک رہا تھا جس میں مومنہ طارق بسی ہوئی تھی۔

"تمہارا یہ روپ تو بہت پیارا ہے مومو! میں تو تمہیں اب تک وہی روتی بسورتی کم عقل مومنہ سمجھ رہا تھا۔ مگر تم تو آج تیکھی تیکھی مہکی مہکی سرجن لگ رہی ہو۔"

وہ کھسیا کر ہاتھ چھڑانے لگی۔ وہ یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی مگر بس ایک طرح کی بے اختیاری تھی جس کی لپیٹ میں یکلخت چلی گئی تھی۔

”چھوڑو میرا ہاتھ۔“

”اگر نہ چھوڑوں تو؟“ وہ لطف اٹھا رہا تھا۔ اس لمحے اس کی سنہری آنکھوں کے سمندر میں ایسی تندی اور روانی تھی کہ مومنہ کو لگ رہا تھا وہ اس روانی میں تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔

”میں بی بی کو بلا لوں گی۔“

”بلا لو۔ بلکہ بابا کو بھی آواز دے لو تاکہ وہ بھی دیکھ لیں کہ میں نے تمہارا ہاتھ پورے استحقاق کے ساتھ تھاما ہوا ہے۔ اسے کبھی نہ چھوڑنے کے لئے۔ ہم تو بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہیں مومنہ!“ اس کا لہجہ گمبھیر ہو گیا پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”بی بی کی خواہش بے جا نہیں ہے۔ ہر ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اولاد کی خوشیاں دیکھیں اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ یہی قانون فطرت ہے کہ انسان ہر حال۔ میں اپنی لائف بالکل فطری انداز میں گزارے۔ شادی ایک سوشل ضرورت ہے۔ جہاں یہ عورت کو تحفظ فراہم کرتی ہے وہاں مرد کو ذہنی آسودگی مہیا کرتی ہے۔ یہ بندھن زندگی کو سہل بنا دیتا ہے۔ مگر میں ذہنی طور پر اس وجہ سے ڈسٹرب ہوں کہ ڈرتا ہوں پتا نہیں اس رشتے کے تقاضوں کو پورے خلوص سے ادا کر سوں گا یا نہیں۔ میں دراصل مکمل یکسوئی کے ساتھ اس بندھن کو نبھانا چاہتا ہوں مگر جانتا ہوں کہ یکسوئی کے لئے چند برس بھی گزر سکتے ہیں اور پوری عمر بھی۔ کیا تم انتظار کر سکتی ہو جتنا میں کہوں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھنے لگا۔

”مومنہ طارق مرتے دم تک انتظار کر سکتی ہے غازی شاہ۔ میں اپنے جذبوں کے آگے اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ میرا وعدہ ہے مومی کہ تمہارے انتظار کو لمبا نہیں ہونے دوں گا۔ تمہاری آنکھوں کو تھکنے نہیں دوں گا۔ تمہارے ضبط کو آزماؤں گا نہیں کہ جسے چاہتے ہیں۔ اسے دکھ نہیں دیتے۔ اسے آزماتے نہیں ہیں۔“ اس نے بڑے بے اختیارانہ انداز میں کہا۔ مومنہ خود میں سمٹ گئی۔

☆...☆...☆

کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا جا رہا تھا۔ بی بی' غازی شاہ کو ایک ایک چیز اصرار کر کے کھلا رہی تھیں جیسے وہ کوئی چھوٹا سا شرمیلا سا بچہ ہو۔

اسی دم دروازہ کھول کر اچانک طلحہ احمد اندر داخل ہوا۔

”غازی! غازی شاہ!“ اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی مگر لہجہ دھیما تھا۔ غازی شاہ خطرے کا احساس کر کے ایک جھٹکے سے دستر خوان سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے طلحہ؟“ مولوی خضر محمد بھی اٹھ گئے۔

"جلدی سے نکل چلو یہاں سے غازی۔ سرکاری گاڑیاں اس محلے میں گھر گھر تلاشی لے رہی ہیں۔ افضل نے بتایا ہے۔ رمیش ورما کے قتل کے بعد سرکاری کتے اور زیادہ حرکت میں آگئے ہیں۔ جلدی نکل چلو۔"

غازی شاہ نے سرعت سے اپنی چادر اٹھائی۔ طلحہ باہر کی طرف مڑ گیا تھا۔

"خدا خیر کرے۔ جانے آج کتنے معصوم گھروں کے چراغ گل ہوں گے۔" بخت بی بی جلدی دستر خوان سمیٹنے لگیں۔

مومنہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"مگر وہ ہمارے گھر میں کیا تلاشی لیں گے۔ کیا ہے یہاں پر؟" وہ متعجب ہو کر مولوی صاحب کو دیکھنے لگی۔

"دوسروں کے گھروں میں کیا ملتا ہے بھلا انہیں۔ بس مار دھاڑ کر لڑکوں کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور عورتوں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔"

"تم ایسا کرو مومنہ کہ طارق ہاؤس چلی جاؤ۔ تمہارے پاس اپنی گاڑی تو ہے نا۔"

"نہیں۔ میری گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ مگر میں طارق ہاؤس نہیں جاؤں گی۔" وہ یکدم ضدی لہجے میں بولی۔

"دیکھو۔ بحث مت کرو۔ غازی ٹھیک کہہ رہا ہے تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ان درندوں کا کچھ بھروسا نہیں۔ وہ کب..." مولوی خضر محمد اسے پچکارنے لگے۔ وہ خود بھی یکدم متوحش نظر آنے لگے تھے۔

"مگر بابا۔ کیا یہاں ہر محلے۔ ہر گھر کی عورت طارق ہاؤس ہی جائے گی پناہ کے لئے۔ طارق ہاؤس کوئی پناہ گاہ تو نہیں ہے۔ بس نہیں جاؤں گی میں۔ دیکھ لوں گی وہ کیا بگاڑ سکتے ہیں میرا؟" وہ جھک کر ہاتھ دھونے لگی اور جیسے ہی سیدھی ہوئی غازی شاہ نے جھٹکے سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"بہت ضدی لڑکی ہو تم۔" وہ اسے گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ طلحہ احمد اسے اشارہ دے کر دوسری جانب نکل گیا تھا۔

غازی شاہ اسے ساتھ لئے احتیاط سے سنسان گلیوں کی طرف بھاگنے لگا۔ گلیوں میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سرکاری گاڑیوں کی آمد پر ہر گھر میں خوف وہراس طاری تھا۔ لائٹیں تو یوں بھی کسی نے نہیں جلا رکھی تھیں جو ایک طرح سے ان کے لئے سود مند ہی تھا۔

وہ درختوں کے جھنڈ میں ایک جگہ رک کر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ مومنہ اس کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی۔

"اب ہم کہاں جائیں گے غازی؟" وہ آہستہ آواز میں پوچھنے لگی۔

"میرا خیال ہے ابھی اسی جگہ ہمیں ٹھہر کر حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ابھی آگے بڑھنا مناسب نہیں ہے۔ یہ قدرے محفوظ جگہ ہے۔" اس نے ایک فوجی گاڑی کو آتے دیکھا تو مکمل اس طرف متوجہ ہو گیا پھر اس کی طرف منہ کر کے دبی زبان میں بولا۔

"میرے خیال سے فوجی گاڑیاں اپنی کارروائیوں میں آدھا گھنٹا تو ضرور لیں گی۔"

کچھ ہی دیر میں سرکاری گاڑی سے بھارتی فوجی ارنے بھینسوں کی طرح اتر کر گھروں کے دروازوں پر ٹکریں مارنے لگے۔

خوف میں روز و شب گزارنا اور شب بیداریاں تو کشمیریوں کا مقدر ہو چکی تھیں۔ ہر آہٹ پر دل خوف کی دلدلی زمین میں دھنسنے لگتے۔ عورتیں اندر کمروں میں دبک جاتیں مگر چھوٹے چھوٹے گھروں کے کمزور دروازے انہیں کہاں تحفظ دے سکتے تھے۔ ان ہوس زدہ نظروں سے۔ ایک گھر سے اچانک چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں جو ماحول پر چھائی دہشت کو کچھ اور بڑھا رہی تھیں۔

دو فوجی درندے ایک جوان دوشیزہ کو کھینچ کھانچ کر دہلیز سے باہر نکال رہے تھے۔ اندر عورتوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آ رہی تھیں جبکہ ایک بوڑھا ان فوجیوں کے قدموں میں گرا ان کے پیروں سے لپٹا اپنی عزت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

کتنا کم فہم تھا جو عزت کے سب سے بڑے لٹیرے تھے جو عزت کا مفہوم سمجھنے نہ تھے ان سے ایسی بھیک مانگنا سوائے نادانی کے کیا ہو سکتا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' لڑکی کی چیخیں آسمان و زمین کو ہلا رہی تھیں مگر ان کافروں کے دل کی تاریک زمین میں ذرا بھی ہلچل نہ ہوئی۔

اس کا دوپٹا ان کے پیروں میں پڑا رل رہا تھا اور کھینچا تانی سے اس کے گریبان کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس روح فرسا منظر نے مومنہ کو شدتِ کرب سے گنگ کر دیا۔ اس نے مارے خوف کے غازی شاہ کا بازو جکڑ لیا۔ اسے لگا جیسے اس لڑکی کی جگہ وہ خود ہے۔

ہاں وہ بھی تو کشمیری عورت تھی۔ دوسری مسلمان عورتوں کی طرح اتنی ہی غیر محفوظ۔

''غازی شاہ! یہ درندے اسے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اس کی آواز خوف سے مرتعش تھی۔ غازی شاہ کی نظریں بھی سامنے تھیں جہاں ایک فوجی اس بوڑھے کو اپنے وزنی بوٹوں سے ٹھوکریں مار رہا تھا مگر وہ

ان ناقابل برداشت ضربوں کے باجود اپنی بیٹی کی طرف لپک رہا تھا۔

''کچھ کرو غازی شاہ۔'' وہ رو دینے کو تھی۔ بہ مشکل اپنی سسکی کو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر روکا تھا۔

''میرے پاس اس وقت ہتھیار نہیں ہے اور ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا۔ کتنی عورتیں آزادی کی اس جنگ میں قربان ہو گئی ہیں۔ ان بھیڑیوں کے ہاتھوں۔'' وہ بے چارگی آمیز کرب سے بولا۔

بہت کچھ کرنے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی لاچاری اسے بھی آزردہ کئے ہوئے تھی۔

''وہ ہتھیاروں سے لیس ہیں اور ہم نہتے ہیں۔ کچھ کرنا سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ ہو گا۔ تمہیں بھی بہت حوصلے سے یہ سب دیکھنا اور سہنا ہو گا۔ اس سے زیادہ دل دوز منظر دیکھے ہیں میں نے کہ سینہ شق ہو جاتا ہے۔ ایسے مواقع آئے ہیں ہم پر جب ایسی ہی بے اختیاری پیروں کی زنجیر بن جاتی ہے۔'' وہ اسے تسلی دینے لگا۔

وہ لڑکی کسی کٹی شاخ کی طرح اس فوجی کے بازو کے حلقے میں فوجی گاڑی تک پہنچی تھی کہ اچانک ایک مکان کی چھت سے زبردست فائرنگ ہونے لگی۔ یہ فائرنگ سیدھی فوجی گاڑی پر کی گئی تھی۔ لڑکی کو کھینچنے والا فوجی کسی پرندے کی طرح پٹ سے زمین بوس ہو گیا۔ اسے تڑپنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ سنسناتی گولیاں سیدھے دل کے مقام پر لگی تھیں۔

فائرنگ سٹین گن سے ہو رہی تھی اور لگاتار ہونے کے باعث سرکاری بھیڑوں میں بوکھلاہٹ پھیل گئی تھی۔ لڑکی موقع پاتے ہی اپنے بوڑھے باپ کی طرف بھاگی۔ اس غیبی امداد نے ضعیف اور زخمی بوڑھے کے اندر بھی گویا توانائیاں بھر دیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بیٹی کو پکڑ کر دوڑ لگا دی۔

غازی شاہ اور مومنہ اچانک پلٹنے والے حالات پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک غازی شاہ نے بحرِ عقیدت کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہلکی آواز میں نعرۂ تکبیر لگایا اور مکا فضا میں لہرایا۔

''طلحہ احمد۔ زندہ باد۔ طلحہ احمد۔'' اس کی آواز دبی مگر پرجوش تھی۔ مومنہ تحیر آمیز بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''طلحہ۔ کیا مطلب؟''

''ہاں مومنہ۔ یہ فائرنگ طلحہ احمد نے کی ہے۔ میں ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ اتنا زبردست اٹیک طلحہ ہی کر سکتا ہے۔ وہی اللہ کا سپاہی، کشمیر کا محافظ طلحہ۔ خدا تم پر رحمت نازل کرے۔ تمہیں شمعِ حق کی حفاظت کے لئے لمبی حیات دے۔ تم اس دھرتی کا مان ہو۔'' خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

فوجی گاڑیوں سے فضا میں چھوٹے چھوٹے بم اچھالے جانے لگے جبکہ دوسری طرف فائرنگ کا سلسلہ رک چکا تھا۔

''چلو مومنہ۔'' غازی شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور پچھلی طرف دوڑنے لگا۔

''مم۔ مگر وہ طلحہ۔'' وہ پر تشویش سی ہو کر بولی۔ اس کے دھیان کی رو طلحہ احمد کی طرف بھٹکنے لگی۔

''وہ آجائے گا۔ اس کا اللہ نگہبان ہے۔ ہمیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاد کرنے والے تو اللہ کے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے قرب سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔'' غازی شاہ ہلکے سے مسکرایا پھر بولا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ طلحہ نے اس سے عظیم جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ کوئی عام شخص نہیں ہے۔ وہ شیر ہے شیر۔ کشمیر کا۔ اللہ کا۔ وہ مسلمانوں کا فخر ہے۔ جہاد کی لذت کا گرویدہ۔ جنت کا راہی ہے۔''

اور مومنہ کا دل بھی اس کشمیری لڑکے کی دلیری کو دل ہی دل میں خراجِ تحسین پیش کرنے لگا۔ اس کی زبان سے اس کے لئے خیریت اور عافیت کی دعائیں نکلنے لگیں۔

☆...☆...☆

ایک فوجی کی جوابی فائرنگ سے طلحہ احمد کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی۔ سنسناتی گولی اس کی پنڈلی کے گوشت میں پیوست ہو گئی تھی۔ خون بہنے کی رفتار خاصی تیز تھی جس کی وجہ سے بھاگنے میں خاصی دشواری کا سامنا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے پنڈلی میں آگ دہک اٹھی ہو۔

وہ بہت مضبوط اعصاب کا لڑکا تھا۔ اس کے لئے یہ بات پریشان کن تھی نہ موت جیسی شے اسے خوف زدہ کر سکتی تھی۔ یوں بھی ہر کشمیری مجاہد اپنے سود وزیاں سے بے گانہ تھا۔ زندگی کا نشہ ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ ان کی نظریں (علیین) پر ہوتی ہیں۔ زمین پر نہیں۔

جذبۂ آزادی اور جذبۂ شہادت کی چاشنی سے جب دل و روح کا رشتہ اٹوٹ ہو جائے تو پھر بڑی سے بڑی رکاوٹ اور بڑے سے بڑا خوف بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے۔

اس نے رک کر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے اپنے خیال کے مطابق وہ جہاں کھڑا تھا یہاں ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور وہ جس دیوار کو پھاندنے کا سوچ رہا تھا اس کے خیال میں وہ بھی یقیناً کسی ہندو کا ہی مکان ہو سکتا تھا مگر اس لمحے وہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے اپنا زخم دیکھنا چاہتا تھا جس طرح گوشت میں آگ دہکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اس سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ گولی ابھی گوشت میں ہی موجود ہے جو نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اللہ کا نام لے کر اس نے دیوار پھلانگ لی۔

یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا صحن تھا جس میں چاند کی ملگجی سی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے یکدم ٹھٹک کر رک گیا۔ چاند کی ملگجی روشنی میں اچانک صحن میں موجود کم واٹ کے بلب کی روشنی بھی شامل ہو گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی جو اندر کا دروازہ کھول کر صحن میں آئی مگر دوسرے پل ایک مرد کو دیکھ کر ہراساں نظر آنے لگی۔ اس کی نظر اس کے خون آلود پیر پر پڑی تو اس نے اپنی چیخ کو اندر ہی اتار لیا۔

طلحہ احمد کے لئے یہ سچویشن بڑی پریشان کن تھی۔ اس کا ہاتھ سرعت سے اپنی جیب کی طرف رینگ گیا۔

''میرا خیال ہے تمہیں ''اس'' کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' وہ اس کی جیب میں موجود ریوالور کو محسوس کر کے نرمی سے بولی تو اس نے چونک کر لڑکی کو بہ نظرِ غور دیکھا۔ سادہ سے سوٹ اور ہم رنگ دوپٹے میں وہ بالکل عام کشمیری لڑکیوں کی طرح تھی۔ نہ پیشانی پر بندیا، تلک نہ ساڑی جو عموماً یہاں کی عورتوں کا پہناوا تھا۔

وہ آگے بڑھی۔

''زخمی معلوم ہوتے ہو؟''

''کیا مجھے اتنا موقع دیا جائے گا کہ میں اپنا زخم صاف کر سکوں۔ اس کے علاوہ میرا یہاں کودنے کا کوئی مقصد نہیں تھا۔'' طلحہ احمد نے یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کا بھی بغور جائزہ لیا۔

وہ دوستانہ انداز میں مسکرا دی اور ایک طرف ہو گئی۔

"ہاں۔ اندر آجائو۔ مسلمان ہو؟"

"الحمدللہ۔" اس کے پیچھے کمرے کا رخ کرتے ہوئے طلحہ کے لبوں سے بے خوفی کے ساتھ جواب نکلا تھا۔ وہ ٹھٹک کر پلٹی۔ لحظہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر پیدا ہوا جیسے اس جواب سے اسے خوشی بھی ہوئی ہو اور رنج بھی۔

وہ اسے ایک کمرے میں بٹھا گئی اور خود جب دوبارہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔

"کیا تم بھی مسلمان ہو۔ میرا مطلب ہے یہ گھر کسی مسلمان کا ہے یا؟"

اس کے دوستانہ رویے نے طلحہ احمد کو الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس کا الجھن میں مبتلا ہونا ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ کشمیر کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں اور ہندوئوں میں سخت قسم کی کشیدگی پائی جاتی تھی۔ کسی ہندو کے گھر کا دروازہ مسلمانوں کی مدد کے لئے نہیں کھل سکتا تھا۔ کئی ایک گھروں نے تو دھوکے سے مسلمان مجاہدوں کو پناہ دے کر انہیں اعلیٰ حکام کے حوالے کر دیا تھا۔

"زخموں کا اندمال کرنا کیا صرف مسلمانوں کا ہی شیوہ ہے؟" وہ ہولے سے مسکرائی اور مزید کچھ کہتی کہ اندر کسی عورت کی آواز ابھری۔

"کویتا کون ہے؟ پرکاش آیا ہے کیا؟"

"نہیں ماں۔ کوئی نہیں ہے۔ تم سو رہو۔ میں اپنا کام کر رہی ہوں۔" اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے ملحقہ کمرے میں سوئی اپنی ماں کو جواب دیا۔ طلحہ کو اپنی بات کا جواب اس کے لہجے سے مل گیا۔

"چنتا مت کرو۔ تم وشواس کر سکتے ہو۔ ویسے تم مجاہد معلوم ہوتے ہو۔" وہ اس کے پیر کا زخم دیکھنے کے لئے ذرا سا جھکی کہ اس نے جلدی سے اپنا پائوں کھینچ لیا۔

"میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میرا خیال ہے گولی گوشت کے خاصی اندر تک دھنس گئی ہے۔ اسے تم خود اپنے ہاتھ سے نہیں نکال سکو گے۔" وہ اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر تشویش سے بولی۔ پھر نرمی سے اس کے پیر کے زخم کا معائنہ کرنے لگی۔ طلحہ احمد نے کوئی مداخلت نہ کی۔ یوں بھی خون کے اخراج نے اسے زیادہ مزاحمت کے قابل بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ جلد از جلد اس گولی سے چھٹکارا پا کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

تمام وقت وہ ایک چھوٹے سے سٹول پر بیٹھا رہا۔ اس کے لبوں سے ایک کراہ تک نہ نکلی تھی۔ ڈاکٹر کویتا اس کے چہرے پر پھیلے استقلال کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس کے مضبوط اعصاب کو سراہتی رہی۔ اس نے تو ہاسپٹل میں مریضوں کو معمولی خراشوں پر بھی چیختے چلاتے دیکھا تھا مگر یہ اس کے لئے بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مرد نہ صرف ضبط کے ساتھ بیٹھا تھا بلکہ مختلف اوزار بھی اٹھا کر اسے دے کر اس کی مدد کر رہا تھا۔ گولی نکالنے میں خاصی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے کی خاموشی میں یہ کام ہو گیا۔ وہ بینڈیج کر کے کھڑی ہوئی تو سوچ رہی تھی کہ ایسے حوصلہ مند دلیر اور جری مسلمانوں کو بھلا کون شکست دے سکے گا۔ ان کی اسی جرأت، جواں مردی اور بلند حوصلے نے تو بھارتی سرکار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اس کے لئے دودھ کا گلاس بھر کر لائی مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا۔

"اس کی تمہیں اس وقت ضرورت ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے یہ فوری توانائی دے گا تمہیں۔"

"ڈاکٹر! یہ خون اللہ کی راہ میں بہا ہے اور میرے نزدیک بہت معمولی سا بہا ہے۔ یہاں تو بھارتی فوجی کشمیری مجاہدوں کے بدن سے لہو کا قطرہ قطرہ نچوڑ لیتے ہیں تب بھی وہ کمزور نہیں پڑتے۔ یہ چند قطرے بہہ جانے سے بھلا کیا نقاہت آئے گی۔"

اس کا لہجہ خشک اور سادہ تھا۔ کویتا کے دل کے گوشے میں مانوس سا درد پھیل گیا۔ وہی بے قراری اور اضطراب روح میں چٹکیاں بھرنے لگا۔

وہ طلحہ احمد کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی دیوتا ہو۔ کوئی انوکھی مخلوق۔ کم از کم۔ اس بھومی کی تو نہیں۔

اس کی خوش نما آنکھوں میں اس کے لئے پسندیدگی کی چمک لہرانے لگی۔ یہ مضبوط اعصاب، مضبوط بدن کا مرد اس کے اعصاب کو منتشر کر رہا تھا۔ ہولے ہولے دل کے بند کواڑ پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی بنیادوں سے بھی ہل رہی ہو۔ پچھلی رات کا سکوت جیسے درہم برہم ہو کر رہ گیا ہو۔

"میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا ڈاکٹر۔ اور موقع ملا تو اتار دوں گا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

وہ جیسے عالم خود فراموشی سے عالم خود شناسی میں چلی آئی۔ اس کے چہرے کے دلکش نقوش میں رنج پھیل گیا۔

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے یہ میرا فرض تھا۔"

"فرض تو اس وقت ہوتا ڈاکٹر جب میں ہسپتال میں آتا۔ بہر حال اللہ تم پر رحمت نازل کرے۔ میں شکر گزار ہوں تمہارا۔" وہ سنبھل کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"میں انتظار کروں گی۔" وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

وہ ٹھٹکا اور ذرا سا چہرہ موڑ کر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اسے دھچکا لگا۔

اس سادہ سے چہرے پر انوکھی تحریریں تھیں اور آنکھوں میں رنگ بول رہے تھے۔

اس کا چہرہ یکدم پتھریلا ہو گیا اور اعصاب تن گئے۔

"کس بات کا انتظار؟" اب کے لہجہ قدرے سپاٹ ہو گیا تھا۔

"احسان چکانے کا۔" وہ مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

"ڈاکٹر! اگر زندگی وفا کرے گی تو میں اپنا وعدہ پورا ضرور کروں گا۔ اگر شہید ہو گیا تو معاف کر دینا۔" وہ متانت سے کہہ کر صحن میں آیا پھر اس کے بتائے ہوئے راستے سے باہر نکل گیا۔ مگر کویتا کے کھنڈر، ویران دل میں روشنی کی کرن بن کر در آیا۔

اس نے جلدی سے گھر کے دروازے کے ساتھ اپنے دل کے دروازے کو بھی بند کر دیا۔

اتنی دل نواز، بے اندازہ جگر جگر کرتی روشنی کو وہ کیسے نکل جانے دیتی۔

وہ بستر پر گری تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ روح میں ایسی ہی بے قراری مچل رہی تھی جو مولوی خضر محمد کے گھر سے واپسی پر ہوئی تھی جو مومنہ سے مل کر ہوتی تھی۔

اس کی بے خواب آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ یکدم اسے لگا جیسے وہاں سے روشنی پھوٹ رہی ہو اور روشنی کا دائرہ بڑھتے بڑھتے اسے حصار میں لیتا جا رہا ہو۔ پھر یکدم وہ روشنی میں نہا گئی۔

دبیز اندھیرا کسی بوسیدہ چادر کی طرح پھٹتا جا رہا تھا۔

بس ایک جھٹکے کی ضرورت تھی۔ اس اندھیرے کو ہمیشہ کے لئے کاٹنے کے لئے۔

اس روشنی کو تھامنے کے لئے بس ایک قدم کی ضرورت تھی۔

وہ بستر سے اٹھ گئی۔ اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

صبح وہ مولوی خضر محمد کے قدموں میں بیٹھی بلک رہی تھی۔

”مجھے شانتی چاہئے۔ مجھے اس اضطراب سے نکال دیجئے مولوی جی! میرے اندر بھی اپنے جیسا اطمینان اور شانتی ڈال دیجئے۔ میں اس روشنی کو تھامنا چاہتی ہوں۔ میرا من کھنچا جاتا ہے اس روشنی کی طرف مگر جب قدم اس کی طرف بڑھاتی ہوں تو پردہ سا آجاتا ہے۔ شاید خوف کا، وحشت کا، نادیدہ ہاتھوں کا مگر... مگر پھر بھی کوئی کشش ہے جو مجھے آپ کی طرف کھینچ لاتی ہے۔

آپ نے کہا تھا کہ پرمیشور (خدا تعالیٰ) جب کسی کو سچائی کا راستہ دکھانا چاہتا ہے تو علوم کی طلب اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک اضطراب اس کی آتما میں برپا کر دیتا ہے۔ اسے تاریکی کا ادراک ہونے لگتا ہے تو وہ روشنی کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔ تو بس مولوی جی۔ میرے اندر بھی ایسا دریچہ کھلنا چاہتا ہے۔ آگہی ور راستی کا سورج چمکنا چاہتا ہے۔ مجھ پر کرپا کیجئے مولوی جی! مجھے نراش نہ کیجئے گا۔ آپ کو اپنے پرمیشور کا واسطہ۔“ اس نے جھک کر مولوی خضر محمد کے پیر پکڑ لئے تھے۔

مولوی صاحب یوں چونک اٹھے جیسے گہری نیند سے یکدم بیدار ہوئے ہوں۔ انہوں نے روتی بلکتی کویتا کی طرف دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے پیر کھینچ لئے۔

”ہاں۔ طلحہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ غازی شاہ کے لب مبہم انداز میں پھیلے۔ مگر اس کی آنکھیں اس مسکراہٹ سے عاری رہیں وہاں تو سوچوں کا ڈیرا تھا۔ ایک فکر انگیز خیال کا بسیرا تھا۔

وہ کرسی اٹھا کر اس کے مقابل رکھ کر بیٹھ گیا۔

”تم فی الحال اپنی جاب نہیں چھوڑو گی۔ یہ میرا حکم سمجھ لو۔“

”کس برتے پر تم یہ حکم صادر کر رہے ہو؟“ وہ کم سن ناراض بچے کی طرح بلبلا کر بولی۔

ایک لحظہ تو غازی شاہ گڑبڑا کر رہ گیا جبکہ طلحہ احمد مسکرا کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں سر جن! مگر کہے بنا رہ نہیں سکتا کہ آپ کے اور غازی کے درمیان تو بہت سے تعلق ہیں۔ اس میں جو سب سے پیارا اور مضبوط تعلق ہو سمجھ لیجئے اسی برتے پر اس نے حکم دیا ہے۔" وہ قدرے شریر ہوا تھا۔

اس کی یہ شرارت بالکل غیر متوقع ثابت ہوئی۔ مومنہ کا تنا ہوا چہرہ یکلخت رنگ بدل گیا۔ اس کے ہونٹ آپس میں جڑ گئے اور دراز پلکیں خوش نما جھیلوں پر نرم اور لچک دار شاخوں کی طرح جھک گئیں۔

غازی شاہ کے لئے یہ انتہائی دلچسپ تجربہ تھا۔ تپتے ہوئے چہرے پر یکلخت شرم کی لالی کا امڈ آنا جیسے بھری دھوپ میں یکدم برسات ہو گئی ہو۔

اس کا دل پہلو میں بڑے زور سے دھڑکا تھا مگر وہاں صرف اس کا شریر دوست طلحہ احمد ہی نہیں تھا اور بھی دوسرے تھے۔

"سوری مومنہ۔ تمہیں طلحہ نے یونہی پریشان کر دیا۔ تم الجھو مت میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔" اس کا ٹھہرا اور گمبھیر لہجہ مومنہ کے لئے تقویت کا باعث بنا۔ خود کو سنبھال کر وہ اب قدرے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"تم تو جانتی ہو کشمیری مجاہد کس کسمپرسی کی حالت میں جہاد کر رہے ہیں۔ نہ اسلحہ ہے ان کے پاس ضرورت جتنا نہ دوسرے وسائل۔ بس ان کا جذبۂ ایمانی ہی ان کے لئے ہر طرح کا ہتھیار بنا ہوا ہے۔ آئے دن کشمیری ہزاروں بھارتی فوجیوں کے مظالم کا نشانہ بنتے ہیں۔ کتنے نوجوانوں کو وہ ہر روز اذیتی مراکز میں لے جا کر اذیتیں

دے کر پھر انہیں سڑکوں پر پھینک جاتے ہیں، جنہیں ہمارے لڑکے لے آتے ہیں مگر بیشتر کے زخم ایسے ہوتے ہیں جن کا مداوا ہمارے پاس نہیں ہوتا اور اکثر دوائوں کی عدم دستیابی کے باعث وہ معذور ہو جاتے ہیں۔ بہر حال آج کل ہمیں جن دوائوں کی اشد ضرورت ہے اور شدید قلت ہے وہ انیستھیٹک Anesthetic ہیں۔" یہ کہہ کر غازی شاہ نے ایک لمحے توقف کیا پھر ہلکی سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"اس سلسلے میں تمہیں ہماری پوری عملی مدد کرنا ہوگی۔"

اس کے بعد غازی شاہ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا اور مومنہ کے لئے عملی میدان میں اتر کر کچھ کرنے کا تصور ہی خوش آئند اور مسرت انگیز تھا۔

"میں یہ کام ضرور کروں گی چاہے اس میں میری جان کیوں نہ چلی جائے۔" اس کے اندر گویا نئی قوت بیدار ہو گئی۔

"خدا نہ کرے۔" غازی شاہ نے بے اختیار اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا مگر دوسرے پل سٹپٹا کر کھینچ لیا مگر مومنہ مسحور سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

"تمہاری زندگی مجاہدوں کے لئے بہت قیمتی ہے۔ تمہیں بہت جینا ہے سر جن!"

اس کا لہجہ نرم، میٹھا اور اتنا اپنائیت آمیز تھا کہ مومنہ طارق کے اندر واقعی جینے کی امنگیں کروٹیں لینے لگیں۔

☆...☆...☆

کویتا فرش پر بالکل ساکت بیٹھی تھی مگر اس کے چہرے پر سناٹا نہیں بلکہ ایک سکون آمیز ٹھہراؤ تھا۔

ماتا جی نے اس کے چہرے پر ایسا سکون' ایسا اطمینان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر خود ان کا وجود ان دیکھی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کے انکشاف نے انہیں بوسیدہ چادر کی طرح ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

"پاپن! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی تو بھگوان کا ایسا اپمان کرے گی۔ تیری آتما میں راکشس (شیطان) کہاں سے گھس گیا۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔" ماتا جی وہیں فرش پر بیٹھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی تھیں۔

"میری آتما سے تو راکشس اب نکلا ہے ماں! ایسی شانتی مجھے پہلے کب ملی تھی۔ ایسی سرشاری ایسا انوکھا سکون۔ ماں وہ شکتی مجھے اندر سے جھنجھوڑتی رہتی تھی۔ بدی سے دور لے جانا چاہتی تھی۔ مولوی جی کہتے ہیں اللہ جس بندے کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ہدایت دیتا ہے۔ اس بندے کو جو اللہ کی طرف رجوع و توجہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ جس کسی کی ہدایت کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔" اور فرمایا کہ "بھلا جس کا سینہ اللہ نے دینِ اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ پھر اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی میں ہے۔" کویتا کی آواز دھیمی تھی اور نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں جیسے وہ خود فراموشی کے عالم میں مولوی صاحب کی باتوں کے سحر انگیز جزیروں میں بھٹک رہی ہو۔

"چپ کر جا بدبخت۔" ماتا جی کا رواں رواں کانپ اٹھا ان کی نظریں مورتی پر پڑیں پھر جھک گئیں۔

"کاش۔ تجھے میری کوکھ نے جنم نہ دیا ہوتا۔ تو اس گھر سے نکل جا۔ میں تجھے برداشت نہیں کر سکتی۔ تو اپنے ساتھ مجھے بھی نرک میں لے جائے گی۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی اس لاڈلی بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو ڈال دیتیں۔

"ہائے۔ پرکھوں کی عزت خاک میں ملا دی تو نے۔ اگر برادری میں خبر پڑ گئی کہ کویتا مسلمان ہو گئی ہے تو اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ میری برسوں کی تپسیا تو نے خاک میں ملا دی۔ میں بھگوان کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ ابھاگن تو نے میرا خیال بھی نہ کیا۔ کیسی دُشٹ اولاد ہے تو۔" ماتا جی کا واویلا اس کے لئے کسی تشویش کا باعث نہ تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ اس لئے کہ اس نے اندھیرے سے اجالے کا سفر کیا تھا۔ صحرا سے نخلستان کا سفر کیا تھا۔

اس کا سمبندھ فرش کے ہزاروں خداؤں سے نہیں عرش کے پرماتما سے ہوا۔

وہ ماتا جی کو بھی اس اندھیرے سے نکالنا چاہتی تھی۔

"نرک۔ تو جانتی ہے ماں جہنم اور جنت کی حقیقت۔ تو سمجھتی ہے ماں کہ یہ مورتیاں۔ یہ دیوتا۔ یہ پتھر کے بت تجھے نرک سے بچا لیں گے؟ نہیں ماں! اب اس پاکھنڈ سے تم بھی نکل آؤ۔ تمہیں کیا خبر کہ جنت اور جہنم کس کے حصے میں آئے گی۔ وہاں کا آنند کس کے بھاگ میں لکھا ہے۔ ہاں ماں! اللہ کے نہ ماننے والوں کے لئے جنت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے لئے صرف جہنم ہے بھڑکتی ہوئی آگ۔ تم بھی دل کی آنکھیں کھول کر

دیکھو۔ عقل کی لگام تھام کر غور کرو۔ کیا ہم دھوکے میں نہیں ہیں۔ کیا ہم اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے جھوٹے، گونگے معبودوں کی پوجا پاٹ میں وہ شانتی پا چکے ہیں؟ نہیں، اگر پا چکے ہوتے تو ہمارے چہرے اتنے پھیکے اور جیون اتنا بدرنگ نہ ہوتا۔ میری طرف دیکھو ماں! میرے چہرے پر تجھے کبھی ایسی شانتی ایسا وشواس نظر آیا تھا؟" وہ ماتا جی کے قدموں میں بیٹھی تو انہوں نے جھٹکے سے اپنے پیریوں سمیٹ لئے جیسی کویتا کوئی بھڑکتی ہوئی آگ ہو اور انہیں جلا کر راکھ کر ڈالے گی۔

"دیکھ ماں۔ میری طرف دیکھ۔ تو تو اولاد کا چہرہ پڑھ سکتی ہے۔ اس کے من کا حال اس کی آنکھوں سے جان سکتی ہے۔ تو تو ماں ہے اور مولوی جی بتاتے ہیں کہ ماں کے قدموں تلے اللہ نے جنت رکھی ہے۔ مگر۔ مگر تمہارے قدموں تلے۔" وہ ہونٹ بھینچ کر چپ ہو گئی۔

اس کی آنکھوں میں یکلخت ملال کا رنگ امڈنے لگا۔ وہ ماتا جی کی طرف دیکھنے لگی جو ایک ٹک خود اسے تک رہی تھیں۔ نظریں ملیں تو وہ مضطربانہ انداز میں کھڑی ہو گئیں۔ ان کا بوڑھا وجود اب تک مرتعش تھا۔ وہ نہ کویتا سے نظریں ملا پا رہی تھیں، نہ ان مورتیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں جو جا بجا دیواروں پر سجی تھیں۔

"یہ اپرادھ مجھ سے نہ ہو گا۔ نہ ہو گا۔ بھگوان کرپا کر۔ کرپا کر مجھ پر۔ اس گھر پر..." وہ بڑبڑاتیں کمرے سے نکل گئیں۔

کوئی گھنٹا بھر بعد کویتا بڑا سا بیگ کندھے پر ڈالے گھر سے نکلنے لگی تو ماتا جی لپک کر آئیں۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

"کہاں جا رہی ہو؟" ان کے لہجے میں حیرت اور خوف تھا۔ کویتا کی آنکھوں میں کوئی کرب۔ ملال نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا واقعی کوئی بڑی شکتی اس کے ہمراہ ہے جو اسے ایسا مضبوط بنائے ہوئے ہے۔

"میں اپنے اللہ کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں ماں۔ اسے پانا چاہتی ہوں۔ اس کے نزدیک ہونا چاہتی ہوں۔ یہاں بتوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ یہاں مجھ سے آپ کے بھگوان کا اپمان ہو جائے گا اور میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔ مجھ سے اگر کوئی اپرادھ ہو گیا ہو تو معاف کر دینا۔" اس نے قدم اٹھائے مگر ماتا جی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"تجھے تیرے پربھو کا واسطہ کویتا! تیرے اللہ کا واسطہ۔ بیٹھ یہاں مجھ بڈھی کو اس بڑھاپے میں دکھ دے گی تجھے شرم نہ آئے گی؟" انہوں نے ایک اضمحلال سے اسے دیکھا اور پھر کویتا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

"میں جانتی ہوں تو میری ڈانٹ ڈپٹ پر دکھی ہو گئی ہے۔ پر کیا کروں تو نے دھچکا ہی ایسا پہنچایا ہے۔ رک جا کوی۔ مجھے سوچنے دے۔ سوچنے دے بیٹی!"

کویتا جھٹکے سے پلٹی۔

"کیا سوچنے دوں ماں۔ تو۔ تو کیا سوچ رہی ہے؟" اس کی آواز زنجیر کی لپیٹ میں آ کر مرتعش ہو گئی۔ اس کا دل پہلو میں کسی خوش آئند تصور سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"یہی کہ تیرے اللہ اور میرے بھگوان میں کون حق پر ہے۔" ماتاجی یہ کہہ کر نزدیکی موڑھے پر یوں ڈھے سی گئیں جیسے پیروں نے مزید جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ان کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔

☆...☆...☆

مومنہ کے لئے یہ خبر بے حد خوش کن تھی کہ آج کل سٹور کا چارج ڈاکٹر سنیل کے پاس تھا۔اس مسرت انگیز خبر کے ساتھ ہی اس کا ذہن سوتے جاگتے ایک پلان مرتب کر رہا تھا۔

وہ سرجن جگن ناتھ کے ساتھ وارڈ کا راؤنڈ لے کر سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ گراؤنڈ فلور پر ڈاکٹر سنیل سے ٹکراؤ ہو گیا۔

وہ اتفاق سے سٹور سے باہر نکل رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں کچھ رجسٹرز تھے۔اس کا رخ ایم ایس کے کمرے کی طرف تھا مگر مومنہ کو دیکھ کر وہ رک گیا۔لبوں پر مدھر مسکراہٹ بکھر گئی۔آنکھوں کی چمک میں

اضافہ ہو گیا۔ہاتھ بلا ارادہ بالوں پر پھیرنے لگا۔

"ہیلو ڈاکٹر سنیل!" میں آپ ہی کو تلاش کر رہی تھی۔" اس نے پہلی بار اپنے لہجے میں اتنی مٹھاس بھری تھی کہ ایک پل کو ڈاکٹر سنیل حیران ہوا مگر دوسرے پل اس کی آنکھیں لو دینے لگیں۔

"زہے نصیب۔وہ آئیں خود ہماری طرف خدا کی قدرت ہے۔ویسے مجھ حقیر پُر تقصیر کی تلاش کیونکر ہو رہی تھی؟" اس کے لہجے میں انوکھی کھنک اتر آئی تھی۔

"دراصل آج سرجن سری کانت کے ساتھ میرا آپریشن تھا مگر پتا چلا پیشنٹ کی حالت کے پیش نظر آپریشن انہوں نے ڈیلے کر دیا ہے۔کویتا بھی نہیں آئی ہے سوچا آپ ہی کی کمپنی میں کچھ وقت گزار لوں۔"

"چلیں۔آپ کو ہماری سنگت کا خیال تو آیا ورنہ بقول غالبؔ۔اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔" ڈاکٹر سنیل کا چہرہ دیدنی تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی چمکتی سیاہ آنکھوں میں خمار اترنے لگا۔

"آپ نے کرپا کر ڈالی۔اس عنایت۔اس نوازش۔اس کرم کا شکریہ۔" وہ سر کو خم دیتے ہوئے شوخی سے بولا تو مومنہ ہنس پڑی اور اس کے ساتھ طویل راہداری میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ایک تو مجھے ابھی راستوں سے واقفیت نہیں ہے۔بار بار راستے بھول جاتی ہوں۔کدھر جانا ہوتا ہے کدھر چلی جاتی ہوں۔"

"واقعی۔یہ تو بڑی الجھن کی بات ہے۔ایک راستہ چن لیجئے بار بار راستہ بھٹکتی رہیں گی تو میں بے چارہ تو مارا جاؤں گا۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔مومنہ اس کا جذبوں سے پر لہجہ قطعی نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

’’اسی لئے تو سوچا ہے کہ آپ کی سنگت میں ذرا گھوم پھر کر راستوں سے واقف ہو جاؤں۔ کیا خیال ہے آپ میری مدد تو کریں گے نا۔‘‘

اندھے کو کیا چاہئے ڈاکٹر سنیل کے تو دل کی کلی کھل اٹھی۔ وہ تو مومنہ کے قرب کا خواہاں رہتا تھا یہ نادر موقع کیسے گنوا دیتا۔

’’کیوں نہیں۔ میرے لئے یہ شبھ گھڑی ہو گی اور یقیناً یہ دن بھی میرے لئے یادگار ہو گا۔ ویسے آپ کی کرپا ہو تو میرا پورا جیون ہی یادگار بن سکتا ہے۔‘‘ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس کی سمت جھکا۔ اسے جذبے لٹاتی نگاہوں سے تکنے لگا۔

مومنہ کے لئے یہ سچویشن یقیناً سٹپٹا دینے والی تھی۔ ڈاکٹر سنیل کے اس طرح کے اٹیک کے لئے بہر حال وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور اس کی یہی مسکراہٹ ڈاکٹر سنیل کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھی۔ وہ خمیری آٹے کی طرح پھیلتا ہی چلا گیا۔

قمر دل کیا ہے میں تو ان کی خاطر جان بھی دے دوں
میری قسمت اگر ان کو نہ پھر بھی اعتبار آئے

’’خوب۔ تو شاعری کا شوق بھی رکھتے ہیں۔‘‘ مومنہ دل ہی دل میں اسے کوس کر رہ گئی مگر بظاہر نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ جو اس نے بڑے جذب اور خاصی بے تکلفی سے اس کے نرم گداز کندھے پر رکھ دیا تھا۔ جیسے مومنہ طارق آج اس پر سب کچھ وار دینے کو تیار تھی۔

’’ارے شوق کا ایک جہاں ہے۔ ہمارے من میں۔ کبھی جھانک کر تو دیکھئے۔‘‘ وہ کچھ کھسیا کر ہاتھ پہلو میں گرا کر ہنس دیا۔

وہ اس کے ہمراہ ڈیوٹی روم کی طرف چلی آئی جو اس وقت خالی پڑا تھا۔

’’ویسے آج کل میرؔ کے ابیات، غالبؔ کے مصرعے ذہن میں ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔ بقول شاعر

اس عشق کے درد کی کون دوا مگر ایک وظیفہ ہے ایک دعا
پڑھو میر و کبیر کے بیت کبت سنو شعرِ نظیر فقیر و غنی

ڈاکٹر سنیل کا خمار سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مومنہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ ناحق ڈاکٹر سنیل کو چھیڑ دیا۔ وہ تو کسی بے سرے راگ کی طرح بج اٹھا تھا اور یہ ایسی موسیقی تھی جو وہ کم از کم افورڈ نہیں کر سکتی تھی تاہم مارے بندھے اس کے ہمراہ رہی۔

’’آپ تو بڑے مصروف ہو گئے ہیں ان دنوں۔ کبھی سٹور سے برآمد ہوتے ہیں تو کبھی ایم ایس کے کمرے سے۔ یہ بیت کبت کا وقت کب مل جاتا ہے؟‘‘ وہ لہجے میں خوش دلی کا تاثر سموتے ہوئے بولی اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

’’یہ ڈیوٹی کچھ بے زار کن نہیں ہے؟‘‘ وہ میز پر رکھی فائلوں کو یونہی سرسری انداز میں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"ارے جناب! ہم تو بڑے سواد میں ہیں۔ کم از کم اس ڈیوٹی میں صبح صبح مریضوں کے سوکھے سڑے منہ کے درشن سے تو نجات مل گئی ہے۔ ہاں کچھ ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں۔" وہ اس کے مقابل دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور درمیانی میز پر کہنیاں ٹکا کر کرسی سمیت آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ کیا سیوا کی جائے۔ بیت کبت کے ساتھ کولڈ ڈرنک چلے گی یا گرما گرم کافی؟"

"میرا خیال ہے بیت کبت کے ساتھ تو اسپرین ہی چلے گی۔" وہ جواباً برجستہ بولی۔ ڈاکٹر سنیل کا بڑا جاندار قہقہہ گونج اٹھا۔

"ڈاکٹر سنیل جی!" سریش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید پرچی تھی جو اس نے اس کے سامنے میز کی سطح پر رکھ دی۔

"یہ کچھ دوائیاں چاہئیں فوری۔ ڈاکٹر جگن ناتھ نے منگوائی ہیں۔"

ڈاکٹر سنیل کو سریش کی بے وقت آمد سخت کھلی تھی۔ اس نے سریش کو باقاعدہ گھور کر دیکھا اور دل ہی دل میں ایک موٹی سی گالی دی پھر پرچی اٹھا کر تیکھے چتون کے ساتھ اس پر نظریں ڈال کر بدمزہ ہو کر بولا۔

"یہ دوائیاں سٹور میں Available نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا چبھتا ہوا اور تلخ تھا جیسے ٹین کے برتن میں کسی نے پتھر لڑھکا دیئے ہوں۔

"اچھا سنو۔" کچھ سوچ کر وہ یکدم کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

"تم چلو۔ میں آتا ہوں۔" اس کے چہرے پر لمحہ بھر میں سارے جہاں کی بے زاری رقم ہو چکی تھی۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکالتے ہوئے وہ مومنہ کی طرف جھکا۔

"ویٹ ہیئر۔ آئی ایم جسٹ کمنگ او کے۔"

مومنہ کے لئے تو خدا نے بہترین موقع عنایت کر دیا تھا۔ ڈاکٹر سنیل کے جاتے ہی وہ فائلوں کو جلدی سے اپنی طرف کھینچ کر بڑی تیزی سے ان کی ورق گردانی کرنے لگی اور کاغذوں پر نظریں دوڑانے لگی پھر ایک ضروری کاغذ کو آہستگی سے پن سے الگ کیا اور تہہ کر کے سرعت سے اپنے پرس میں ڈال لیا اور باقی فائلوں کو چیک کرنے کے بعد یونہی میز پر اوپر تلے رکھ دیا۔ اس کے خیال میں آج کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ یوں بھی اس کا اصلی ٹارگٹ اس چابی کا حصول تھا جو ڈاکٹر سنیل اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

☆...☆...☆

بی بی سی کی رپورٹ کے مطابق بھارتی فوج کے وحشیانہ مظالم سے 22 مجاہدین سمیت 25 کشمیری شہید ہو چکے تھے اور لشکر طیبہ کے ڈسٹرکٹ کمانڈر بھی شہید ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ بیج باڑہ کی دو مساجد پر بھارتی فوج نے پہرا لگا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اسرائیلی خاتون کی جانب سے حضورؐ کی شان میں گستاخانہ تصاویر کے پوسٹر آویزاں کرنے کے مکروہ واقعے کے خلاف پورے سری نگر میں احتجاجی مظاہرے جاری تھے۔ تقریباً ساری ہی تحریکیں اس احتجاج میں شامل تھیں۔ مسلمانوں میں غم و غصے کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس

طرح کی گھناؤنی سازشوں سے ان کو ذہنی ایذا پہنچائی جارہی تھی۔ان کے اندر اشتعال پیدا کیا جارہا تھا۔پھر ان کے اس غم وغصے کو مغربی میڈیا جنون، شدت پسندی کا نام دیتا تھا۔دراصل یہ سب کچھ مسلمانوں کے خلاف سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جارہا تھا۔

اس احتجاج میں غازی شاہ کی تحریک بھی شامل تھی ان کے جوان جگہ جگہ بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کر کے مظلوم کشمیریوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔

☆...☆...☆

ان دنوں غازی شاہ کا ایک فیچر غیر ملکی اخبار میں سلسلے وار آرہا تھا جو خاصا تہلکہ خیز ثابت ہورہا تھا۔پہلی قسط میں اس نے مدلل الفاظ میں کفر کی طاقتوں اور ان کی سازشوں پر کھلے لفظوں لکھا تھا جو مختلف معتبر حوالوں سے لکھا گیا تھا جس کا متن بہت ستھرا، سچا اور اثر انگیز تھا۔

"اس وقت دنیا کے منظر نامے میں اسلام اور کفر دو فریق بن کر سامنے آچکے ہیں۔مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ کا اتحاد ان کی سفاکانہ اور گھناؤنی سازشیں کھل کر سامنے آچکی ہیں کیونکہ آج کے مسلمانوں نے ایک مرتبہ پھر فدوی الٰہی، فدوی نبیؐ کا روپ دھار لیا ہے۔غفلت اور سستی کی چادر اتار کر ان کفر کی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیک کر ذلت وخواری کی زندگی کو ترجیح دینے کے بجائے بہ زور شمشیر اپنے حقوق حاصل کرنے کا ارادہ باندھ لیا ہے۔ان کے اندر حسین ابن علیؓ، طارق بن زیادؒ، عبداللہ بن زبیرؓ، خالد بن ولیدؓ، ٹیپو سلطان کی

یادیں زندہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔سو کفار نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نت نئے پروپیگنڈے شروع کر دیئے ہیں جن میں پہلا پروپیگنڈا "بنیاد پرستی" کا ہے۔اس پروپیگنڈے کا مقصد مسلمانوں کو بدنام کر کے انتشار اور بدامنی کا ذمے دار قرار دینا ہے اور مسلمانوں کو دین اور جہاد سے متنفر کرنے کی ناکام اور گھٹیا کوشش ہے۔

درحقیقت بنیاد پرست ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنے دین میں اصل، اور دینی عقائد میں مضبوط ہوں۔اسلام درحقیقت ایک مکمل اور جامع دین ہے۔اس میں دوسرے مذاہب کی طرح توہمات اور تخیلات اور چند اعمال ہی نہیں بلکہ اس کے عقائد کھرے ہیں اور اعمال انسانیت کو شرف بخشنے والے ہیں۔اس دین میں عبادات کا ہی دخل نہیں، سیاست، معیشت، معاشرت، خلافت، حکومت، اقتصادیات، حدودِ قصاص اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کے تمام احکام موجود ہیں۔

سو اسلام کے سوا دوسرے مذہب کے لوگ بنیاد پرست ہو ہی نہیں سکتے۔ان کے پاس ہے ہی کیا جس پر پختہ ہوں۔ان کا دین اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے تابع ہے جو وہاں سے پاس ہوتا ہے اسے اپنا

لیتے ہیں۔سو کفر کی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ مسلمانوں میں جو پختہ ایمان مسلمان ہیں وہ ختم ہو جائیں اور جو مسلمان عقائد اور ایمان میں کمزور ہیں وہ اس جملے کے خوف سے خود کو سچا مسلمان ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں۔

بنیاد پرستی کی یہ اصطلاح اب بڑے زور شور سے استعمال ہونے لگی ہے حالانکہ مسلمان ہر دور میں موجود رہے مگر آج مسلمانوں نے ذلت اور غلامی کی زندگی کے خلاف آواز اٹھانی شروع کر دی ہے۔ وہ کفار کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈٹ کر میدانِ عمل میں اتر آئے ہیں۔ یوں انہیں بنیاد پرستی کے ساتھ ساتھ ''دہشت گرد'' کا نام بھی دیا جانے لگا ہے۔

دہشت گرد کہہ کر انہیں کمزور کیا جانے لگا حالانکہ دیکھا جائے تو فلسطین، افغانستان، کشمیر، بوسنیا ہر جگہ ڈھائے جانے والے مظالم کافروں کی درندگی اور دہشت گردی کا کھلا ثبوت ہیں۔ وہ کس طرح اپنی برتری اور طاقت کو مسلمانوں کے قتل عام کے لئے بے دریغ استعمال کر رہا ہے۔ اس بے دردی اور سفاکی اور اس غیر انسانی سلوک کو ''امن'' اور ''قانون'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ یہ اہل مغرب جنہوں نے احترام انسانیت، اکرام آدمیت، خواتین، بچوں اور بوڑھوں کے جداگانہ حقوق، حیوانات کے تحفظ اور ماحولیات کے سدھارنے کے لئے جامع اور موئثر قوانین بنا رکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ان کی درندگیوں، عیاریوں، مکاریوں پر ملمع سازی ہے۔ اگر ان کے دل میں انسانیت کے جذبات کا رتی بھر خیال ہوتا جس کا اظہار کر کے وہ اپنا رعب جماتے ہیں تو وہ کشمیر، افغانستان، فلسطین سے لے کر کیوبا کے دہشت ناک جزیرے تک مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جن کی خبروں سے اخبار بھرے پڑے ہیں اور ان کے منہ پر طمانچوں کی طرح ہیں۔

یہی افغان مجاہد جب جہاد میں روس کو شکست دے رہا تھا تو ان اعلیٰ حکام کے سامنے وہ مجاہد ہیرو تھے اور آج اسلام کے نام پر کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ناقابل بیان سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب ظلم بڑھتا ہے تو مظلوم خواہ کمزور ہی کیوں نہ ہوں اپنے حق کے حصول کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور یہی جہاد ہے۔ جب کفر، اسلام کی شمع گل کر کے اللہ کی مخلوق کو کفر و شرک اور نفس پرستی کی اندھیر نگریوں میں دھکیلنا چاہتا ہے انسانوں کو اسلام کے سایۂ عدل سے نکال کر ظلم، ناانصافی اور اپنی نفسانی خواہشات کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے تب اسلام شمع حق کی حفاظت کے لئے تلوار اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ اسے جہاد کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارا کا سارا اللہ کے لئے ہو جائے۔''

یہی جہاد آج کشمیر میں ہو رہا ہے۔ کشمیر کے مظلوم عوام 55 برس سے انصاف کا دامن پھیلانے کے باوجود انصاف نہ ملنے پر آج بہ زور شمشیر میدان میں کود پڑے ہیں۔''

☆...☆...☆

یہ مضمون ابھی جاری تھا۔ کشمیر کے یہ متوالے تلوار کے ساتھ قلم سے بھی جہاد میں مصروفِ عمل تھے۔ ایک روز غازی شاہ نے ایک کیسٹ مومنہ کو دکھائی۔

''یہ دیکھو سر جن! ایسی تقریباً ایک لاکھ سے زائد بھارت میں تقسیم کی جا چکی ہیں۔ جبکہ اب تک پندرہ ہزار سے زائد ضبط کی جا چکی ہیں۔ یہ کیسٹیں آج بھارتی سامراج کے لئے بڑا مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ ہر گھر میں بج رہی ہیں۔''

مومنہ نے اس کے ہاتھ سے کیسٹ لے کر الٹ پلٹ کر دیکھی۔

"مگر یہ تو عام سی آڈیو کیسٹ ہے۔اس میں کیا ہے ایسا؟"

"ہاں۔بظاہر تو یہ عام سی آڈیو کیسٹ ہی ہے۔جو عموماً گانوں کی ہوتی ہے مگر اس میں بجنے والا ترانہ جذبۂ جہاد کو توانا کر رہا ہے۔اس چھوٹی سی کیسٹ میں کشمیری مسلمانوں کے خون کو گرما دینے والی آواز بند ہے۔سنو گی؟"

"ضرور۔مگر یہ کس کی کوشش ہے؟"

"اس سوال کا جواب تو خود ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔" طلحہ احمد نے پہلی بار لب کشائی کی۔غازی شاہ نے ایک منی سائز ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگاتے ہوئے اس کی طرف چہرہ موڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں مومو! یہ ایک معما ہے۔ہمارے پاس یہ کیسٹیں درجنوں کے حساب سے پہنچائی جا رہی ہیں۔بھیجنے والا خود کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ہم ان کیسٹوں کو گھر گھر تقسیم کر دیتے ہیں بہر حال جو بھی ہے وہ اس جہاد میں شامل ہے اور یہی ہمارے لئے بہت ہے۔یہاں ہر کشمیری مسلمان اپنی بساط کے مطابق جہاد میں مصروف ہے۔مومنہ! کشمیریوں کا بہنے والا خون، جانوں کے یہ نذرانے کشمیر کی آزاد کا چراغ بجھنے نہ دیں گے۔اذیت رسیدہ کشمیری اس چراغ کو آخری سانس تک اپنے خون سے جلاتے رہیں گے۔جب تک ایوانوں میں بیٹھا سامراج شکست فاش سے دوچار ہو کر منہ چھپانے پر مجبور نہ ہو جائے اس چراغ کو اپنے لہو سے جلاتے رہیں گے۔" غازی شاہ کی آواز جذبات کی یورش سے بھاری ہو گئی تھی۔

وہ خاموش ہوا تو کتنی دیر کمرے کی فضا میں بوجھل اداسی طاری رہی پھر یہ بوجھل لمحے سرکے۔غازی شاہ نے ٹیپ کا بٹن کھول دیا۔

لمحہ بھر بعد ہی ایک پرجوش بھاری آواز گونجنے لگی۔

ہم دین کے داعی ہیں' اللہ کے سپاہی ہیں

ہم دیں کی حفاظت میں' سر اپنا کٹا دیں گے

ہم محسنِ اعظم کے جانباز مجاہد ہیں

ہم قصرِ ضلالت کی بنیاد ہلا دیں گے

جو پاک کے دشمن ہیں، کشمیر کے غاصب ہیں

اس سرکش و رہزن کو ہم اچھی سزا دیں گے

ہے خونِ شہیداں سے رنگین حسیں وادی

ہم اپنے شہیدوں کے قرضوں کو چکا دیں گے

سالارِ مسلماں سے سہما ہوا باطل ہے

اصنام کے بندوں پر وہ برق گرا دیں گے

امید نہ رکھ ہرگز امریکی، یہودی سے

یہ شاطرِ عالم ہیں، موقع پہ دغا دیں گے

پھر جہدِ مسلسل سے ایماں کی بہار آئی

پھر شمعِ الٰہی کو کچھ اور جلا دیں گے

ایک عجیب سا سحر تھا جس نے ان سب کو جکڑ رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سب کے دل سینے کی چہار دیواری میں شیشے کی طرح ہو گئے ہوں۔ اب ٹوٹا کہ اب ٹوٹا۔ ذرا آواز تھمے گی اور یہ ٹوٹ کر کرچیوں کی طرح فرش پر بکھر جائے گا۔

ٹھیک کہتے ہیں کہنے والے کہ آواز کا تعلق براہِ راست دل سے ہے۔ آواز کی کمان سے نکلا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگے بات تو تب ہے۔ اور یہ آواز دل پر لگ رہی تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں گویا تلاطم پیدا کر رہی تھی۔

وہ پلکیں جھپکے بنا یوں ٹیپ ریکارڈر کو تک رہی تھی گویا پلکیں جھپکنے سے یہ سحر ٹوٹ جائے گا۔

یہ چند لمحے عجیب کشاکش کے گزرے۔ غازی شاہ نے ٹیپ بند کر دیا اور جیسے سارا ماحول اس ٹرانس سے باہر نکل آیا۔ سینے میں اٹکی سانسیں پھر رواں ہو گئیں۔ ساکن پلکوں کا رقص پھر جاری ہو گیا۔ کائنات اپنے مدار پر گردش کرنے لگی۔

ایک گہری سانس کھینچ کر مومنہ نے ہاتھ بڑھا کر غازی شاہ سے وہ کیسٹ لے لی۔ اس کے سرخ رخساروں سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اس آواز کی بازگشت نے کسی طلسمی ڈور سے اس کا ذہن، اس کا دل اور اعصاب باندھ دیئے تھے۔ اسے پہلے تو لگا یہ آواز پہلے بھی سنی ہے مگر کہاں، کب، ذہن کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر سر جھٹک کر سوچا شاید وہم ہی ہو۔ کبھی کبھی کوئی صورت، کوئی آواز یونہی وہم میں مبتلا کر دیتی ہے کہ یہ صورت پہلے بھی دیکھی ہے۔

یہ آواز پہلے بھی سماعت نے سنی ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ دل میں کھب جانے والی آواز یا صورت عموماً مانوس محسوس ہوتی ہے۔

"سات لاکھ کی فوج کیا پچاس لاکھ کی فوج بھی مسلمانوں کے اس جذبے کو نہیں دبا سکے گی غازی شاہ!"

مومنہ پر عزم انداز میں ہلکے سے مسکرائی۔

"بالکل سرجن! اب تو یہ تحریکیں اور زور پکڑ گئی ہیں۔ مجاہدین کی کارروائیوں میں وسعت اور سرعت آ رہی ہے۔ لداخ سے لے کر جموں کے دور دراز علاقوں تک اور وادی کشمیر کے کپواڑہ سے لے کر کشتواڑ تک کے علاقے تحریک کے دائرے میں آ چکے ہیں اور کشمیر کے باہر ہماچل پردیش کی سرحدوں تک بلکہ خود ہندوستان کے اندر اس جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی جانے لگی ہے۔ یہ حق کی آواز ہے۔ یہ آواز ایک دن بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ بھارت کو اکھنڈ خیال کرنیوالے خود اپنی آنکھوں سے اس کی موت کا منظر دیکھیں گے۔"

"انشاءاللہ۔ایسا ضرور ہو گا۔ طلحہ احمد۔" مومنہ اور غازی شاہ کے دل کی گہرائیوں سے بیک وقت یہ آواز ابھری اور فضا کو مسحور کر گئی۔

☆...☆...☆

وہ طارق ہاؤس آئی تو مما اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

"کہاں رہ گئی تھیں تم نے تو کہا تھا ہاسپٹل سے سیدھے یہیں آؤ گی؟" وہ چھوٹتے ہی سرزنش کرنے والے انداز میں استفسار کرنے لگیں۔

وہ بڑی گھٹن اور تھکن محسوس کر رہی تھی۔بیگ کندھے سے اتار کر لابی کے صوفے پر ڈالا اور مما کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

"سوری مما۔بس مصروفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی۔"

"مگر ڈاکٹر سنیل کو میں نے فون کیا تو اس نے بتایا تم ہاسپٹل سے تو جلدی نکل گئی تھیں اور مولوی صاحب کی طرف بھی نہیں تھیں۔" مما کے لہجے میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی کھوج تھی۔

"یہ آج کل کن کاموں میں مصروف رہنے لگی ہو تم۔ذرا مجھے بھی تو پتا چلے؟" وہ اس کا چہرہ ٹٹولنے لگیں جہاں اس غیر متوقع بازپرس کے حملے نے بوکھلاہٹ عیاں کر دی تھی۔

"میری اور کیا مصروفیت ہو سکتی ہے مما۔سوائے ہاسپٹل کے۔" اس نے کندھے اچکا کر زبردستی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر ان کی تشویش کا توڑ کرنا چاہا۔

"مومی۔غازی شاہ سے ملاقاتیں ہوتی ہیں تمہاری؟" وہ پلٹنے لگی کہ مما کی آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ اس کا ٹھٹک جانا اور نگاہیں چرا لینا ہی ان کی اس ساری کھوج کا جواب بن گیا۔

"ہاں۔ملتی ہوں۔" وہ سر جھکا کر اعتراف کر گئی۔پھر بڑے اعتماد کے ساتھ ایڑیوں کے بل پلٹی۔

"میرا خیال ہے آپ سے چھپانا بے کار ہے۔"

"مومنہ۔جانتی ہو تم۔تمہارے پاپا کے علم میں آئے گا تو وہ کس قدر برہم ہوں گے۔وہ پہلے ہی تمہیں خبردار کر چکے ہیں کہ تم کسی قسم کی سیاست میں انوالو نہیں ہو گی اور۔"

"میں کسی سیاست میں انوالو نہیں ہوئی۔مائنڈ اٹ مما۔یہ سیاست نہیں ہے۔یہ آزادی کی جنگ ہے۔یہ ہماری زندگی کا سوال ہے۔یہ مرتے ہوئے کشمیری مسلمانوں کے لہو کا سوال ہے جو ہم زندہ لوگوں کے گریبانوں کو پکڑ کر جھنجوڑ کر کہہ رہے ہیں کہ ہمارے لہو سے جلا چراغ بجھنے نہ پائے۔"

ممانے تحیر سے اسے دیکھا پھر جیسے سنبھل کر سر کو خفیف سی جنبش دے کر مسکرائیں اور پیار سے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔

”میں جانتی ہوں تم بہت حساس ہو اور پھر تمہاری تربیت بھی تو مولوی صاحب نے کی ہے۔ تم تو بخت بی بی اور مولوی جی کا عکس ہو۔“ انہوں نے بڑی ملائمت سے اس کے چہرے کے گرد منڈلاتی زلفوں کو سنوارا اور اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”میں تو خود دل سے یہی چاہتی ہوں کہ تمہاری مسیحائی کشمیری مسلمانوں کے لئے ہو مگر بیٹی تم اپنے پاپا کو بھی جانتی ہو۔ دراصل وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ تمہیں کوئی گزند پہنچے وہ کیسے برداشت کر سکیں گے۔“

”یہ تو سراسر خود غرضی ہوگی مما!“ وہ ایک گہری سانس کھینچ کر ان کو دیکھنے لگی پھر قدرے دل گرفتگی سے گویا ہوئی۔

”یہ اتنے آزادی کی جنگ میں شہید ہونے والے بھی تو اپنی ماؤں، باپوں کے جگر کے گوشے تھے اور جو دوسرے ہیں وہ بھی تو کسی کی اولاد ہیں۔ کیا ان کے والدین ان سے سچی محبت نہیں کرتے؟ کیا مولوی جی اور بی بی کو مجھ سے اور غازی شاہ سے محبت نہیں ہے۔ نہیں مما۔ ہر محبت اپنا حق وصول کرنے بیٹھ جائے تو اس دنیا میں محبتوں کا دم گھٹ جائے۔ لوگ محبت پانے سے خوف زدہ ہو جائیں۔ محبت وصولی کے لئے نہیں کی جاتی حق جتانے کیلئے نہیں کی جاتی۔ یہ تو ہمیں فطرت کے مطابق والدین سے ملتی ہے اور آپ لوگوں نے تو یہ بھی

نہیں دی۔“ اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ اس کی محرومیاں پھر چیخ کر سامنے آ گئیں۔ مما اس کے آخری جملے پر تڑپ سی گئی تھیں۔

”مومی! میری جان! تم شکوہ کرنے میں حق بجانب ہو مگر بیٹا!“

”سوری مما۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ وہ جلدی سے بولی پھر مما کے ہاتھ تھام کر اپنی نم آنکھوں سے لگا لئے۔

”مجھے تو اتنی بے پایاں محبتیں ملی ہیں کہ کہیں بھی مجھے خالی پن کا احساس نہیں ہوا بلکہ کبھی کبھی تو اپنا دامن تنگ محسوس ہونے لگتا ہے خوشیاں اور چاہتیں سمیٹتے ہوئے۔ ایسے بھی ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو اپنی مجبوریوں کے پیش نظر کچرا کنڈی یا یتیم خانوں میں پھینک جاتے ہیں۔ میں تو آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے بی بی اور مولوی صاحب جیسی گود میں ڈالا۔ میں تو اپنی خوش قسمتی پر جتنی نازاں ہوں کم ہے۔ رئیلی مما۔ آئی ایم تھینک فل ٹو یو۔“ اس کے لہجے میں حقیقی تشکر تھا مگر زہرہ طارق کے اندر بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنا سینہ کھول کر وہ زخم نہیں دکھا سکتی تھیں جس سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ ان لمحوں کی اذیت ناکی کے وہ آبلے ابھی تک روح پر تپک رہے تھے۔

”چھوڑیں مما! یہ دیکھیں یہ کیسٹ مجھے دراصل کچھ گھروں میں تقسیم کرنی تھیں اس لئے آج لیٹ ہو گئی۔“ اس نے جلدی سے موضوع بدل ڈالا۔ مما کا دل گرفتہ چہرہ اسے اندر ہی اندر ندامت میں دھکیل رہا تھا۔ اس نے وہ آڈیو کیسٹ اپنے بیگ سے نکال کر مما کو دکھائی۔

"کیسی کیسٹ ہے۔ کیا ہے اس میں؟" مما چونک کر پھر قدرے حیرت سے اس چھوٹی سی آڈیو کیسٹ کو گھورنے لگیں۔

"یہ غازی کو ملتی رہتی ہیں۔ اسے بھیجنے والا کون ہے یہ وہ خود بھی نہیں جانتا۔ بہر حال جو بھی ہے اس جدوجہد میں شامل ہے۔ آپ سنیں گی؟"

مما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ فطری تجسس کے مارے وہیں سی ڈی پلیئر کے پاس جا بیٹھیں۔ مومنہ نے پلیئر آن کیا چند لمحے ہی سرکے تھے کہ وہی ترانہ گونجنے لگا۔

مما دم بخود رہ گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیسٹ سے یہ آواز بلند ہو گی۔

وہ کتنی دیر ایک سناٹے کا شکار رہیں۔ مومنہ نے بٹن آف کیا اور کیسٹ نکال کر اسے احتیاط سے دوبارہ بیگ میں رکھ دیا۔

"آج کشمیر کا بچہ بچہ جس نفرت سے سلگ رہا ہے۔ یہ نفرت بھارتی حکمرانوں کی طرف سے ہی ودیعت ہوئی ہے۔ ان بڑے بڑے ایوانوں کو آگ لگا دینی چاہئے جنھوں نے انسانیت سوز مظالم ڈھائے ہیں جس نے کشمیر کو تاریخ کا بدترین ظلم کا شکار خطہ بنا ڈالا ہے۔ جہاں حوا کی بیٹیاں بدترین اذیت کا شکار ہیں۔ ان ایوانوں کو آگ لگا دینی چاہئے جس میں بیٹھ کر اندھے مظالم ڈھائے جانے کے احکامات جاری کئے جاتے ہیں۔"

اس کا چہرہ شدت رنج سے لال ہو رہا تھا۔ شریانوں میں خون کی جگہ آگ بھاگتی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں وہی منظر گھوم رہا تھا جب بھارتی درندے حوا کی معصوم پاک باز بیٹی کو سڑکوں پر بے دردی سے کھینچ کر لے جا رہے تھے۔

"مما! پاپا سے کہہ دیجئے گا کہ ان لوگوں سے دوستی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ کافر مسلمانوں کے کبھی دوست ہو ہی نہیں سکتے۔ مولوی جی کہتے ہیں مسلمان اللہ کا دوست ہوتا ہے اور کافر شیطان کا۔ پھر بھلا اللہ کا دوست شیطان کا دوست کیونکر ہو سکتا ہے۔ شیطان تو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے۔ ان ایوانوں میں بیٹھنے والے با اثر کہلانے والوں سے تعلقات استوار کرنا فخر کی نہیں شرم اور ذلت کی بات ہے۔ سرخروئی کی نہیں اللہ کے آگے رسوائی کی بات ہے۔"

"مومی! چپ ہو جائو۔" مما یکدم جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکلی تھیں۔ ان کے لہجے اور آنکھوں سے برہمی جھلکنے لگی۔

"اپنے پاپا کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

"میں پاپا کو برا بھلا نہیں کہہ رہی ہوں مما! میرے دل میں پاپا کا بہت احترام ہے۔ وہ میرے لئے باپ ہونے کے ناتے قابل احترام، قابل عزت ہستی ہیں مگر یہ بات بھی سن لیجئے کہ مجھے پاپا کے اس اثر و رسوخ اور اعلیٰ عہدے پر کوئی فخر نہیں۔ کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ بڑے لوگوں کی پارٹیاں اٹینڈ کر کے ہم بڑے نہیں بن جاتے۔" اس کا لہجہ بڑا متاسفانہ تھا۔ جیسے اسے افسوس ہو رہا ہو طارق احمد کی بیٹی کہلانے پر۔

مما کے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔پتا نہیں دوریوں نے کتنی غلط فہمیاں بخش دی تھیں۔وہ لاکھ خود کو مسرور ظاہر کرتی تھیں مگر ماں ہونے کے ناتے محسوس کر رہی تھیں کہ اس کے بچپن کی محرومیاں اب بھی موجود ہیں جو اسے گاہے بگاہے مشتعل کر دیتی ہیں۔وہ تو خود کو اپنے دل کی عدالت میں اب تک مجرم ہی گردانے ہوئی تھیں۔

وہ اس وقت جس کبیدگی کا شکار تھی وہ در حقیقت اس کی غلط فہمی تھی۔بے شک وہ شائستگی سے ہم کلام تھی ماں سے، مگر اس کی اس شائستگی میں اجنبیت تھی اور یہ اجنبیت زہرہ طارق کے دل پر برچھی کی طرح لگ رہی تھی۔

”تمہارا قصور بھی نہیں ہے بیٹی۔تم اپنے باپ کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو۔“ انہوں نے افسردگی سے سانس کھینچی۔

”آگہی کا ادراک انسان پر بالکل اچانک ہوتا ہے مگر کبھی وقت کی ڈور ہاتھ سے اتنی دور نکل جاتی ہے کہ مداوے، تلافی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔تمہارے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور تمہارے دامن میں ڈالی گئی محرومیوں پر ہم دونوں اپنے اللہ کے سامنے شرمسار ہیں۔ہم ہمہ وقت خود کو ایک مجرم خیال کرتے رہتے ہیں۔مگر مومنہ! تم ایسے مجرم کو کیا سزا دے سکتی ہو جس کی پشیمانیاں اس کے جرم سے بڑھ گئی ہوں۔“ وہ افسردگی سے ہنس دیں۔پھر اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپایا۔

”جانتی ہوں میری بچی کہ تمہارے اس گھر میں آجانے سے صدیوں کی دوریاں کم نہیں ہوئیں۔“

”مما۔آئی ایم سوری۔“ وہ انہیں دل گرفتہ رنجیدہ دیکھ کر خود بھی آزردہ ہو گئی۔

”مجھے اپنے معاملے میں نہ آپ سے شکوہ ہے نہ پاپا سے۔وقت ہر زخم خود ہی بھر جاتا ہے۔یقین کریں مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے مگر۔“ اس نے ایک لحظہ رک کر لب دانتوں میں دبا کر چھوڑے۔

”پاپا کی بے حسی سے شکوہ ضرور ہے جو بااثر ہونے کے باوجود کشمیر کی جدوجہد کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔بلکہ میرے قدموں میں بھی زنجیریں ڈالنا چاہتے ہیں۔کیا انہوں نے مجھے اس لئے ڈاکٹر بنایا ہے کہ میں ان کی طرح محض پیسہ کمانے والی مشین بن جاؤں؟“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ تم اپنے پاپا کو سمجھنے میں غلطی کر رہی ہو بلکہ ایک عرصے تک تو میں بھی انہیں جان ہی نہ پائی۔آؤ ادھر آؤ۔میرے ساتھ۔تمہارے شکوؤں کا جواب وہ تو شاید عمر بھر نہ دیں مگر مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔میں ایک مشرقی، وفاشعار اور شوہر پرست عورت ہوں اور عورت اپنے شوہر پر لگائے گئے الزام کبھی برداشت نہیں کر سکتی چاہے یہ اس کی اپنی اولاد کی طرف سے ہی لگائے گئے ہوں۔ادھر آؤ۔میرے ساتھ۔آج اس راز کو طشت از بام ہو ہی جانا چاہئے۔“ مما یکبارگی جذباتی ہو کر اس کا ہاتھ کھینچنے لگیں۔

وہ حیران پریشان ان کے ہمراہ کھنچتی چلی گئی۔

سیڑھیاں اتر کر وہ اسے ایک اندھیرے کمرے میں لے آئیں۔ یہ شاید کوٹھی کا تہہ خانہ تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار یہاں آئی تھی۔ مما نے سوئچ آن کیا تو پورا کمرا روشنی سے نہا گیا۔ روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں تحیر آمیز بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔

☆...☆...☆

اس کی آنکھیں تحیر آمیز بے یقینی سے اس کشادہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں مختلف قسم کے اسلحے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ کئی طرح کے کارٹن اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں جانے کیا کچھ تھا جو کسی راز کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ بھی ان دیواروں کی طرح گنگ سی کھڑی تھی۔

''دیکھو یہ اسلحہ کشمیری مسلمانوں کو سپلائی کیا جاتا ہے مگر یہ پاکستان سے سمگل ہو کر نہیں آتا بلکہ خود یہاں کی ہندو پارٹیاں سپلائی کرتی ہیں جنہیں صرف پیسے سے سروکار ہے اور ادھر آؤ۔'' مما اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک دوسرے کمرے میں لے گئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا سٹڈی روم تھا جہاں ایک لمبی سی میز رکھی تھی جس پر آڈیو کیسٹ کے انبار لگے تھے۔ ساتھ ہی برقی تاروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جو دیواروں اور چھت سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ فائلوں اور کاغذوں کے پلندے تھے۔ وہ ابھی پچھلے کمرے میں پڑے اسلحے اور انہیں کشمیری مجاہدوں کو سپلائی کرنے کے انکشاف پر ہی دنگ تھی اور اب مما کہہ رہی تھیں۔

''اٹھاؤ یہ کیسٹ اور لگاؤ اسے اس ٹیپ میں۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہیں مما!'' حیرت اور الجھن نے اسے جھنجھلا کر رکھ دیا۔

مما نے خود ہی ایک کیسٹ اٹھائی اور اسے کیسٹ پلیئر میں لگا کر بٹن آن کر دیا۔ دوسرے پل اس پر گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے وہی ترانے گونجنے لگا جو غازی شاہ کی دی ہوئی کیسٹ میں تھا۔

''یہ کیا معمہ ہے مما؟'' اسے اپنی آواز حیرت سے شدت سے بکھرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

''یہ اور اس طرح کی کیسٹس تمہارے پاپا ہی سپلائی کر رہے ہیں۔ آج جو ترانہ بج رہا ہے یہ ترانا'' طارق احمد'' کی اپنی آواز میں ہے۔''

مما کے لہجے میں کیسا فخر بول رہا تھا گویا وہ بیٹی کے سامنے سرخرو ہو رہی ہوں جبکہ مومنہ کے لئے یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ حیرت اور خوشی کی شدت نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ وہ بس ٹکر ٹکر کبھی اس کمرے کو دیکھتی کبھی مما کے چہرے کی طرف پھر یکلخت ان سے لپٹ گئی اور رو پڑی۔

''آج آپ نے مجھے... مجھے کیوں نہیں بتایا آج تک اور پاپا نے بھی چھپائے رکھا اس بات کو۔ کیوں مما؟'' اسے لگا وہ یہ خوشی سہار نہیں پائے گی۔ اس کے وجود پر خفیف سی لرزش طاری تھی۔ مما نے اسے تھام رکھا تھا۔ خود ان کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔

اچانک مومنہ ان کے بازوؤں کے گھیرے سے نکلی' اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں خوشگواری ہمک رہی تھی۔ چہرے کے نقوش میں حیرت اور خوشی کا سنگم بڑا پیارا لگ رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا مما! یہ... یہ سارا کچھ تو میرے گمان، میرے تصور میں بھی نہ تھا۔ مائی گاڈ! میں پاپا کو کتنا غلط سمجھتی رہی، ان سے شاکی رہی۔ کیا خبر تھی وہ اپنے سینے میں ایک کشمیری مجاہد کا دل رکھتے ہیں۔ آئی ایم سو ہیپی مما!" وہ ایک بار پھر ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"مما! پاپا مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟"

"ارے نہیں جان! بالکل نہیں۔ وہ بھلا کیونکر خفا ہوں گے؟" مما نے اس کے آنسوؤں سے تر چہرہ اونچا کیا اور اپنے سکارف سے پونچھنے لگیں۔

"خفا تو تمہیں ہونا چاہئے میری بچی! کہ مجرم تو ہم ہیں تمہارے... تمہاری محرومیوں اور ناآسودگیوں کے مجرم۔" پاپا کی آواز کمرے کی فضا میں ابھری جس میں ندامت ہلکورے لے رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی چونک کر پلٹیں۔ مما لحظہ بھر کے لئے اس کمرے میں اپنی اور مومنہ کی موجودگی پر چور سی بن گئیں مگر طارق احمد کے چہرے کے نقوش میں کسی طرح کی سرزنش نہ تھی۔

مومنہ، طارق احمد کی طرف چلی آئی۔ کچھ لمحے دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے مقابل خاموش کھڑے رہے پھر طارق احمد نے نرمی سے اس کے کندھے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ ان کے چہرے پر نرم، پرشفقت اور مہربان مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ دوسرے پل وہ ان کے سینے سے لگی وہ تمام آسودگی سمیٹ رہی تھی جس سے محروم تھی، جس سے دل کا ایک گوشہ خالی تھا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

اسے لگا اس کے وجود کے اندر کہیں جو ایک خلا تھا وہ پر ہو گیا ہے۔ جس ناآسودگی کے جال نے اسے ایک عرصے سے جکڑ رکھا تھا وہ کٹ گیا ہو۔

جو دکھ، گلہ دل میں آبلے کی طرح ٹپکتا رہتا تھا۔ جس نامانوس سی اذیت کو وہ ہر لمحہ محسوس کرتی رہی تھی وہ چھٹ رہی تھی۔ اب کسی گلے شکوے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ آنکھوں سے بہنے والے بے آواز آنسو اس گرد کو اتار رہے تھے۔

"میں بھی کتنا بے عقل تھا کہ بیٹیوں کو بے کار شے کی طرح سمجھتا رہا تھا۔ بیٹیاں تو پھول ہوتی ہیں۔ گھر میں رہیں تو آنگن کھلا رہتا ہے اور رخصت ہوں تو اپنی خوشبو، اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہیں اور ماں باپ عمر بھر اس معطر خوشبو میں مسرور رہتے ہیں۔ میں اس رحمت سے منہ موڑے رہا کتنا نادان تھا میں۔"

پاپا کہہ رہے تھے اور وہ سن رہی تھی۔ وہ انہیں نادم نہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر بے پایاں مسرت کے احساس نے زبان سلب کر کے رکھ دی تھی۔

سر اٹھا کر اس نے باپ کا چہرہ دیکھا اور نم نم پلکوں کو جھپک کر مسکرا دی پھر اپنے اطراف ایک نگاہ ڈال کر ایک گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"یہ سب کیا ہے پاپا! آپ نے مجھے اس میں شریک کیوں نہیں کیا؟"

"یہ سب..." طارق احمد کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی گہری ہوگئی جس میں ایک بجھی بجھی دل گرفتگی بھی تھی۔

"یہ سب ایک ادنیٰ سی کوشش ہے' اس سرزمین کو آزاد کرانے اور اسے ثمر بار بنانے کے لئے ہمارے خواب' ہمارا درد اور ہماری محبتیں مشترکہ ہی تو ہیں۔ یہاں ہر کشمیری کا دل ایک ساتھ دھڑکتا ہے۔ چوٹ ایک کو لگتی ہے' تکلیف ہر کشمیری کو ہوتی ہے۔ شہید ایک ہوتا ہے تو ہزار لہو بہانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ہم سب شریک ہیں اس جدوجہد میں' یہ حوض کا ٹھہرا ہوا مقید پانی نہیں ہے بلکہ ایک رواں دریا ہے جس کا بہاؤ ایک دن ظالموں کی ان زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا' یہ چڑھتا دریا ظلمتوں کے سارے بند توڑ دے گا۔"

"ضرور' انشاءاللہ۔" مما کی آنکھوں میں ایک عزم ہلکورے لے رہا تھا۔ ان کی نظریں ان باپ بیٹی پر تھیں مگر ذہن لفظوں کو لباس پہنا رہا تھا۔

کچھ دنوں بعد زمانے کی ہوا بدلے گی

ابر کڑکے گا' فضا رنگ وفا بدلے گی

ٹوٹ جائے گا ہر ایک حلقہ زنجیر ستم

بے نواؤں کی آہوں سے فضا بدلے گی

☆...☆...☆

"ماتاجی!" کویتا نے پیار سے ان کے اوپر پڑی چادر کو کھینچا تو انہوں نے چہرے سے چادر ہٹائی۔ چہرہ بخار کی حدت سے لال ہو رہا تھا۔ وہ لرز سی گئیں۔

"کیا بات ہے اور ہسپتال کیوں نہیں گئی۔ تو کتنے دنوں سے چھٹیاں کر رہی ہے۔" انہوں نے اسے سادہ سے کپڑوں میں دیکھا تو ذرا ناگواری سے بولیں۔

"تمہاری طبیعت جو ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ان کے سرہانے بیٹھ گئی۔

"میری چنتا نہ کر... یہ طبیعت اب سنبھلے گی نہیں۔ اس گھر میں ایسا اپمان ہوا ہے بھگوان کا۔"

"کوئی اپمان نہیں ہوا اماں! یہ سارے ہمارے اپنے ایمان کی کمزوری ہے کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے معبودوں سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں خود ان کا اپنا جیون بھی نہیں ہے۔ کیا تیرا من پرشاد اور ڈنڈوت کے بعد شانت ہو جاتا ہے۔ کیا تیری آتما کو اس پوجا پاٹ سے آرام ملتا ہے؟"

"بس کر کوی' چپ ہو جا... چپ ہو جا۔ تجھے تیرے پربھو کا واسطہ چپ کر جا۔" ماتاجی زرد پڑتے چہرے اور کانپتی آواز میں چلائی۔ جانے کویتا کی باتوں میں کیا ہوتا تھا... شاید سچ۔

انہیں ایسا لگتا کوئی ان کی رگ رگ کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ ان کے اعصاب پر مضراب مار رہا ہے۔

سچائی کی ان دیکھی آگ تھی جو انہیں چاروں طرف سے گھیر رہی تھی مگر بھسم نہیں کر رہی تھی بلکہ ذہن کے دریچوں کو دھڑا دھڑ کھولنا چاہتی تھی مگر وہ اپنا ذہن' دل اور کان سب اسی طرح بند رکھنا چاہتی تھیں جس طرح ایک عرصے سے بند تھے۔

''اس سنسار میں ہزاروں معبود ہیں' سب اپنے اپنے معبود کو حق پر سمجھتے ہیں پر سوچ ماں کہ ان معبودوں کی بساط کیا ہے۔ یہ انسانوں کے ہاتھوں سے تخلیق پانے والے ہیں۔ چاند سورج کے پجاری' اصنام کے پجاری' آگ اور پہاڑوں کے پجاری ان سب کا تو کوئی نہ کوئی محرک ہے جو انہیں متحرک رکھتا ہے اور اگر انہیں کوئی متحرک رکھتا ہے تو اس کا مطلب ہے کوئی اس سے بھی بڑی شکتی ہے جو انہیں متحرک رکھتی ہے۔ یہ تو ثابت ہے نا کہ ہر متحرک کے لئے کسی محرک کی ضرورت ہے تو ضرور تمام اجسام کا سلسلہ کسی ایک ایسے وجود پر ختم ہوتا ہے جو خود متحرک نہیں کیونکہ اگر وہ بھی متحرک ہو تو اس کے لئے بھی محرک کی ضرورت ہو گی اور محرک اول جو خود متحرک نہیں اور تمام اشیاء کی حرکت کا باعث ہے' وہ ''خدا'' ہے جس کا وجود ازلی ہے۔ اس کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں ہے' ہر زندہ' مردہ چیز سے پہلے وہی ہے۔

''تو سوچ ماں کہ ایک بچہ ماں کے بطن میں جیون کیسے پاتا ہے' کون اسے زندہ رکھے ہوتا ہے۔ وہ باہر آتا ہے تو اسے منہ کھول کر دودھ پینا کیسے آجاتا ہے۔ سوچ ماں' یہ اتنی بڑی کائنات کا ظہور اور تخلیق محض اتفاق ہو سکتا ہے؟ جبکہ ایک چھوٹا سا کمرہ بھی اس سازوسامان کے ساتھ خود بخود مرتب نہیں ہو سکتا تو یہ اتنی بڑی کائنات کسی طاقت کے بغیر کس طرح پیدا ہو گئی۔ اسے اتنے منظم طریقے سے کون چلا رہا ہے' یہ نظر آتے معبود...

نہیں کوئی بڑی شکتی ہے جو نظر نہیں آتی مگر ہر جگہ موجود ہے۔ واحد' لاشریک ہے تو پھر ماں! ہم اس کے ساتھ کسی ایسے کو شریک کس طرح کر لیں جس کا محرک انسان کی اپنی کاریگری ہو۔''

چپ کر جا کویتا! چپ کر جا۔'' ماتا جی زور زور سے چلانا چاہ رہی تھیں مگر ان کی آواز کسی کمزور لہر کی طرح اندر ہی ابھر کر ڈوب گئی۔ کویتا ان کے آگے پڑے اندھے کالے پردے ہٹائے جا رہی تھی۔ ایک انوکھی روشنی سے آشنا کر رہی تھی۔ ان کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ پتا نہیں روشنی تیز تھی یا ابھی ان کی بینائی کمزور تھی۔

''ماں! حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ اور بستی والوں کی بت پرستی سے بے زار تھے' وہ کہتے تھے کہ آخر پتھر کی خود تراشیدہ مورتیاں خدا کس طرح بن گئیں۔ تمہارے باپ دادا گمراہ اور بے وقوف تھے مگر تم تو گمراہ نہ بنو۔

''ایک بار جب بستی کے یہی بت پرست لوگ شہر سے باہر میلے میں گئے تب حضرت ابراہیمؑ نے بت خانے میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالا۔ صرف ایک بت کو باقی رہنے دیا جو تعظیم و تکریم میں ان کے نزدیک سب سے بڑا تھا اور جس کلہاڑی سے توڑا تھا وہ اس بڑے بت کے گلے میں لٹکا دی۔

''وہ لوگ جب واپس آئے تو بڑے برافروختہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر لائے اور ان سے دریافت کیا تو وہ فرمانے لگے کہ ''مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ فرض کر لیا جائے کہ اس بڑے گرو گھنٹال نے جو صحیح و سالم کھڑا ہے اور توڑنے کا آلہ بھی اس کے پاس موجود ہے یہ کام کیا ہو گا۔ اب آپ لوگوں کے پاس کیا دلیل ہے کہ ایسا نہیں ہوا؟ کیا دنیا میں ایسا نہیں ہوتا کہ بڑے سانپ چھوٹے سانپوں کو' بڑی

مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے اس لئے بہترین صورت میرے تمہارے درمیان فیصلہ کی یہ ہے کہ تم خود اپنے ان معبودوں ہی سے دریافت کرلو کہ ماجرا کس طرح ہوا۔

”تو وہ بولے کہ تم جان بوجھ کر ہم سے ایسی ناممکن بات کا مطالبہ کیوں کرتے ہو‘ کہیں پتھر بھی بولتے ہیں؟ تو حضرت ابراہیمؑ فرمانے لگے کہ ”تو پھر تم لوگ اس کی پوجا کیوں کرتے ہو‘ پتھر پوجنے سے کیا حاصل‘ جو مورتی ایک لفظ نہ بول سکے‘ کسی آڑے وقت میں کام نہ آسکے ذرا برابر نفع ونقصان اس کے اختیار میں نہ ہو اسے خداتعالیٰ کا درجہ دے رکھا ہے۔“

کویتا ذرا دیر رکی اور ماتاجی کا زرد پھیکا بے رنگ چہرہ دیکھا جہاں پسینہ ہر مسام سے پھوٹتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”ماں! میں نے رات کی تاریکیوں میں اسے دعا میں پکارا ہے تو اس نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ میرے دل کے اندر رہ کر وہ سنتا ہے ماں!... صرف وہی سنتا ہے‘ وہی پرماتما ہے‘ وہی تیرا میرا سب کا پربھو ہے‘ باقی سارے بھان متی‘ ماں تو چلنا میرے ساتھ مولوی جی کے پاس۔ وہ تیرے من میں بھی شانتی بھر دیں گے۔ وہ راستی کا ایسا مینارہ ہیں ماں جس کے پاس جاکر ہمارا اندر باہر روشن ہو جاتا ہے۔ سب صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ماتاجی کا سر دبانے لگی۔

کویتا کے لفظوں کے یہ سرخ انگارے ان کے دل میں ایک نیا احساس جگا رہے تھے۔ ان کی بینائی کچھ تیز ہونے لگی۔

”کویتا۔“ ان کی آواز پر بھی لرزہ طاری تھا۔ کویتا ان کے چہرے پر جھکی۔

”ہاں بول ماں؟“

”کوی! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے تو مجھے چلتے چلتے اچانک شعلوں میں دھکیل گئی ہے۔ میرے اندر کوئی الاؤ دہک رہا ہے۔“ ان کی آواز ایسی کربناک تھی جیسے وہ تڑپ رہی ہوں۔ بن پانی کی مچھلی کی طرح یہاں وہاں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں مگر سامنے پھیلا اندھیرا چھٹ نہ رہا ہو۔

”یہ وہ شعلے نہیں ہیں ماں! یہ ایسی آگ ہے جو بھسم نہیں کرے گی‘ تجھے راکھ نہیں کرے گی بلکہ یہ چمکتی روشنی ہے‘ دہکتا الاؤ نہیں۔

”یہ راستی کی بجلیاں ہیں۔ سچائی کی آگ ہے جو حضرت موسیٰؑ کو دکھائی دی تھی۔ ہاں یہی... یہی تو میں تیرے اندر بھی اتارنا چاہتی ہوں۔ یہی آگ تو میرے اندر اتری تو مجھے اندھیرے اور روشنی کا فرق سمجھ آیا۔ وہی تو روشنی بن کر میری راہ کے سارے اندھیارے کاٹتی گئی ہے۔“

اس نے ماتاجی کی طرف دیکھا پھر چپ ہو گئی۔ ماتاجی عجیب عقیدت اور محبت سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں۔ ان کے سوکھے پپڑی زدہ لبوں کی تراش میں ہلکی سی مسکراہٹ کرن کی طرح پھوٹی پھر انہوں نے اپنی دونوں لرزیدہ ہتھیلیاں اوپر اٹھائیں اور کویتا کے چہرے کے گرد پھیلا دیں۔

”تجھے اتنی سندر باتیں کرنی‘ اتنا اچھا بولنا کیسے آگیا کویتا؟ اوش کوئی بڑی شکتی تیرے من کے اندر آٹھہری ہے جس نے اتنا وشواس بھر دیا ہے تیرے من میں۔“

"نہیں ماں، ابھی تو صرف الف پڑھا ہے یہ اعجاز تو مولوی جی کا ہے، یہ باتیں تو وہ کرتے ہیں۔ میں تو صرف ان کا حرف حرف سناتی ہوں۔"

"کوی! تو جیت گئی، میں ہار گئی... ہاں کوی، میں ہار گئی۔" وہ آہستگی سے بولیں جیسے کوئی مجرم اپنے سارے ہتھیار پھینک کر اپنے جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔

کویتا نے تحیر آمیز بے یقینی سے ماتا جی کو دیکھا۔ اس کے لب ہلے مگر فرط مسرت سے جیسے قوت گویائی سلب ہونے لگی۔ لب صرف کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے پر رکھ لیے۔

"جس طرح کوئی ماں اولاد کا برا نہیں چاہ سکتی اسی طرح شاید کوئی بیٹی بھی اپنی ماں کا برا نہیں چاہتی ہو گی۔ تو جیت گئی کوی!"

"ماں!" کویتا ان کے ہاتھ چومنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بے آواز بہہ نکلے جیسے کوئی جھرنا پھوٹ نکلا ہو۔

"نہیں ماں تو ہاری نہیں ہے بلکہ ہار تو جھوٹ کی ہوئی ہے، باطل کی ہوئی ہے ہار تو ظلمت کی ہوئی ہے۔ تو یا میں نہیں جیتے بلکہ جیت سچ کی ہوئی ہے، حق کی ہوئی ہے۔" اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ وہ ماتا جی کا چہرہ چومے جا رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹی رو رہی تھیں مگر یہ آنسو حق پا لینے کی خوشی کے تھے۔

☆...☆...☆

مومنہ، طارق ہاؤس سے سیدھی خضر محمد کی طرف پہنچی، وہ اپنی اس بے پایاں مسرت میں بخت بی بی او مولوی جی کو شامل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا یہ انکشاف ان دونوں کے لئے یقیناً حیران کن ہی نہیں مسرت انگیز بھی ہو گا۔ طارق احمد کی ذات کا یہ پہلو انہیں خوشی سے ہمکنار کر دے گا۔

وہ مسرور اندر میں پہنچی تو ایک خوشی خود اس کی منتظر تھی۔ سفید سکارف باندھے کویتا، بخت بی بی سے قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔

وہ دہلیز پر ہی گنگ رہ گئی۔ اسے لگا وہ دروازہ کھولتے ہی یک لخت کسی گلستان میں آ گئی ہو۔ جہاں ٹھنڈی فرحت انگیز ہوا اس کے بدن سے ٹکرا کر اس کی روح کو معطر کر گئی ہو۔ اٹک اٹک کر پڑھنے والی کویتا کی آواز کسی ٹھنڈی پھوار کی طرح اسے اپنی سماعت میں اترتی محسوس ہونے لگی۔

اس کی متحیر اور مسرت بھری نگاہوں سے کویتا کی نظریں ملیں تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کویتا نے بھی ایک ہلکی سے مسکراہٹ اچھالی اور دوبارہ بی بی کو سبق سنانے لگی۔

مومنہ اندر آ کر فرش پر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ جب وہ قرآن پاک بند کر کے اٹھی تو وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

"کوی... یہ... یہ اتنی بڑی خبر تو نے مجھے اب تک کیوں نہیں بتائی؟" اس کی آواز اندرونی خوشی سے مرتعش ہو گئی۔

"اوں ہوں... کویتا' نہیں عائشہ!" وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

مومنہ نے دیکھا اس کی سیاہ گھور آنکھوں میں آج کوئی اضطراب' وحشت رقم نہیں تھی بلکہ وہ ایسی پر سکون جھیل کے مانند دکھائی دے رہی تھیں جہاں شام کا ٹھنڈا سایہ اتر آتا ہے۔

جب دھوپ کی تمازت ہار جاتی ہے اور درختوں کے لمبے لمبے سائے اس جھیل کو اپنی چھاؤں سے ڈھانپ لیتے ہیں تب وہ اور زیادہ خوش نما اور پر سکون دکھائی دیتی ہے۔

"ماتاجی' بھی مسلمان ہو گئی ہیں۔" وہ مومنہ کے ساتھ والی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولی تو مومنہ اس انکشاف پر اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر ایک گہری سانس کھینچ کر خوشی کے بے پایاں احساس سے ہنس پڑی۔

"تم نے مجھے عجیب سی خوشی دے دی ہے کوی' سوری عائشہ' مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں اسے کس طرح سیلیبریٹ کروں۔" وہ ہنستی ہوئی اپنی آنکھوں کے گوشے سے پھسلنے والے قطروں کو سکارف کے کناروں سے پونچھنے لگی۔

"اسے ہم سب مل کر سیلیبریٹ کریں گے یعنی آج رات کا کھانا عائشہ ہمارے ساتھ کھائے گی۔" بخت بی بی بولیں تو مومنہ چٹکی بجاتی چوکی سے اچھل کر اٹھی۔

"گڈ... یہ آئیڈیا اچھا ہے پھر کیا خیال ہے بی بی! آج ہم دونوں نکمی لڑکیاں آپ کا باورچی خانہ نہ سنبھال لیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے کویتا کی طرف دیکھا جو مسکرا دی اور سر ہلا کر چوکی سے اٹھ گئی۔

"ہاں بی بی' کچھ ہمارے گر بھی تو کھلنے چاہئیں نا آپ پر۔ اب ہم اتنے برے کک بھی نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ شوخ اور کھنکتا ہوا تھا۔ وہ دونوں بی بی کے نہ نہ کرنے کے باوجود باورچی خانے میں جا گھسیں مگر کتنی دیر تو دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کام کہاں سے شروع کیا جائے اور کیا پکایا جائے۔

بی بی تخت پر بیٹھیں ان دونوں کو الجھتے سلجھتے دیکھتی رہیں اور ہنستی رہیں مگر سر شام وہ دونوں کافی چیزیں بنا کر دستر خوان پر سجا چکی تھیں۔ مولوی خضر محمد نے ان کی بنائی ہر چیز کی دل کھول کر تعریف کی' بی بی نے بھی سراہا۔

"بھئی مان گئے کہ تم دونوں صرف ڈاکٹرز ہی نہیں گھریلو لڑکیاں بھی ہو۔ زخموں کا اندمال کرنا ہی نہیں آتا معدے کا اندمال کرنا بھی جانتی ہو۔" بی بی کی بات پر وہ دونوں محظوظ ہو کر ہنسی تھیں۔

☆...☆...☆

آج صبح ہی صبح مومنہ کو قدرت نے بڑا سنہرا موقع فراہم کر دیا تھا۔ سٹور کی چابی اس کے ہاتھ لگ گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ سریش چابی کا گچھا لئے ایم ایس کے کمرے میں آیا۔ وہ ڈاکٹر سنیل کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر سنیل ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا اور وہ اس وقت ایم ایس کے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے سریش کے ہاتھ سے چابیاں لے لیں کہ وہ ڈاکٹر سنیل کو دے دے گی۔ پھر سریش کے جاتے ہی وہ خود بھی سرعت سے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کا رخ پارکنگ لاٹ کی طرف تھا جہاں اس کی گاڑی موجود تھی۔ گاڑی

میں بیٹھے ہوئے اس نے ارد گرد نظریں دوڑائیں تقریباً سنسان تھا۔یوں بھی اس نے اپنی گاڑی داخلی دروازے سے خاصی دور جنگلے کے کنارے پر پارک کی تھی۔ارد گرد سے مطمئن ہو کر اس نے جلدی سے گچھے سے سٹور کے دروازے کی چابی علیحدہ کی اور اپنے پرس سے ویکس بار نکال کر بڑی پھرتی سے اس کے دونوں رخ پر چابی کی چھاپ اتارنے لگی پھر چابی دوبارہ اس گچھے میں ڈال کر ویکس بار پرس میں ڈال دیا اور گاڑی سے باہر آگئی۔

"سریش! بھئی ڈاکٹر سنیل تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دیئے ہیں۔ہو سکتا ہے کافی بار چلے گئے ہوں، تم یہ چابیاں خود ہی انہیں دے دینا۔" اس نے چابیوں کا گچھا سریش کو پکڑا دیا۔

وہ خود ڈاکٹر سنیل کو دینے کا رسک نہیں لے سکتی تھی۔اب اس نے سوچا اک ذرا سی غفلت کتنے بڑے نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔اسے ڈاکٹر سنیل کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر خاصی حیرت بھی تھی۔بہر حال اس کی یہ غیر ذمہ دارانہ حرکت اس کے لئے اللہ کی مدد ہی تھی۔بے شک وہ اتنا قادر المطلق ہے جب اور جس طرح چاہے بندوں کی مدد کرتا ہے۔

☆...☆...☆

شام کو وہ سیدھے غازی شاہ کی طرف چلی گئی۔ویکس بار اور ہسپتال کے اندرونی حصے کا نقشہ پنسل سے کاغذ پر بنا کر اسے تھمایا۔سٹور تک آنے والے مختلف راستوں کا نقشہ اس

نے بے حد عمدگی سے بنایا تھا۔غازی شاہ کے ساتھ طلحہ احمد بھی اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

"ابھی سراہنے کا وقت نہیں آیا کمانڈر، ابھی تو میں نے کیا ہی کچھ نہیں ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے اس تحسین کو گویا رد کرتے ہوئے بولی۔

"قابل تحسین تو وہ ہیں جو اپنا لہو اس چراغ میں ڈال گئے۔اینی وے، میرا خیال ہے، آپ لوگوں کو اس راستے سے آنے میں قدرے آسانی ہو گی۔ہسپتال کا یہ حصہ عموماً سنسان رہتا ہے۔گاڑیوں کی بھی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے، ایک جنگلا ہے اس پر چڑھ کر ہسپتال کی دیوار کو پھاندا جا سکتا ہے۔"

"نہیں، میرا ذہن مختلف خطوط پر سوچ رہا ہے۔" غازی شاہ نے پر خیال انداز میں نقشے سے سر اٹھایا تو دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو طلحہ! ہمیں دوائیوں کے باقاعدہ سٹاک چاہئے ہوں گے۔ظاہر ہے جب اتنا بڑا رسک لیں گے تو چند دوائیوں کے لئے تو نہیں نا۔اس طرح چوری چھپے جا کر میرا نہیں خیال کہ ہم اپنے مقصد میں عمدگی سے کامیاب ہو سکیں گے۔"

"تو تمہارے خیال میں ہمیں سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت کرنا ہو گا۔اندر اپنا کوئی آدمی بھیج کر... طلحہ احمد نے جیسے اس کا خیال پڑھ لیا۔

غازی شاہ کے سرخ لبوں کی تراش میں تحسین آمیز مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی "ہوں۔"

"تو کیا یہ خطرے والی بات نہیں ہو گی؟" مومنہ قدرے تشویش سے بولی۔

"سرجن! ہم خطروں میں تو دن رات ہی گھرے رہتے ہیں اور خطرے سے ڈر کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تو نہیں رہیں گے۔ میں غازی شاہ کے آئیڈے سے متفق ہوں۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟" مومنہ نے غازی شاہ کو دیکھا جو گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے سوال پر ایک ہنگارا ابھرا پھر کاغذ کو سمیٹ کر تہ کرنے لگا جس پر مومنہ نے نقشہ بنایا تھا۔

"تمہیں ایک مریض کو بہت اچھی طرح ڈیل کرنا ہو گا۔ اس کے زخموں پر توجہ دینا ہو گی مگر وہ خالص تمہارا مریض ہو گا اور اب یہ تمہاری صلاحیتوں کی آزمائش ہو گی کہ تم اسے کس طرح دوسرے ڈاکٹرز کی نظروں سے بچا کر کسی قسم کا شک پیدا کئے بغیر علاج کرتی ہو۔" غازی شاہ کی آنکھوں میں پراسرار سی چمک تھی۔

ایک دو پل مومنہ کو سمجھنے کے لئے لگے پھر وہ یکدم ہنس پڑی۔

"تھینک یو کمانڈر! انشاءاللہ میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کروں گی مگر مریض کو بھی ذرا تیز قسم کے آلات کی تکلیفیں سہنا ہوں گی۔ حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے۔" اس کی بات پر غازی شاہ اور طلحہ دنوں ہنس پڑے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

غازی شاہ کی سنہری آنکھوں میں مومنہ کے لئے وہی مانوس سے رنگ پل بھر کر بکھرے تھے۔ گلابی سکارف میں اس کا چہرہ بڑا دل موہ لینے والا تھا جس پر غازی شاہ کی لمحہ بھر کی محویت نے گلال سے بکھیر دیئے تھے۔ وہ سرعت سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"اوکے کمانڈر اینڈ طلحہ احمد پھر ملیں گے۔"

غازی شاہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا۔

"ڈاکٹر سنیل سے ایک حد تک فاصلہ رکھ کر اپنے کام نکالنے کی کوشش کیا کرو۔" وہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک بولا تو پرس سے چابی نکالتے ہوئے وہ ٹھٹکی۔

"بڑا گھٹیا قسم کا ڈاکٹر ہے' اس کی رپورٹیشن کچھ اچھی نہیں ہے۔ دل پھینک قسم کا آدمی ہے وہ۔" وہ اس کی اٹھنے والی نگاہوں پر وضاحت دیتا ہوا بولا۔

وہ ہلکے سے ہنس پڑی۔ "اگر دل پھینک قسم کا نہ ہوتا تو اتنا غیر ذمہ دار بھی نہ ہوتا۔"

اس کا اشارہ چابی کی چھاپ اور فائل کی طرف تھا۔ غازی شاہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گیا مگر دوسرے پل یہ مسکراہٹ ختم ہو گئی۔

"بہر حال' اسے ذرا کم ہی لفٹ دیا کرو تو اچھا ہے۔"

مومنہ نے محسوس کیا اس کے لہجے میں رقیبانہ سی تپش تھی۔

"بڑا رومانٹک قسم کا آدمی ہے۔ گیت کبت سے بھی شغف رکھتا ہے ویسے ہسپتال کے سڑے ماحول میں اس کی صحبت ذہن و دل دونوں پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔" وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

"ہاں' ظاہر ہے میرے جیسے خشک بندے سے تمہارے ذہن و دل کا ماحول کیا گلستان ہو گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"چچ... چچ... دانا کہتے ہیں نا جل کر کباب ہونے سے بہتر ہے' آدمی کھل کر گلاب ہو جائے۔" اس نے جھک کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے شرارت آمیز نظروں سے اسے دیکھا پھر جلدی سے بولی۔ "خیر' اتنا دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے کمانڈر! دانا یہ بھی کہتے ہیں کہ آنکھیں روح کی کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان میں جھانکنا سیکھئے' دھوکے سے محفوظ رہیں گے اور مجھے یہ فن آتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

غازی شاہ نے فرنٹ ڈور پہ ہتھیلیاں جما کر جھک کر اسے گھور کر دیکھا۔ "یہ بات تم گاڑی سے باہر نکل کر کہتیں تو میں زیادہ غور سے سنتا۔ ویسے بائی داوے تمہیں یہ فن کب اور کیسے آیا؟۔" اس نے اپنی مسکراتے کھلے گلاب جیسے چہرے پر جما دیں جن میں ایسی لپک اور گہرائی تھی کہ ان میں ڈوب جانے کا خوف ابھرنے لگا۔

مومنہ طارق نے نگاہوں کا زاویہ جلدی سے بدل لیا اور ایک گہری سانس کھینچ کر اگنیشن میں چابی ڈال کر گھمائی۔

"یہ بچپن کے کسی آشنا' سنگی ساتھی کی صحبت کا اعجاز ہے۔" بے حد آہستگی سے وہ گویا ہوئی دوسرے پل ایکسی لریٹر پر پیر رکھ دیا۔ وہ جھٹکے سے ہٹا تھا اور کچھ کہتا' وہ تیزی سے گاڑی بھگاتی لے گئی۔

وہ ہونٹ بھینچے' اس دھول کو کھڑا کتنی دیر دیکھتا رہا۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اس کی موجودگی کا احساس معطر جھونکے کی طرح اس کے آس پاس پھیلا رہا۔

طلحہ احمد کا ہاتھ اپنے کندے پر محسوس کر کے وہ چونکا اور اس خوشبو کے گھیرے سے باہر نکلا پھر قدرے خفیف سے انداز میں ہنس دیا۔

اس کی ہنسی کے ساتھ اس کی آنکھوں کی سطح پر بھی بڑی معصومانہ خفت تھی جو طلحہ احمد کو بڑی پیاری لگی۔ بالکل اس چراغ کی لو کی طرح جو ننھے سے بے ضرر شعلے کے ساتھ نیم تاریکی میں جگر جگر کر رہا ہو۔

"تیار ہو جاؤ طلحہ! مریض بننے کے لئے۔" اس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

"اصولاً تو مریض تمہیں ہونا چاہئے تھا۔" طلحہ احمد نے معنی خیز سانس کھینچی۔

غازی شاہ نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا پھر ہنستے ہوئے اس کی گردن دبوچ کر اندر کی طرف مڑ گیا۔

☆...☆...☆

مومنہ نے آج صبح سے چھ مریض اٹینڈ کیے تھے جن میں ایک طلحہ احمد بھی تھا۔ سفید پلاسٹر میں اکڑی ٹانگ کے ساتھ وہ کسی دوسرے سرکاری ہسپتال سے دل برداشتہ ہو کر ادھر آیا تھا۔

وہ اوپی ڈی سے فارغ ہو کر راؤنڈ لینے وارڈ میں آئی اور جنرل وارڈ کے بیڈ نمبر تین پر رکتے ہوئے بے اختیار اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

سپاٹ چہرے کے ساتھ لیٹے ہوئے طلحہ احمد نے بھی اسے دیکھا' رسمی انداز میں سلام کر کے نقاہت آمیز انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے پلاسٹر کا معائنہ کرنے لگی پھر نرس کے ہٹ جانے کے بعد آہستگی سے بولی

''خوش آمدید طلحہ احمد۔''

اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور ہلکے سے جواباً مسکرایا ''تھینک یو' ویسے آپ کو مجھے یہاں دیکھ کر دکھ ہوا ہو گا کہ میری جگہ کسی اور کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔'' اس کے انداز میں شرارت تھی جبکہ اس کی شرارت کا پس منظر جان کر اس کے رخساروں پر موجود سرخی تیز ہو گئی۔

''کس اصول کے تحت کسی اور کو ہونا چاہئے تھا؟'' وہ اس کی فائل کھول کر ایکسرے وغیرہ چیک کرنے لگی۔

''اصول وصول کی تو مجھے خبر نہیں بس یونہی سوچا کہ ڈاکٹر آپ ہیں تو مریض کچھ غلط آ گیا۔''

''دیکھو' یہ جو تمہاری دوسری ٹانگ بچی ہے نا اس پر کہیں سچ مچ کا پلاسٹر نہ آ جائے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورنے لگی۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

''تم یہاں ہو اور میں تمہیں اوپی ڈی میں دیکھنے گئی تھی۔ ڈاکٹر سنیل کہہ رہے تھے تم جا چکی ہو۔'' کویتا کندھے پر بیگ لٹکائے اپنا گاؤن ہاتھ میں پکڑے چلی آئی۔

''کچھ مریض ایڈمٹ کئے تھے انہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔'' وہ کویتا کی طرف پلٹی۔ ''یہ ڈاکٹر سنیل میری بڑی جاسوسی کرتے ہیں۔''

''ہاں مگر وہ بھی غلط...'' کویتا نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ لگایا مگر اچانک اس کی نظر بیڈ پر سوئے ہوئے طلحہ احمد پر پڑی تو اس کی ہنسی تھم گئی۔

اس کی نگاہوں میں شناسائی کی چمک لہرائی۔ طلحہ احمد اسے پہلے ہی وارڈ میں داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اسے اعصابی جھٹکا ضرور لگا تھا مگر اس کی خوش نما آنکھوں میں کسی طرح کی شناسائی کی رمق تک نہ پھوٹی تھی۔

اس نے اپنے اعصاب پر سکون رکھے ہوئے محض خالی نظروں سے اسے دیکھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔

اس کے یوں آنکھیں موند لینے پر کویتا کے چہرے پر تاریک سا سایہ آ کر گزر گیا۔ تیزی سے دھڑکتا دل جیسے ایک دم بند ہو گیا تھا۔

''آج سے تمہاری نائٹ ڈیوٹی ہے نا وارڈ میں؟'' مومنہ دوسرے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی مگر کویتا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر پلٹی تو اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکا۔ وہ اپنی جگہ ایستادہ طلحہ کو تکے جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟۔" اس نے جلدی سے کویتا کا کندھا ہلا کر اس کی توجہ ادھر سے ہٹانی چاہی۔

"اوہ' آں... ہاں!" کویتا یوں چونکی جیسے کسی نے اسے ٹرانس سے باہر نکال لیا ہو۔ ایک گہری سانس کھینچ کر اس نے مومنہ کی طرف رخ کیا۔

"اس مریض کو تم نے آج ہی ایڈمٹ کیا ہے غالباً؟"

"ہاں' اس کے پیر کے دو آپریشن ناکام ہو چکے ہیں اب جو ہوا ہے' میرے خیال میں یہ کامیاب ہے مگر وہ خود ہوپ فل نہیں ہے سو دل برداشتہ ہو کر اس ہسپتال میں آیا ہے۔" مومنہ اسے بتانے لگی مگر

دوسرے پل اس کے اعصاب کو بری طرح جھٹکا لگا جب کویتا اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک مجاہد ہے۔"

"تم' کیسے جانتی ہو' میرا مطلب ہے یہ بات تم وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟" وہ اسے دیکھے گئی۔

"جاننا... جاننا تو صدیوں کا عمل ہے اور میں تو اس کے نام تک سے واقف نہیں ہوں۔" وہ ہلکے سے ہنسی' عجیب خود استہزائیہ ہنسی تھی پھر مومنہ کے چہرے پر پھیلی الجھن محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک بار میرے گھر میں دیوار پھاند کر اترا تھا۔ اس کے پیر میں گولی لگی تھی۔ وہ گولی میں نے ہی نکالی تھی۔ کہیں یہ وہی زخم تو نہیں بگڑ گیا اس کا۔" اس کے لہجے میں تشویش اتر آئی۔ اس نے رخ موڑ کر طلحہ احمد کی طرف دیکھا جو ہنوز آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اس کے دونوں کسرتی بازو سینے پر بندھے ہوئے تھے۔

"آؤ نیچے چلتے ہیں۔" مومنہ کسی خوف سے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر سرعت سے وارڈ کے داخلی دروازے سے نکل گئی۔

کویتا کا طلحہ احمد کو مجاہد کے روپ میں جان لینا اس کے لئے بے حد تشویش کی بات تھی۔

وہ سرفروش' جان ہتھیلی پر لے کر جس مقصد کے لئے یہاں تک آیا تھا اس میں معمولی لغزش بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

"اس کا نام کیا ہے مومنہ؟" کویتا کی سوئی تو جیسے وہیں اٹک گئی۔

او پی ڈی میں آکر اپنا گاؤن کرسی سے اٹھاتے ہوئے مومنہ نے یونہی اسے دیکھا "کس کا نام؟۔" وہ قطعی انجان بن گئی اور اپنے بیگ پر جھک گئی۔

"اسی مریض کا نام جس کے متعلق میں تمہیں بتا رہی تھی!"

مومنہ کے چہرے پر تغیر رونما ہوا' تاہم کویتا اس کی طرف متوجہ نہ تھی۔ وہ تو کسی اور ہی خیال کے جہان میں اتری ہوئی تھی۔ جو تصویر وہ دن رات چلتے پھرتے دیکھتی رہتی تھی تصور کے پردے پر جو رنگ بھر گئے تھے وہ یک لخت زندہ ہو کر سامنے آگئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ صحرا میں چلتے چلتے ایک موڑ کاٹتے ہی نخلستان میں اتر گئی ہو' وہی سبزہ زار کا حسین منظر...

اس کا دل تمناؤں کے سیل رواں میں بہنے لگا تھا۔ وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ اس کا دل ایک سکول گرل کی طرح کیوں اس شخص کو دیکھ کر دھڑکنے لگا تھا۔

"شاید طلحہ احمد ہے۔" مومنہ جھکے سر کے ساتھ بولی "طلحہ...!"

"طلحہ احمد!" کویتا کو لگا مومنہ نے اس کے دل پر مضراب مار دیا ہو۔ اس کی روح کے ساز کو چھیڑ دیا ہو اور عجیب ناآشنا مگر مدھر موسیقی بج اٹھی ہو۔

"طلحہ احمد!" اس نے بہت آہستگی سے یہ نام زیر لب دہرایا پھر سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں زور سے میچ لیں۔

"تو لیڈیز! آپ یہاں براجمان ہیں ہم تو سمجھے کہ آپ کی سواری باد بہاری جا چکی ہے۔" ڈاکٹر سنیل کی بے وقت آمد نے دونوں کو چونکا دیا۔ وہ مخاطب مومنہ سے ہی تھا۔

"آپ نکالنے کے درپے ہیں تو بس جایا ہی چاہتے ہیں" وہ ہلکے سے ہنسی۔ ڈاکٹر سنیل سے اپنائیت برتنا اس کی مجبوری بن گئی تھی۔

"ارے رے' اب ایسے وار تو نہ کیجئے۔ ہم اور آپ کو نکالنے کے درپے ہوں۔ ارے ہمارے من کی تو خواہش ہے کہ آپ سانجھ سویرے ہمارے سامنے ہی رہا کریں۔" ڈاکٹر سنیل ایک ٹھنڈی سانس لے کر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا پھر میز کے اوپر... انگلیاں مارتے ہوئے گنگنانے لگا۔

"تم سامنے بیٹھے رہو

پلکیں میری جم جائیں"

"یہ اچھی کہی آپ نے ڈاکٹر سنیل! سانجھ سویرے۔" کویتا نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر سنیل کی طرف رخ کیا۔ "یوں تو یہ بے چاری ماری جائے گی صبح و شام مریضوں کو بھگتاتے بھگتاتے۔"

کویتا کی بات پر ڈاکٹر سنیل کا قہقہہ خاصا برجستہ تھا "بھئی' میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے۔ میں تو کسی اور حوالے سے کہہ رہا تھا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ایک مخمور نگاہ مومنہ پر ڈالی۔

"کچھ شعر ذہن میں آرہے ہیں اس حوالے سے' ارشاد کروں۔" اس نے بظاہر مخاطب کویتا کو ہی کیا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی کورنش بجا لائی اور اندھے کو کیا چاہئے۔ ڈاکٹر سنیل کا خمار آنکھوں کے ساتھ لہجے میں بھی کروٹیں لینے لگا۔

نظر کے سامنے حسن بہار رہنے دے

جمال دید کو پروردگار رہنے دے

سوال شوق کا کوئی جواب ہو کہ نہ ہو

ہمارے دل میں امید یار رہنے دے

یہ چاند اور نئے خواب کیوں دکھانے لگا

بس ایک خواب نگاہوں میں بار رہنے لگا

”میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔ادھر ممانے مجھے سو جوتے لگوانے ہیں۔میں نے انہیں ٹھیک دو بجے کا ٹائم دیا تھا اور اس وقت ہو رہے ہیں تین بج کر بیس منٹ“

مومنہ نے بڑی سرعت سے ڈاکٹر سنیل کی طرف سے رخ موڑ کر کویتا سے کہا پھر مشترکہ دونوں کو ہاتھ ہلاتی ہوئی جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

اس میں اب مزید بے سر اراگ سننے کی طاقت نہیں تھی۔جسمانی تھکن سے زیادہ ذہنی تھکن نے اسے بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔

وہ طارق ہاؤس آئی تو ملازمہ سے پتہ چلا کہ مما اور پاپا دونوں مولوی خضر محمد کی طرف گئے ہیں۔پاپا کے وہاں جانے کا سن کر ایک بے نام سی خوشی اس کے دل میں اُمڈتی محسوس ہوئی۔اس نے سوچا' وہ یہاں بے کار میں پڑی رہے اور ان دونوں کا انتظار کرتی رہے۔اسے غازی شاہ کی طرف چلا جانا چاہئے گو کہ غازی شاہ نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اس کے بلانے سے یا رابطہ کرنے سے پہلے خود نہ آیا کرے مگر اس وقت جانے کیوں دل پھر سے اسی آشیانے کی طرف جانے کے لئے تیار تھا اور جذبات کو اگر اڑان دی جائے تو پھر وہ قید کہاں ہوتے ہیں۔

وہ چینج کرنے کے بعد غازی شاہ کی طرف جانے کو نکل آئی۔

سیاہ شلوار سوٹ میں غازی شاہ کا سراپا سحر انگیز دکھائی دے رہا تھا۔وہ اپنی تنظیم کے تمام مجاہدوں کے جذبہ ایمانی پر اپنی اثر انگیز آواز کا جادو جگا رہا تھا۔

”کفر و نفاق کے یہ پجاری ہمیشہ سے مجاہدین کے خلاف سازشوں میں مشغول رہے ہیں۔بلکہ یہ تاریخ کا تسلسل ہے اس لئے گھبرانے' ڈرنے یا مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔بلکہ یہ خوشی کا پہلو ہے کہ ہماری جدوجہد دشمنان اسلام کو شدید خوف میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ان کی نیندیں اچاٹ ہو گئی ہیں۔وہ تکلیف میں دن رات رہتے ہیں اور اپنے دماغ کو کھپاتے پھرتے ہیں۔

”یہ شہادت' زخم' جیلیں' تھانے اور ٹارچر سیل جہاد کے راستے کی رکاوٹ نہیں ہیں' مہمیز ہیں۔انہی چیزوں سے جہاد کو مزید قوت ملتی ہے۔جو لوگ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو ان سے خوفزدہ کر دیتا ہے اور بالآخر غلبہ تو اللہ والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔

”بھارتی جس روشنی کو کشمیر کی وادی میں بجھا دینے کا عہد کئے ہوئے ہیں وہ انشاءاللہ بجھ تو نہ سکے گی بلکہ یہ روشنی جموں سے لداخ تک اور امریکہ سے برطانیہ تک پہنچ جائے گی۔

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

”ساتھیو! ہر طرف سے ہمارا گھیراؤ کیا جا رہا ہے۔ہمیں شکست دینے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جا رہا ہے مگر ہم ذلت کی زندگی قبول نہیں کریں گے۔ہم ٹیپو سلطان ہیں' عزت کی موت کو ترجیح دیں گے۔ہم عقبہ بن نافع ہیں جنہوں نے شہادت کی موت کی قسم کھائی تھی اور رومیوں کی متحدہ طاقت کو باغہ کے مقام پر شکست

فاش دی اور بحر اطلانتک کے ساحل تک بڑھتے چلے گئے اور سمندر پر نظر پڑتے ہی خدا کے حضور جھک کر عرض کی کہ "خدایا! اگر یہ سمندر درمیان میں حائل نہ ہو جاتا تو جہاں تک تیری زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔ خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میں وہی چاہتا ہوں جو تیرا دوست ذوالقرنین چاہتا تھا کہ تیرے سوا کسی اور کی پوجا نہ کی جائے۔"

"مجاہدو! ہم طارق بن زیاد کی طرح نڈر، دلیر اور جری ہیں۔ جب تک ہمارا ایمان مضبوط ہے ہماری نظر دنیا پر نہیں آخرت پر ہے۔ ہم طارق بن زیاد کی طرح کشتیاں جلا کر آگے بڑھنے کو پسند کرتے ہیں اور میں بھی طارق بن زیاد کے الفاظ میں کہوں گا کہ "خدا کی قسم! صرف پامردی اور استقلال میں نجات ہے۔ یہی وہ فاتح فوجیں ہیں جو مغلوب نہیں ہو سکتیں۔ اگر یہ دو باتیں موجود ہیں تو تعداد کی کمی سے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا لیکن بزدلی، کاہلی، سستی، نامرادی، اختلاف اور غرور کی موجودگی میں تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔

"خبردار! ذلت پر ہرگز راضی نہ ہونا اور اپنے آپ کو دشمن کے حوالے مت کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد اور جفاکشی کے ذریعے سے دنیا میں تمہارے لئے جو عزت و شرف اور آخرت میں شہادت کا جو ثواب مقرر کیا ہے اس کی طرف بڑھو جس طرح طارق بن زیاد اپنے بارہ ہزار ساتھیوں سمیت راڈرک کے ٹڈی دل لشکر پر ٹوٹ پڑا تھا اور کچھ دیر میں میدان صاف کر کے فتح و نصرت کی خوشیوں کے ساتھ مجاہدین نے سرزمین اندلس پر پہلی نماز شکرانہ ادا کی۔ اسی طرح ہم بھی بہت جلد اس ٹڈی دل بھاری لشکر کو شکست فاش دے کر کشمیر کی سرزمین پر نماز شکرانہ ادا کریں گے۔"

"نعرہ تکبیر"

"اللہ اکبر" کے نعروں سے زمین گونجنے لگی۔ مجاہدوں کے چہروں پر جذبہ ایمان سرخی بن کر دوڑنے لگا تھا۔ ان کے نورانی چہرے اور روشن دکھائی دینے لگے تھے۔

ایک کونے میں کھڑی مومنہ ان اللہ کے فدائی، دیوانوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ "بھلا شمع حق کو بجھانے والے، نسخہ کیمیا کو جڑ سے اکھاڑنے کی سازشیں کرنے والے کب اور کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس شمع کی حفاظت کرنے والے پروانے صرف پروانے تو نہیں دیوانے بھی ہیں اور اللہ کے دیوانوں کو بھلا تاریخ گواہ ہے کون شکست دے سکا ہے۔"

اس نے غازی شاہ کو باہر آتے دیکھا تو اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ باہر آ کر ایک سیمنٹ کی کنی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے کے نازک حصوں میں سرخی قدرے گہری تھی۔ مومنہ کو دیکھ کر اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دوسری کنی پر بیٹھ گئی۔

"بہت ضدی لڑکی ہو، میں نے تم سے کیا کہا تھ؟" وہ خفگی بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مومنہ کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ ابھر آئی۔ ایک شریر سی چمکتی مسکراہٹ۔

غازی شاہ نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر جھکا لیں۔

"میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے؟" اس کے انداز میں سرزنش واضح تھی۔

"کیا کروں' خالی بیٹھے بیٹھے سوچا تمہاری طرف ہی چلی آؤں۔ پاپا اور مما تو بابا کی طرف گئے ہوئے ہیں سو میں دانستہ وہاں نہیں گئی۔"

"طارق احمد... بابا کی طرف..." اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں' اب پاپا کا بابا کی طرف جانا کوئی ناممکن سی بات بھی نہیں ہے۔" وہ اس کی حیرت پر بولی۔

"نہیں' خیر ناممکن تو نہیں مگر حیرت آمیز ضرور ہے۔ ویسے تم دانستہ وہاں نہیں گئیں' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ یکدم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مٹی کے چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کرتے کرتے مومنہ کا ہاتھ ایک پل کو رک گیا۔ جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔

اس کا کبھی غازی شاہ کی اس سادگی پر ماتم کرنے کو دل چاہتا مگر خیر وہ اتنا سادہ لوح بھی نہیں تھا' اس کے سر جھکا لینے پر اس کے لبوں کی تراش میں مدھم مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تو تم اس لئے وہاں نہیں گئیں کہ کہیں بی بی' طارق احمد سے ہماری شادی کا ذکر نہ چھیڑ بیٹھیں۔" پھر ایک گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"حالانکہ تمہیں جانا چاہیے' یہ دیکھنے کہ بی بی کی اس خواہش پر تمہارے پاپا کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔" اس نے گو کہ شگفتگی سے کہا تھا مگر اس کے اندر چھپے طنز کو مومنہ نے واضح طور پر محسوس کیا۔

"تمہاری بدگمانیاں بجا ہیں غازی شاہ' میں بھی ایک عرصے تک ایسی ہی بدگمانی کا شکار رہی۔ بہت سے سوالات مجھے بھی آکٹوپس کی طرح جکڑے رہتے تھے۔ پاپا سے مجھے بڑے شکوے تھے۔" وہ سارے کنکر ہاتھ سے جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"اگر میں کہوں غازی کہ پاپا بھی تمہارے ساتھ اس جہاد میں قدم بہ قدم شامل ہیں تو...؟"

اس کی بات سن کر غازی شاہ یوں مسکرایا جیسے انتہائی بچکانہ بات سن کر مسکرایا جاتا ہے۔

"بہر حال' میں تمہارے پاس ایک بہت خوش آئند خبر لے کر آئی ہوں" وہ اس کی استہزائیہ مسکراہٹ قطعی نظر انداز کر گئی اور اپنے پرس سے وہی کیسٹ نکالی جو غازی شاہ نے اسے دی تھی۔

جانتے ہو' یہ کیسٹ تمہیں کون سپلائی کرتا ہے؟" اس کے لہجے میں عجیب طرح کا جوش تھا۔

غازی شاہ کو ایک پل کے لئے اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے' وہ سیمنٹ کی کنی سے کھڑا ہو گیا۔

"کون؟" اس کا لہجہ دھیما مگر سرسراتا ہوا تھا۔

"طارق احمد!" اس نے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا تھا۔

غازی شاہ کے وجود پر سناٹا طاری ہو گیا' حیرت کی شدت نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ یہ اس کے لئے بے حد غیر متوقع بات تھی۔ اس کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں کم از کم اس شخص کا نام نہیں آسکتا تھا۔

حیرت انگیز نا قابل یقین...!" بہت دیر بعد اس کے لبوں سے بھنچی بھنچی سانس آزاد ہوئی۔

"مجھے پتہ تھا تم یہی کہو گے۔" وہ کیسٹ دوبارہ پرس میں ڈالتے ہوئے عجیب انداز میں مسکرائی۔

اگر یہ سچ ہے تو پھر انہوں نے اب تک چھپایا کیوں؟" اس کی تحیر آمیز بے یقین نظریں مومنہ پر ٹکی تھیں۔

"کیا نیکی چھپا کر کرنے سے نیکی نہیں رہتی؟ اس کا اجر کم ہو جاتا ہے؟" اس کے ہونٹوں کے تراشیدہ گوشوں میں پھیلی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور آنکھوں سے بڑا معصومانہ فخر جھلکنے لگا۔

وہ سر پر ہاتھ پھیرتا پر خیال انداز میں ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"ہو سکتا ہے حالات کے پیش نظر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوں یا ہو سکتا ہے وہ اس طرح کام کرنے سے زیادہ بہتر محسوس کرتے ہوں۔ ہاں' البتہ تم سے چھپایا کیوں؟ یہ سوال تم پاپا سے کر سکتے ہو۔"

غازی شاہ نے ایک گہری سانس کھینچ کر اپنے اعصاب کو سنبھالا مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ سنبھل کر بھی نہ سنبھل پایا تھا۔ یہ خبر اس کے لئے جہاں کسی دھچکے کی طرح تھی۔ وہیں بے حد مسرت کا باعث بھی بنی تھی۔
یکلخت اسے ان تمام لمحوں پر تاسف اور ندامت ہونے لگی جو بے خبری میں ہی نہیں بدگمانی میں بھی گزر گئے تھے۔

"ہو سکتا ہے' اس میں کوئی مصلحت ہو!" وہ غیر ارادی طور پر اپنے باپ کا دفاع کرنے لگی۔ "کیا تم پاپا سے اب بھی خفا ہو؟"

غازی شاہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ یہ اضطراب شاید غازی شاہ کے چہرے کے تاثرات سے ابھرا تھا۔

"خفا تو میں پہلے بھی نہیں تھا۔ وہ میرے بزرگ ہیں' میں خفا ہونے کا کوئی حق بھی نہیں رکھتا ہوں بلکہ میں تو پچھتا رہا ہوں کہ میں اب تک ان سے بدگمان کیوں رہا' خیر!" اس نے سر کو خفیف سے انداز میں جھٹکا۔

"آؤ بابا کی طرف چلتے ہیں۔" وہ یکدم ہی خود کو بادلوں کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

"نہیں غازی' ابھی نہیں... ہو سکتا ہے پاپا ابھی تک وہاں ہوں۔" وہ ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں!" وہ زیر لب مسکرایا۔

وہ پلکیں جھکا گئی۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی بکھر آئی۔ اسے غازی شاہ کے اس معنی خیز تبسم سے بے طرح شرم آنے لگی۔

"ارے ہاں' تمہارا مریض تو پہنچ گیا ہے میرے ہسپتال۔" وہ اس کی محویت ختم کرنے کی غرض سے موضوع بدل گئی۔

"طلحہ احمد کو ایڈمٹ کر لیا ہے میں نے۔"

"اوہ ہاں... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا"

غازی شاہ بھی یکدم سنبھل گیا۔ اس کے چہرے کے زاویوں میں سنجیدگی اتر آئی۔

"پرابلم تو ایسی کوئی نہیں ہوئی' ہاں... ایک پریشانی ضرور ہے۔" وہ اس کے ہمراہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر چلنے لگی۔

"کیسی پریشانی؟" جنگلے کے پاس غازی شاہ رک گیا۔

"ڈاکٹر کویتا' طلحہ احمد کو مجاہد کے طور پر جانتی ہے۔ طلحہ احمد کو دیکھ کر اس نے جس طرح کا ردعمل ظاہر کیا میرے لئے یہ تشویش کی بات ہے۔" پھر وہ اسے پوری تفصیل بتانے لگی کہ وہ کس طرح طلحہ احمد سے واقف ہوئی۔

غازی شاہ بھی فکر مند ہو گیا۔

"تمہارے کہنے کے مطابق کویتا اگر مسلمان ہو چکی ہے اور تمہاری فرینڈ بھی ہے تو پھر وہ کس حد تک ہمارے لئے مسئلہ پیدا کر سکتی ہے؟"

"اس بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتی بہر حال طلحہ ضرور محتاط ہو گیا ہوگا"

"ہوں!" غازی شاہ ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا پھر پر سوچ انداز میں جنگلے کے ساتھ دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

"کیا طلحہ نے بھی اسے پہچان لیا تھا؟" کچھ توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں طلحہ احمد کے چہرے سے میں کچھ اخذ نہیں کر سکتی مگر جب کویتا اسے پہچان گئی ہے تو وہ نہ پہچانا ہو ممکن نہیں۔"

"بہر حال اب ہمیں اپنا کام جلد از جلد اور زیادہ محتاط ہو کر کرنا پڑے گا۔ تم کویتا پر نظر رکھنا' ہو سکے تو نائٹ ڈیوٹی اپنی لگوا لو۔"

"نہیں' اوّل تو یہ بہت مشکل ہے اور دوسری بات یہ کہ مسلمان ہونے کے ناطے میں زیادہ نظر میں آسکتی ہوں۔ ظاہر ہے' پہلا شک مجھ ہی پر ہو سکتا ہے۔ کویتا کا رہنا ہی بہتر ہے۔" مومنہ اس کی بات رد کرتے ہوئے بولی۔

غازی شاہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور تحسین آمیز انداز میں مسکرا دیا۔ "خاصی ذہین ہوتی جا رہی ہو"

"آپ نے ہماری صلاحیتوں کو ابھی برتا کہاں ہے کمانڈر!" اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

"اوہ... میں سمجھا تم کہو گی' کمانڈر یہ سب تمہاری صحبت کا اثر ہے۔" غازی نے کچھ اس طرح ٹھنڈی سانس کھینچی کہ وہ اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

"یہ تم مردوں کو ہر وقت سہرا پہننے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لئے کہ سر جو ہے۔"

"سر ہے تو اس کا استعمال سہرا پہننے کے علاوہ بھی کیا جا سکتا ہے۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا کروں' اب بابا اور بی بی اس سر پر سہرا باندھنے کیلئے مصر ہیں ورنہ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" اس نے متاسفانہ سانس کھینچی۔ "حالانکہ اس سر سے واقعی خاصے معقول کام لئے جا سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے لوگ پھیل رہے ہیں۔ اب نکل جانا چاہئے' اوکے بائے!" وہ تیزی سے بھاگ لی۔ غازی شاہ ہنس دیا۔

☆...☆...☆

طلحہ احمد کا بیڈ داخلی دروازے سے نزدیک ہی تھا وہ شاید گہری نیند میں غرق تھا۔ سر سے پیر تک چادر میں چھپا ہوا تھا۔ صرف اس کی پلستر شدہ ٹانگ چادر سے باہر تھی جو سٹینڈ سے ہینگ کی ہوئی تھی۔

اسے مایوسی ہوئی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش دیکھنا اور محسوس کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس کے بیڈ کے نزدیک آئی۔ اس کی انگلیاں اس کی چادر پر ہلکے سے لرز کر رہ گئیں۔ اس نے سوچا اگر وہ جاگ گیا تو وہ کہہ دے گی کہ وہ اس کی خیریت پوچھنے آئی ہے اور راؤنڈ پر نکلی ہے۔

چادر کا کونا اس نے اٹھایا تو اس نے اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اعصاب کو شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ ایک پل کے لئے تو لگا جیسے اس کے اعصاب لاسٹک کی طرح کسی نے کھینچ کر چھوڑ دیئے ہوں۔ لمبائی میں رکھے گئے دونوں تکیے اس کا منہ چڑا رہے تھے اور خالی پلاستر کا خول تکیے سے ہوتا ہوا اسٹینڈ سے لٹکا ہوا تھا۔

حیرت کی شدت نے اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ان تکیوں کو تکنے لگی۔ اچانک آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تو ایک بار پھر اس کے اعصاب پر ضرب پڑی تھی۔

☆...☆...☆

ڈاکٹر کویتا کو بیڈ کے نزدیک دیکھ کر طلحہ احمد کے اوسان لحظہ بھر کو خطا ہوئے تھے۔ یہ صورت حال اس کے لیے قطعاً غیر متوقع اور پریشان کن تھی۔ تاہم دوسرے پل وہ اپنے منتشر حواس سنبھال چکا تھا مگر کویتا کو لگا وہ لہرا کر گر جائے گا۔ وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا کویتا کو طلحہ احمد کا "جن" ہی لگا۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں مگر وہ حقیقتاً صحیح وسالم حالت میں کھڑا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا بیڈ تک آیا پھر جھک کر بڑی پھرتی سے اس نے اپنے پلاستر کے خول سے چھوٹا سا پسٹل نکال لیا اور... ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر اس کی نازک گردن کو ہلکے سے دبوچ کر پسٹل اس کی پسلی پر رکھ دیا۔

" ڈاکٹر! تم نے جو کچھ دیکھا ہے۔ اگر کسی سے بیان کرنے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔" اس کی آواز رات کے مہیب سناٹے میں کسی پھنکار سے مشابہ لگی۔

کویتا کو اپنی گردن کی نرم جلد پر اس کی مضبوط انگلیاں کسی سانپ کی طرح سرسراتی محسوس ہوئیں۔ ایک پل کو وہ کانپی شاید وہ اب تک اپنے اعصاب سنبھال نہ پائی تھی۔ اس نے بس خالی خالی نظروں سے طلحہ احمد کا سرخ پتھریلا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی سرد مہری تھی اور ہونٹ باہم شدت سے آپس میں جکڑے ہوئے تھے۔ اسے اپنے رگ وپے میں عجیب سی ٹھنڈک اترتی محسوس ہونے لگی۔ اعصاب یخ ہوتے جارہے تھے۔ بہر حال یہ حملہ اس کے نازک اعصاب کیلئے بے حد بھاری تھا اور اب سنبھلنے کیلئے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت تھی۔

یہ چند لمحے عجیب کشمکش کے گزرے۔ پھر اس نے کسمسا کر اس کی گرفت سے خود کو نکالتے ہوئے کہا۔

" میرا خیال ہے طلحہ احمد! تمہیں اس کھلونے کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی' نہ کسی اور قسم کی دھمکی کی..." اس کا لہجہ دھیما اور نرم تھا۔

" میں کویتا نہیں ڈاکٹر عائشہ ہوں اور مسلمان ہونے کے ناتے میں کسی مسلمان کے مذہبی فریضے کی راہ میں رکاوٹ کیسے بن سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے واپس اسی جگہ رکھ دو جہاں سے نکالا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو مشکل میں پھنس جاؤ گے۔" وہ دبی زبان میں بول رہی تھی۔

طلحہ احمد نے چونک کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ جو کہہ رہی ہے سچ ہے۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی سطح پر اسے اس کے باطن کی سچائی محسوس ہونے لگی تو خود بخود اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پسٹل واپس رکھ لیا۔

" اب جلدی سے اپنی سابقہ حالت میں آجاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ پیرامیڈیکل کا کوئی فرد تمہیں اس حال میں دیکھ لے۔"

طلحہ احمد کو اس کا مشورہ خاصا معقول لگا۔ وہ جلدی سے بیڈ پر لیٹ کر اپنی ٹانگ پر پلاستر کا خول چڑھانے لگا۔

کویتا نے چادر اس کی ٹانگوں پر ڈال دی اور خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ کچھ لمحے اس پر اسرار سی خاموشی میں گزر گئے۔ کویتا کو اس خاموشی میں صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی' مگر طلحہ احمد کو خطرے کی گھنٹیاں بجتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا ذہن مختلف خطوط پر سوچ رہا تھا پھر یکدم وہ چونکتے ہوئے بولا۔

" ڈاکٹر! کیا تم پوچھو گی نہیں کہ میں کہاں گیا تھا؟" اس کے لہجے میں خفیف اضطراب ہلکورے لے رہا تھا۔

" ظاہر ہے جس مقصد کیلئے تم نے یہ سب کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے گئے ہو گے۔" وہ اس کی پلاستر شدہ ٹانگ پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر ہلکے سے مسکرائی۔

" میں اس بات سے بالکل خوف زدہ نہیں ہوں کہ تم سب جان چکی ہو۔" اس کے چہرے کے زاویوں میں کھنچاؤ پیدا ہوا۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں کوئی خوف' دہشت نہیں تھی بلکہ وہ بے حد پر سکون دکھائی دے رہی تھیں۔ یہی سکون تو کویتا کا سکون غارت کر رہا تھا۔ اسے اندر ہی اندر بے سکون کرتا جارہا تھا۔ وہ طوفان میں آئی موج کی طرح منتشر ہو کر رہ گئی تھی۔

" میں جانتی ہوں۔ یہ شانتی' یہ وشواس تمہارے من میں اللہ نے ڈال رکھا ہے اور جس من میں خدا کا خوف ہو وہاں دوسرے باطل خوف مٹ جاتے ہیں۔ حق ایسا ہی نڈر ہوتا ہے۔ ایسا ہی بے باک..." طلحہ احمد نے چادر کا کونا چہرے پر ڈالتے ڈالتے چونک کر غایت درجے حیرانی سے اسے دیکھا۔

جواباً وہ ہلکے سے مسکرائی۔ '' مجھے یہ باتیں مولوی صاحب نے سکھائی ہیں۔ مومنہ کے بابا نے۔'' وہ اس کی حیرت رفع کرنے کی غرض سے بولی۔

طلحہ احمد الجھن آمیز حیرت سے چپ ہو گیا پھر اس نے چادر چہرے پر ڈال لی گویا اب مزید کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حقیقتاً وہ الجھ گیا تھا اور غازی شاہ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

☆...☆...☆

صبح اسپتال میں ایک افرا تفری کا عالم تھا۔ پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ایم ایس کے کمرے میں کئی پولیس والے دکھائی دے رہے تھے۔ انتظامیہ الگ ادھر ادھر منتشر تھی۔ ڈاکٹرز میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

اسٹور انچارج ڈاکٹر سنیل کی حالت سب سے پتلی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ راتوں رات دوائیوں کے اہم اسٹاک غائب کر دیئے گئے تھے اور انچارج ہونے کے ناتے سارا نزلہ اسی پر گرا تھا جبکہ وہ ششدر تھا کہ اسٹور کے تالے توڑے نہیں گئے بلکہ کھولے گئے تھے اور پھر اسی احتیاط سے بند بھی کیے گئے تھے۔ کوئی الٹ پلٹ نہیں ہوئی تھی۔ صرف اہم دواؤں کے اسٹاک اٹھائے گئے تھے اور یہ سارا کام بے حد پلاننگ کے تحت کیا گیا تھا۔

ڈاکٹروں سے معمولی پوچھ گچھ ہوئی۔ ایم ایس کے کمرے کے اندر سے لے کر باہر تک ایک رونق سی لگی تھی۔ مومنہ اس ہجوم کو چیر کر راہداری میں نکلی تو اسے اپنے تپتے ہوئے رخساروں پر ہوا کے جھونکے خنک خنک سے

محسوس ہونے لگے۔ ایک گہری سانس کھینچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر بے حد نارمل انداز میں چلتی ہوئی وارڈ میں چلی آئی۔ وارڈ میں اس وقت کوئی ڈاکٹر یا پیرا میڈیکل کا سٹاف موجود نہیں تھا۔ سارے ہی سن گن لینے کیلئے گراؤنڈ فلور پر جمع تھے۔

وہ طلحہ احمد کی طرف آئی۔ '' کانگریجولیشن طلحہ احمد!'' وہ اس کے بیڈ کے نزدیک آ کر آہستگی سے بولی۔ طلحہ احمد نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بھینچے ہوئے لب ذرا سے وا ہوئے پھر اسی انداز میں سکڑ گئے۔

'' تھینک یو' مگر ایک معمولی سی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ سر جن!'' وہ بھی آہستگی سے گویا ہوا پھر اسے رات کی تفصیل بتانے لگا۔ مومنہ کیلئے کویتا پر یہ بات کھل جانا بہر حال تشویش کی بات تھی۔

'' میرا خیال ہے تمہارا مزید یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔''

'' ارے نہیں سر جن! اب اتنا گھبرانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کام اس قدر چابک دستی سے ہوا ہے کہ وہ صرف اٹکل ہی دوڑاتے رہیں گے۔ یہ افرا تفری یہ ہلچل دو چار دن رہے گی پھر مطلع صاف ہو جائے گا۔''

اب اس کا لہجہ تسلی دیتا ہوا تھا پھر یکدم سر جھٹک کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ '' میں صبح سے آپ کا ہی منتظر تھا۔''

مومنہ نے اپنے خیالات سے نکل کر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ '' مبارک باد دینے کو'' اس کی اٹھنے والی نگاہوں کے جواب میں وہ بولا۔ '' مگر الٹا آپ مجھے مبارک دینے لگیں حالانکہ میں کسی اور خبر کی وجہ سے آپ کا منتظر تھا۔''

مومنہ کو اس کے لہجے اور آنکھوں میں ایک معصومانہ خوشی اور شرارت چمکتی دکھائی دی۔ اس نے قطعاً نا سمجھ آنے والے انداز میں اب کے اس کی طرف توجہ سے دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

" میرے رفیق، میرے بھائی، میرے ساتھی سے منسوب ہو جانے کے بعد آپ میرے لیے یکدم بہت محترم ہو گئی ہیں اور اب صبح سے لیٹا میں مسلسل یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کس نام سے پکاروں، سرجن مومنہ کہوں یا بھابی؟"

مومنہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ طلحہ احمد یہ بات کہنے جا رہا تھا۔ بے تحاشا شرم نے اسے یکلخت گھیر لیا۔ تاہم اسے حیرت ہوئی کہ یہاں لیٹے لیٹے یہ خبر طلحہ احمد تک کیسے پہنچ گئی۔ پھر یہ سوچ کر اسے عجیب سی خوشی دل میں امڈتی محسوس ہونے لگی کہ غازی شاہ نے یقیناً اسے یہ خبر دی ہو گی۔ اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر سے، وہ جانتی تھی، غازی شاہ اپنی ہر خوشی طلحہ احمد سے ضرور شیئر کرتا تھا۔ پتا نہیں وہ اس وقت خود کتنا خوش ہو گا جب بی بی کے ذریعے اسے طارق احمد کی رضامندی ملی ہو گی۔

غازی شاہ کے تصور سے ہی اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس پر طلحہ احمد کی مسکراتی نگاہیں، وہ جانے کو پلٹی۔

" میری مشکل تو آسان کرتی جایئے سرجن!" طلحہ احمد جیسے کراہا تھا۔ اسے بے تحاشا شرم کے ہمراہ ہنسی بھی آ گئی۔

" یہ مشکل تم اپنے اس رفیق کے ساتھ مل کر حل کر لینا۔ وہ تمہیں بہتر مشورہ دے گا۔" وہ بولی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

☆...☆...☆

وہ ہسپتال سے گھر جانے کے بجائے کویتا کی طرف چلی آئی۔ ماتا جی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

" کیسی شبھ گھڑی ہے کہ آج مومنہ آئی ہے ہمارے گھر، سویرے سویرے منڈیر پر کاگا بول رہا تھا۔ میں نے عائشہ سے کہا کہ آج کوئی ضرور آئے گا۔ وہ کہنے لگی تمہارا وہم ہے۔ کوا پیاسا ہو گا اسی لیے شور مچا رہا ہے۔ لو بھلا اب بتاؤ، میرا وہم تھا؟" وہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

" بات کوے کے منڈیر پر بولنے کی نہیں ہوتی۔ اصل بات ہمارے اپنے من کی ہوتی ہے۔ آنٹی کوا تو روز ہی منڈیر پر بولتا ہے مگر... آپ کے من میں یہ خیال آیا ہو گا کہ کوئی ضرور آئے گا۔" وہ ہنس پڑی، ماتا جی بھی ہنس دیں۔

" ہاں، شاید یہی بات ہے۔ من کی بھی تو اپنی بھاشا ہوتی ہے نا، پر کوئی سمجھے تب نا۔" ماتا جی نے ایک گہری سانس کھینچی پھر نرمی سے اس کے کندھے کو تھپکا۔ " اب آئی ہو تو جانے کی بات مت کرنا۔ کھانا کھا کے جانا۔"

" جو حکم یہ تو بتایئے کہ وہ مہارانی ہے کدھر؟" اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

" اسے کہاں ہونا ہے۔ اپنے کمرے میں پڑی اینڈر رہی ہوگی۔ نائٹ ڈیوٹی کیا کر کے آتی ہے۔ مانو احسان ہی کرتی ہے۔" ماتا جی رسوئی کی طرف بڑھ گئیں۔

کویتا' مومنہ کی آواز سن کر بستر چھوڑ چکی تھی اور باتھ روم میں گھسی منہ دھو رہی تھی۔

" تو جناب! نیندیں پوری ہو رہی ہیں؟" مومنہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔

" نیندیں کہاں پوری ہوتی ہیں۔ بس یونہی کسلمندی سے پڑی تھی۔ یہ بتاؤ کہ تم آج کیسے ادھر آ نکلیں۔ کہیں غلطی سے پرستان کی طرف جاتے جاتے اس صحرا میں بھٹک کر تو نہیں اتر آئیں؟" کویتا کھونٹی سے تولیا کھینچ کر منہ رگڑتی باتھ روم سے باہر آ گئی۔

" لگتا ہے ابھی دماغ پر نیند کا اثر ہے۔" مومنہ نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا اور حسب عادت وہ زور سے ہنس پڑی۔ مگر اس کی ہنسی میں وہ تازگی نہیں تھی۔

" ایک تو تم اتنے سویرے ہسپتال سے نکل جاتی ہو۔ ملاقات ہو نہیں پاتی' سوچا آج تمہارے گھر پر ہی چھاپا ماروں۔ یہ بتاؤ نائٹ ڈیوٹی کیسی گزری۔ میرا مطلب ہے کہ..." وہ لہجے کو حتی المقدور سادہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی مگر بقیہ الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ کویتا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ابرو اچکا کر بولی۔

" خیریت' آج سے پہلے تو تم نے کبھی یہ سوال نہیں پوچھا۔ اس سے پہلے بھی میں کئی نائٹ کر چکی ہوں۔"

" ہاں' وہ بس یونہی پوچھ لیا۔" وہ خفیف سی ہو گئی۔ تب کویتا یکدم ہنس پڑی اور اس کے نزدیک آ کر اس کی طرف بہ نظر غور دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے بولی۔

" مجھے یقین تھا تم آج میرے پاس ضرور آؤ گی اور میری نائٹ ڈیوٹی کے حوالے سے ضرور سوال کرو گی۔ میری آنکھ جب کھلی تھی تب سے میں اب تک لاشعوری طور پر تمہاری ہی منتظر تھی۔"

کویتا کی نگاہوں نے مومنہ کو بے اختیار نگاہیں چرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اضطرابی انداز میں رخ موڑ کر ایک ہلکی سی سانس لے کر رہ گئی۔ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے اور کس طرح اسے اس راز کو راز میں رکھنے کی التجا کرے۔

اسے کویتا کی سیاہ گھور آنکھوں میں وہ ساری داستان دکھائی دے گئی جو طلحہ احمد نے اسے سنائی تھی۔"
عائشہ...!"

چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کویتا کی طرف رخ کیا۔" اگر میں کہوں کہ تم نے آج کی رات جو کچھ دیکھا' اسے اگر کوئی خواب سمجھ کر بھول جاؤ تو کیا تم میری بات مان لو گی اور ہاں' اگر تمہیں کوئی تجسس ہے تو کھل کر پوچھ سکتی ہو۔ میں تمہاری تمام تر کنفیوژن دور کر سکتی ہوں مگر دیکھو پلیز تمہیں واسطہ دیتی ہوں کہ..." اس نے یکدم دونوں ہاتھ کویتا کے آگے جوڑ دیئے۔

" پلیز آگے کچھ مت کہنا۔" کویتا نے فرطِ رنج سے اس کے جوڑے ہوئے ہاتھ پکڑ کر اسے یوں دیکھا جیسے قتل ہوتا ہوا کوئی شخص مرتے دم اپنے قاتل کو دیکھتا ہے۔ مومنہ کے بقیہ الفاظ اس کے حلق میں ہی ٹھٹھر گئے۔

" اتنا وشواس تو تمہیں مجھ پر ہونا چاہیے تھا۔ مومو! تم نے مجھے ایک سمے میں ہی اتنا حقیر کر ڈالا۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ اتنا پست کر دیا مجھے...؟" وہ یوں بلبلائی جیسے حقیقتاً مومنہ نے اس کی گردن پر چھری پھیر دی ہو۔ " مجھے تمہارا انتظار تھا مومنہ! مگر من کے ایک گوشے میں جانے کیوں آس تھی کہ تم نہیں آئو گی۔ اتنا تو وشواس ہونا ہی چاہیے تھا تمہیں، کیا ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں اتنی بااعتبار نہیں تھی؟"

" نہیں عائشہ نہیں، بات اعتبار کی نہیں ہے۔ ہمارے اطراف اس وقت جو حالات ہیں اور جس سے ہم کشمیری مسلمان نبرد آزما ہیں وہاں لمحہ لمحہ، پھونک پھونک کر گزارنا پڑتا ہے۔ اک ذرا سی لغزش، اک ذرا سی کوتاہی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔" اس نے کویتا کے ہاتھ فرطِ جذبات سے تھام لئے۔" میرا مقصد تمہاری دل آزاری کرنا نہیں تھا۔ یقین کرو، تم پر مجھے اعتبار نہ ہوتا تو میں یہاں نہ آتی۔ میرا دل خوف سے بھرا ہوا ہوتا، نہ میں خوف زدہ ہوں اور نہ ہی طلحہ احمد خوف زدہ ہے۔" وہ اسے یقین دلانے لگی۔

اس کی بات پر کویتا دھیرے سے مسکرادی۔ اس کی آنکھیں طلحہ احمد کے نام پر چمکنے لگیں۔" ہاں، میں جانتی ہوں۔ وہ شخص خوف زدہ ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کی آنکھوں میں اس سمے بھی کوئی خوف، کوئی وحشت نہیں

تھی۔ وہاں بلا کا اطمینان اور سکون تھا جیسے ارد گرد سے بے نیاز ہو۔ صرف اپنے رب پر اس کی نگاہ ہو۔ اسی کا ڈر خوف ہو۔" کویتا کی آنکھوں میں طلحہ احمد پورا کا پورا جاوداں ہو گیا۔ وہ مانوس سے درد میں بہنے لگی۔

" کیا ہر کشمیری مسلمان طلحہ احمد ہی کی طرح ہوتا ہے مومنہ! کیا سارے مجاہد اس جیسے ہی ہیں۔ من کو چھو لینے والے، بنجر زمین کو سیراب کرنے والے، دلوں کو تسخیر کر لینے والے، جیون میں چقماق کی طرح آگ لگا دینے والے۔"

اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ وہ لحظہ بھر کو اپنے ارد گرد سے ہر احساس سے بے نیاز ہو گئی تھی جبکہ مومنہ کو حیرت کے شدید دھچکے نے کتنی دیر تک کسی بھی ردعمل کے اظہار سے باز رکھا۔ جبکہ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر پلکیں جھپک کر یکدم اس خواب آگیں کیفیت سے جاگی تھی اور مومنہ سے نظریں ملیں تو اس کے گندمی رخسار یوں دہک اٹھے جیسے اس کے قریب ہیٹر آن کر دیا گیا ہو۔ اس کے رخساروں کی تپش کا احساس مومنہ کو اتنے فاصلے سے بھی ہونے لگا۔ وہ بالکل اچانک چپ ہو گئی تھی۔ ایسی خاموشی جو بہت سی باتوں کو واضح کرنے کے باوجود مبہم کر دیتی ہے۔ خاموشی کی چادر اوڑھ کر آدمی خود سے بھی گویا چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ مومنہ کو تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ چھپ رہی ہو۔ اپنے آپ سے مومنہ نے اس کا ہاتھ تھام کر ہلکے سے دبایا۔

" دراصل ہر شخص کا اپنا الگ رنگ ہوتا ہے۔ جس طرح ہر منظر، ہر رنگ، ہر پھول ہر آنکھ میں رنگ نہیں بھر سکتا۔ اسی طرح ہر شخص کے بارے میں ہر کسی کا اپنا ایک الگ نظریہ اور احساس ہوتا ہے۔ ہم کسی کے

بارے میں اچھا سوچتے ہیں تو وہ اچھا لگنے لگتا ہے۔اسے محبت کی نظر اور احساس سے دیکھتے ہیں تو یہ احساس ہی محبت کا روپ دھار کر مقابل کو حسین تر بنا دیتا ہے۔متاثر کن اور خیرہ کن بنا دیتا ہے۔جو شے کسی شخص کے دل کو گھیر لیتی ہے۔دراصل وہی خوبصورت ہے اور یوں بھی محسوسات کی تو ایک الگ ہی دنیا ہے۔ہزاروں میں کوئی ایک بلکہ کبھی لاکھوں اربوں میں کوئی ایک آپ کی روح کے تار کو چھیڑ جاتا ہے۔آپ کو اپنی دھڑکنوں میں سنائی دیتا ہے اور آپ اسے اپنے دل کے بے حد نزدیک محسوس کر کے اسے سوچنے لگتے ہیں۔یہ عمل کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں بلکہ خود بخود ہونے لگتا ہے۔پھر وہ اس کے سامنے نہ ہو مگر اس کی موجودگی کا احساس رہتا ہے۔''

کویتا کو لگا جیسے مومنہ کے جملے اس کے دل پر مضراب مار رہے ہوں۔اندر آشنا کچھ ناآشنا سی موسیقی بج اٹھی ہو۔

'' مومنہ! تیری باتیں بھی بالکل مولوی صاحب کی طرح دل کو لگتی ہیں۔'' اس نے جذب سے مومنہ کا ہاتھ پکڑا۔

'' میری باتیں تمہیں اس لیے اچھی لگ رہی ہیں کہ تم آج کل بہت اچھا اچھا سوچنے لگی ہو اور وہ بھی کسی کے بارے میں۔'' مومنہ نے ابرو اچکا کر اسے گھورا تو وہ جھینپ کر اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹی۔

'' بات سنو! یہ طلحہ احمد کا کیا معاملہ ہے؟'' کویتا کے پلٹنے سے پہلے ہی مومنہ نے اس کی کلائی پکڑ کر کھینچی۔ کویتا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

'' کیا معاملہ! میں تو یونہی ایک بات کر رہی تھی۔کیا اچھے لوگوں کو اچھا نہیں کہنا چاہیے۔جو لوگ قابل تعریف ہوں تو ان کی تعریف تو خود بخود ہوتی ہے۔'' وہ خود کو سنبھال کر نارمل لہجے میں بولی مگر مومنہ کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ اس کے اعتماد میں دراڑ ڈال گئی۔

'' فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ بتاؤ کہ لنچ تو تم نے کیا نہیں ہوگا۔آج ماتا جی نے چکن کڑاہی بنائی ہے' کھا کر جانا۔'' کویتا اسے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

'' اچھا نا' کھا کر جاؤں گی مگر پہلے میری ایک بات سنو۔''

'' کوئی بات وات نہیں سننا مجھے' بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔پاپی پیٹ میں کچھ بھوجن جائے گا تو باتیں بھی سمجھ آئیں گی نا۔'' کویتا اسے گھسیٹتی باہر لے آئی۔ماتا جی دستر خوان پر کھانا چن رہی تھیں۔

'' پاگل تجھے ایک بڑی اچھی خبر سنانی تھی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔کویتا نے اس کی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے اس کی شرمگیں مسکراہٹ کو قدرے چونک کر دیکھا پھر کھسک کر اس کے نزدیک آ بیٹھی۔

'' کیسی خبر؟ اچھی خبر تو آتے ہی سنا دینی چاہیے تھی۔اب جلدی سے بتاؤ' مجھ سے تو اب ایک نوالہ توڑا نہ جائے گا۔'' اس کے رخساروں پر پھوٹی شفق نے کویتا کو یکدم متجسس کر ڈالا۔

'' اب صبر نہیں ہو رہا اور جب کہہ رہی تھی کہ خبر سن لو تو بھوک ستا رہی تھی۔اب چپ چاپ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔'' اس نے شرارت آمیز انداز میں اسے آنکھیں دکھائیں پھر ہنسنے لگی۔

کویتا اسے مصنوعی خفگی سے گھور کر رہ گئی۔

ماتا جی بے حد پیار سے مومنہ کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ کویتا کہنے لگی ”مجھے جیلسی فیل ہو رہی ہے۔ اتنے پریم سے تو ماتا جی نے کبھی مجھے بھی کھانا نہیں کھلایا۔“

”بھئی جو جس سلوک کے قابل ہوا ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے نا اس کے ساتھ۔“ وہ اسے چھیڑنے لگی۔ ہلکی پھلکی شفاف مسکراتی فضا میں کھانا کھایا گیا۔

کھانے کے بعد ماتا جی رسوئی کا پھیلاوا سمیٹنے لگیں جبکہ کویتا اسے چائے کا مگ پکڑاتے ہوئے اس کے ساتھ تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی ”اب وہ اچھی خبر تو سنا دو جلدی سے۔“ میرا خیال ہے وہ خبر تم بی بی سے ہی سن لینا۔“ مومنہ بالکل سکول گرل کی طرح جھینپ گئی۔ اس کے چہرے کے نازک حصوں میں امڈنے والی شرمگیں سرخی میں عجیب سی تپش تھی۔ کویتا اسے باقاعدہ جانچتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

”جب زبان شرم سے خاموش ہو جاتی ہے نا تو آنکھیں خود بخود بولنے لگتی ہیں اور تیری آنکھیں اس سے وہ بھید کھول رہی ہیں جن کو سمجھنے کیلئے الفاظ کی نہیں، احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔“ مومنہ کے رخساروں میں بکھری سرخی میں بتدریج اضافہ ہو گیا۔ اس کی خمدار پلکیں رخساروں پر یوں جھک گئیں جیسے مہکتی، نرم، لچکدار شاخیں کسی چشمے پر سایہ فگن ہو جائیں۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کے جسم کی ساری خوبصورتیاں خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن ناپسندیدہ مرد کیلئے عورت اپنی ساری جسمانی خوبصورتیاں کسی کچھوے کی طرح اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ایسا کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں کرتی بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے اور میں نے دیکھا تھا کہ ڈاکٹر سنیل کو دیکھ کر تمہارے چہرے کی ساری رونق کسی نادیدہ خول میں جا چھپتی تھی

مگر اس سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تیرے ایک ایک انگ سے خوبصورتی کسی شعاع کی طرح پھوٹتی جا رہی ہے۔ کون ہے مومو! وہ کون ہے جسے بی بی نے تیرے لیے چنا ہے۔ جس نے تیرے دل کے خوابیدہ ساز کو چھیڑا ہے؟“

مومنہ نے جواباً آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں پھر ایک گہری سانس یوں کھینچی جیسے کسی احساس کے تصور سے ہی جسم و روح میں روشنی بھر رہی ہو۔ اسے اپنا پورا وجود ایک انوکھی لذت سے سرشار ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

”وہ خوشبو ہے۔ مہک ہے۔ ایسی مہک جو روح کو معطر کر دیتی ہے۔“ اس کا دھیما لہجہ آنچ دیتا ہوا محسوس ہوا۔

”ہاں، جبھی تو تمہارا پور پور مہکا ہوا لگ رہا ہے۔“ کویتا برملا بولی۔ وہ سراسیمہ سی ہو کر اس سحر سے نکلی ایک دو پل کویتا کو گھورا پھر ہنس پڑی۔

”لگتا ہے تیری شاعرانہ گفتگو کا مجھ پر بھی اثر ہو گیا ہے۔“ اس نے چائے کا مگ لبوں سے لگا لیا۔

" نہیں، مجھے تو یہ اسی کا اعجاز معلوم ہوتا ہے جس نے تیرے من پر نقب لگائی ہے۔ بتانا مومو! کون ہے وہ جو اتنا حسن بھر گیا ہے تمہاری آنکھوں میں، تمہارے چہرے پر کہ نگاہ نہیں ٹھہر رہی تم پر...." مومنہ نے جواباً شرما کر اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

" چلو نہ بتاؤ، میں بی بی سے آکر خود ہی پوچھ لوں گی۔" کو یتا کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس کی جاں بخشی پر مومنہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ کو یتا کے یہاں سے اٹھ آئی۔ ارادہ تھا کہ مولوی صاحب کی طرف جائے مگر آج وہاں غازی شاہ کی موجودگی ممکن تھی۔ اسے غازی شاہ سے یکدم ہی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ کل تک وہ جس جرأت اور بے تکلفی سے اس کے سامنے جا کھڑی ہوتی تھی۔ اب اس کے نام اور تصور سے ہی شرم سے پلکیں تک بھاری ہو جاتی تھیں۔ وہ مولوی صاحب کی طرف جانے کے بجائے طارق ہاؤس چلی آئی۔

ادھر مما ابھی مولوی صاحب کے یہاں سے ہی لوٹی تھیں۔ اسکارف اتار کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا

" تم کب آئی؟"

" بس ابھی کچھ دیر پہلے آئی ہوں۔" وہ کاؤچ پر لیٹی تھی، اٹھ کر بیٹھ گئی۔

" چلو اب منگنی کے بجائے تم نکاح کیلئے تیار ہو جاؤ۔" مما نے یہ کہتے ہوئے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔

" کیا مطلب؟" وہ ریموٹ سے ٹی وی کے چینل بدلتے بدلتے بری طرح اچھلی۔

" مولوی جی اور بی بی کی خواہش ہے بلکہ غازی کا بھی یہی کہنا ہے کہ منگنی کے جھمیلے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے نکاح کر دینا زیادہ بہتر ہے اور رخصتی، آپ لوگ جب چاہیں۔ کسی بھی دن ہو جائے گی۔ حالات یوں بھی یہاں ہمارے تابع نہیں ہیں۔"

وہ ریموٹ والا ہاتھ گود میں ڈھیلا چھوڑے یونہی بیٹھی رہ گئی۔ مما مزید تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے بولیں۔

" مولوی صاحب تو رخصتی بھی اسی روز کرا دینے کے حق میں ہیں۔ غازی شاہ کو بھی اعتراض نہیں ہے۔ اب دیکھو تمہارے پاپا آتے ہیں تو بات کرتی ہوں۔ ویسے دیکھا جائے تو مولوی صاحب کی بات بھی درست ہی ہے۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" مما اٹھ کر اس کے نزدیک آکر بیٹھ گئیں اور شرارت آمیز پیار سے اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے بولیں۔" کیا خیال ہے تمہارا؟"

اس نے سکول گرل کی طرح جھینپ کر انہی کے کندھے پر سر ٹکا لیا۔

" یہ کیا بات ہوئی۔ اتنی بڑی سرجن ہو کر بالکل بچوں کی طرح منہ چھپا رہی ہو۔ بھئی جواب دو مجھے۔" مما اسے چھیڑنے لگیں۔ وہ ہنسنے لگی۔

" آپ لوگ جو فیصلہ کریں گے۔ مجھے قبول ہو گا۔"

" تو ہمارا فیصلہ کیا ہو گا۔ پتا ہے تمہیں۔" مما نے ہنستے ہوئے اس کا شرم سے گلنار ہوتا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔" چٹ منگنی پٹ بیاہ، کہو قبول ہے؟"

یہ مما بھی بس' وہ شرم سے کٹ رہی تھی۔

مما یکدم سنجیدگی کی لپیٹ میں آ گئیں اور اس کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا۔

"مجھے بڑی آسودگی ہے مومنہ کہ میں تمہیں جس آنگن میں بھیج رہی ہوں۔ وہ آنگن تمہاری بچپن کی چہکار' مہکار سے آشنا ہے۔ ان ہواؤں میں آج بھی تمہارے لیے آسودگی اور مسرتیں پنہاں ہیں۔ اس مٹی میں تمہارے ننھے منے قدموں کی چاندنی بکھری ہے اور تمہیں اپنی روشنی میں سمیٹنے کو بے چین ہے۔ میں بہت خوش ہوں مومنہ! بہت خوش' دل کے کسی بھی گوشے میں کوئی بے اطمینانی' کوئی بے سکونی نہیں ہے۔"
ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اس کے سبک ہاتھ کو اپنے لبوں سے لگا کر چوم لیا۔

مومنہ نے بحر عقیدت میں ڈوب کر ان کے کندھے پر پیشانی ٹکالی۔ وہ ان خوش نصیب ترین لڑکیوں میں سے تھی جنہیں ماں باپ اپنی تمام تر دلی آسودگی اور پر خلوص نیک دعاؤں تلے رخصت کرنا چاہتے ہیں۔

☆...☆...☆

پورے ہسپتال میں ان دنوں مومنہ کی شادی کی خبر گرم تھی۔ خصوصاً سرجری وارڈ میں... اور یہ خبر کویتا نے ہی بہم پہنچائی تھی۔ اس نے بی بی سے نہ صرف پوری معلومات حاصل کی تھیں بلکہ چپکے سے غازی شاہ کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اسے مومنہ کی قسمت پر رہ رہ کر رشک آ رہا تھا۔ اسے غازی شاہ بہت سندر لگا تھا۔ اسے دیکھ کر اسے

اپنے بچپن میں سنی کہانیوں کی یاد آ گئی۔ جس میں پریوں کے دیس کا ایک شہزادہ اڑن کھٹولے سے زمین پر اترتا ہے۔ اپنی شہزادی کو ڈھونڈنے اور زمین زادیوں کو حیران' بے قرار اور رشک کے عالم میں چھوڑ کر اپنی شہزادی کو اپنے سنہری پروں میں چھپا کر آسمان کی طرف اڑ جاتا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ بھی ایسا ہی ایک شہزادہ ہو جو اپنے پروں میں مومنہ کو سمیٹ کر لے جانے آیا ہو۔

اس نے وارڈ میں غازی شاہ کی اتنی تعریفیں کی تھیں۔ ڈاکٹر سنیل اس دن سے انگاروں پر لوٹنے لگا تھا۔ سوائے اس کے وارڈ کے تمام ڈاکٹرز نے مومنہ کو مبارکباد دی اور ٹریٹ کا مطالبہ کیا۔

یوں بھی ان دنوں وہ سٹور میں ہونے والی واردات کی تفتیش میں الجھا ہوا تھا اور اپنے اندر مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت محسوس کر رہا تھا۔ اس کا رویہ مسلمان مریضوں کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی بھی مسلمان کو اس واردات میں ملوث کر کے قتل کر دے۔ وہ ہسپتال میں کھلے عام مسلمانوں کیخلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔ اخباری صحافی کو بھی اس نے ایسا ہی کچھ بیان دیا تھا جسے اخبار والوں نے بھی بڑھا چڑھا کر لکھا۔ مسلمانوں اور خصوصاً مجاہدوں پر کیچڑ اچھالا۔

ہسپتال کے مسلمان مریض پہلے ہی ہسپتال کے عملے کے ناروا سلوک کو سہتے رہتے تھے اب تو سب کے رویئے ہی ناقابل برداشت ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے میں طلحہ احمد کی موجودگی مومنہ کیلئے اہم مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ آج ہسپتال آتے ہوئے اس کا ذہن طلحہ احمد کی طرف ہی لگا ہوا تھا کہ کویتا نے صبح ہی صبح چھوٹتے ہی اسے یہ اطلاع دی کہ اس نے وارڈ کے بیڈ نمبر دو کے مریض طلحہ احمد کو ارلی مارننگ ہی فارغ کر دیا ہے۔ اس کا کہنا تھا

کہ اس نے رات خاصا شور مچایا تھا اور ڈاکٹرز کو برا بھلا کہا کہ اس کا علاج بہتر طور پر نہیں ہو رہا ہے سو وہ یہاں سے جانا چاہتا ہے۔ کویتا نے سرجن جگن ناتھ کی اجازت لے کر اسے صبح ہی صبح ڈسچارج کر دیا۔

مومنہ کیلئے یہ خبر جہاں تسلی بخش تھی۔ وہاں حیرت آمیز بھی' وہ کویتا کی طرف دیکھتی رہ گئی جبکہ کویتا کا انداز بے حد اطمینان بھرا تھا۔ وہ چائے کی چسکیاں دھیرے دھیرے بھر رہی تھی پھر یکدم موضوع بدل کر ڈاکٹر سنیل سے مخاطب ہوئی۔

"سنیل جی! آپ نے ڈاکٹر مومنہ کو ابھی تک اس کی منگنی ہو جانے کی مبارکباد نہیں دی؟" اس کے انداز میں ہلکی سی چھیڑ تھی۔

ڈاکٹر سنیل' جو پہلے ہی اس خبر پر دل شکستہ ہو کر بلبلا رہا تھا۔ کویتا کی اس چھیڑ نے اس کے زخموں پر نمک کا ہی کام کیا تھا۔ اس نے گرم گرم چائے کا گھونٹ یوں حلق سے اتارا جیسے وہ سیال شے نہ ہو۔ کوئی سخت ٹھوس چیز ہو۔ پھر پیالی پرچ پر پٹخ کر قدرے ناگواری سے بولا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ لوگوں کی ڈیوٹی میں چائے کا وقفہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔ آپ مریض بھگتایئے۔ یوں بیٹھ کر گپیں نہ لڑایئے۔" وہ یکدم کرسی کھینچ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا انداز اس قدر زہر بجھا تھا کہ مومنہ نے چونک کر دیکھا۔ وہ چابی جھلاتا ڈیوٹی روم سے باہر نکل گیا۔

کویتا کی بے اختیار ہنسی پر مومنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ "بے چارہ نراش عاشق۔"

"تمہیں ضرورت کیا ہے جو یہ خبر یہاں سے وہاں نشر کرتی پھر رہی ہو؟" مومنہ نے اسے دبی زبان میں گھرکا۔ اس کا اشارہ اپنی منگنی کی طرف تھا۔ کویتا بے پروائی سے ہنستی رہی۔

ڈاکٹر موہن اور ڈاکٹر وملا وہاں سے راؤنڈ لینے کی غرض سے گزر گئے تو مومنہ نے کویتا کے ساتھ والی خالی کرسی پر آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عائشہ! یہ طلحہ احمد کو فارغ کرنے کا کیا قصہ ہے؟" اس کا لہجہ سرگوشی سے ذرا ہی اونچا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سریش کو اشارہ کیا کہ ابھی کسی مریض کو اندر نہ بھیجے۔

کویتا نے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ٹکائے مومنہ کو یوں دیکھا گویا اس کی عقل کو کوس رہی ہو پھر ایک گہری سانس کھینچ کر سیدھی ہوئی۔ "اصولاً تو یہ کام تمہیں کل ہی کر دینا چاہیے تھا۔ یہاں کے حالات دیکھ رہی ہو تم! اس قدر بگڑتے جا رہے ہیں۔ مسلمان پیشنٹ بے چارے دبکے بیٹھے ہیں اور ایسے میں طلحہ احمد کا مزید یہاں رہنا کیا ٹھیک ہوتا۔ اگر اس کا بھید کھل جاتا تو؟"

"یہ بتاؤ' یہ آئیڈیا تمہارا تھا یا طلحہ احمد کا؟" مومنہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور ہلکی سی شرارت بھی۔

کویتا کی پلکوں پر بیک وقت خفیف سا بوجھ آن گرا۔ "میرا' خالص میرا' اس شخص کو تو بڑی مشکل سے میں نے راضی کیا ہے یہاں سے بھیجنے پر۔"

"اور وہ مان گیا' ہے نا کمال کی بات!" مومنہ ایک گہری سانس کھینچ کر بے اختیار ہنسی۔

اس ہنسی نے کویتا کے چہرے کو دم بھر کیلئے متغیر کیا تھا۔ دوسرے پل وہ مسکراتے ہوئے مومنہ کو آنکھیں دکھا رہی تھی۔

ڈاکٹر موہن اور وملا کو اندر آتے دیکھ کر وہ کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو' اب مجھے ان چھٹی دو اور تم لوگ مریض بھگتاؤ۔ نائٹ ڈیوٹی نے تو آج مجھے بڑا تھکا ڈالا ہے۔''

مومنہ نے دیکھا' اس کی آنکھیں رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ سیاہ خوش نما آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا خیال تھا یہ تھکن' یہ اضمحلال نائٹ ڈیوٹی کے باعث نہیں تھی۔ اس کی ''خاص وجہ'' طلحہ احمد تھا اور وہ کوئی نادان' کم سن نہ تھی کہ کویتا کی آنکھوں سے چھلکتے وہ رنگ نہ پہچان سکتی جو طلحہ احمد کے نام پر شفق کی طرح اس کی آنکھوں کے آسمان پر ابھر آتے تھے۔

وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ کویتا انجانے میں جس راستے پر قدم رکھ چکی ہے۔ وہاں آگے اس کیلئے کوئی خوش نما منزل تھی بھی یا نہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ طلحہ احمد کے دل میں کویتا کیلئے کوئی نرم گوشہ بھی ہے یا نہیں۔ حتیٰ کہ وہ کویتا کے جذبوں تک سے بھی آگاہ تھا یا نہیں۔

وہ کم گو' خوش شکل' مضبوط جسم اور معصوم آنکھوں والا طلحہ احمد جس کا دل فطری تمناؤں کے سیل رواں میں بہنے سے زیادہ فنا کے جنون میں خدا کا فدوی تھا۔

وہ فنا کے اس سفر میں تھا جس پر بقا قربان ہوتی ہے۔ اس نے تو اپنے دل میں وہ عہد و پیمان باندھ رکھے تھے جو ہر کوئی نہیں باندھ سکتا۔ پتا نہیں وہ ان فطری تقاضوں پر توجہ دیتا بھی ہے یا نہیں؟

کویتا کے کونپل جیسے نازک جذبوں کو پذیرائی بخشتا بھی ہے یا نہیں۔

اس کے اندر بہت سی سوچیں' فکریں سر اٹھانے لگی تھیں۔

طلحہ احمد کے بارے میں اسے غازی شاہ کے ذریعے ہی پتا چلا تھا کہ اس کا پورا گھرانا آج سے سات سال پہلے بھارتی فوجی درندوں کے ہاتھوں پامال ہوا تھا۔ وہ سب ایک رشتے دار کی شادی میں شریک تھے۔ جب براتیوں سے بھری بس پر بھارتی درندوں نے وحشیانہ حملہ کر دیا۔ ہنسی کی چہکاریں دم توڑ گئیں۔ بس میں بھونچال آ گیا۔ قہقہے چیخوں میں بدل گئے۔ کتنے ہی لوگ ان آگ بھری گولیوں سے موقع پر ہی دم توڑ گئے' کتنے خود کو بچانے کیلئے چلتی بس سے کودے اور ٹائروں میں آ کر کچلے گئے۔ کئی زخمی ہوئے۔ طلحہ احمد بھی ان زخمیوں میں سے تھا اور جب ہوش آیا تو اس کی اپنی دنیا لٹ چکی تھی۔ اس کی دونوں معصوم دس اور بارہ سالہ بہنیں اور ماں باپ اس سے ہمیشہ کیلئے بچھڑ گئے تھے۔ تب سے طلحہ احمد نے غازی شاہ کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

ہر کشمیری مسلمان کی طرح اس کے دل میں بھی بھارتی درندوں کیخلاف نفرت کا ایک بحر بیکراں موجزن تھا۔ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا تھا مگر زندہ صرف اس لیے رہنا چاہتا تھا کہ خدا کی راہ میں جہاد کر کے ان ظالموں اور کفار کی یلغار کو تہس نہس کر سکے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاکیزہ تہذیب کے دشمنوں کو ختم کر سکے۔

وہ میدان جہاد کا وہ پروانہ تھا جو زندگی کی شمع کے گرد نہیں بلکہ شمع شہادت کے گرد فدویانہ نثار ہونے کو مچل رہا تھا۔

مومنہ کو یہ خاموش مزاج، اجلے سراپا والا طلحہ احمد بالکل بھائی کی طرح عزیز تھا۔ وہ خود بھی مومنہ کی بڑی عزت اور احترام کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی شرارت بھی کر جاتا تھا۔

مومنہ نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ طلحہ احمد کو کویتا کے جذبوں سے ایک دن خود ہی آگاہ کر دے گی۔ اسے کویتا بے حد عزیز تھی۔ جس دن سے وہ مسلمان ہوئی تھی، اس دن سے وہ اپنے دل میں کویتا کیلئے اور بھی کشادگی محسوس کرنے لگی تھی۔

☆...☆...☆

کویتا نائٹ ڈیوٹی بھگتا کر گھر لوٹی تو ماتا جی کھلے صحن میں بے قرار روح کی مانند چک پھیریاں کھا رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکیں۔

" عائشہ! پرکاش آیا تھا۔ ابھی کچھ سمے پہلے ہی گیا ہے۔" ان کے لہجے سے ہی نہیں، چہرے سے بھی وحشت ٹپک رہی تھی۔

اس کا ہاتھ لحظہ بھر اپنے کندھے سے لٹکتے بیگ کے بیلٹ پر لرز کر رہ گیا۔" کیا کہہ رہا تھا؟" دوسرے پل ایک بھنچی بھنچی سانس کھینچتے ہوئے اس نے بیگ صحن میں پڑے تخت پر پھینکا۔

" اسے خبر ہو گئی ہے کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ تیری بھنک تو پہلے ہی پڑ گئی تھی اسے آشا کے ذریعے۔"

" ہاں، ہوئی ہوں میں مسلمان، اس کو کیا تکلیف ہے۔ ہم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ ایک سچے مذہب کو اپنایا ہے۔ کسی کی ہتیا نہیں کی۔ ڈاکہ نہیں ڈالا، حق اور راستی کا راستہ چنا ہے۔ اسے ہم سے کیا لینا دینا، کیوں آیا وہ ادھر! تم نے اسے اندر کیوں گھسنے دیا؟" وہ غصے سے بپھر گئی۔ اسے ماتا جی کا متوحش چہرہ ہی سب سمجھا گیا تھا کہ پرکاش کس انداز اور رویئے سے ماتا جی سے بات کر کے گیا ہے۔

" میں، میں کیا اندر نہ آنے دیتی۔ وہ تو اتنے کرودھ میں تھا۔ گھر میں گھس کر گالم گلوچ کرنے لگا۔ میں تنہا تھی۔ اس کے منہ لگتی تو کیا خبر وہ مجھے جان سے ہی ماراڈالتا۔ کہہ رہا تھا مسلمان ہونا ہے تو قربانی کیلئے تیار ہو جانا۔ میں نے کہا ہم نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ ہمیں سکھ چین سے اپنے گھر میں پڑا رہنے دے۔ کویتا سے جا کر ہسپتال میں مل لے اور جو کہنا ہے جا کر اسے سنا دے۔ پر تیرا نام سنتے ہی آگ پر جا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا سارا کیا دھرا اس حرام زادی کا ہی ہے۔ اس کو تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے تجھے خبردار کر رہا ہوں کہ..."

" بس کرو ماں!" کویتا کو اپنے اعصاب غصے سے چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے۔" اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ایسی گھٹیا بھاشا استعمال کرے تیرے سامنے، منہ نہ نوچ لیا تو نے اس کا۔" وہ بری طرح چیختی تھی۔

"شش... آہستہ بول' پہلے ہی محلے کے لوگ پرکاش کی آواز پر چونک اٹھے تھے اور اب تو سبھی کو خبر ہو گئی ہے ہمارے مسلمان ہو جانے کی۔" ماتا جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔" چل' اندر چل۔"

"بہر حال اب جب بھی وہ گھٹیا آدمی آئے۔ دروازہ نہیں کھولنا۔ باہر ہی سے چلتا کر دینا۔" اس نے غصے کو دباتے ہوئے ماتا جی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا پھر تھپتھپانے لگی۔

"تو چنتا مت کر' وہ صرف بھونکنے والا کتا ہے۔ یوں بھی میں پہلے ہی اس سے ہر تعلق توڑ چکی ہوں اور اب تو ہمارا اس سے تعلق بالکل ختم ہی سمجھو۔"

"مجھے تو اس کے کرودھ سے بڑا ہی ڈر بیٹھ گیا ہے عائشہ! وہ بڑا دشٹ اور انارکسٹ ہندو ہے۔ ایسا لگ رہا تھا۔ وہ اس سمے میرا خون پی جائے گا۔ کیوں نہ ہم یہ محلہ بدل لیں اور اب تو محلے والے بھی ہمارے خلاف ہو گئے ہیں۔ آشا اور اس کی ماں ہر ایک سے ہمارے خلاف زہر اگلتی پھر رہی ہیں۔" ماتا جی رسوئی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

کویتا نے دیکھا ان کے کمزور بوڑھے وجود پر پرکاش کا خوف بری طرح مسلط تھا۔ بہر حال یہ بات اس کیلئے بھی تشویش کا باعث تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں آ کر ماتا جی کو ڈرایا' دھمکایا کرے گا۔

وہ ناشتا وہیں چھوڑ کر صرف چائے کا مگ اٹھا کر چوکی پر جا بیٹھی۔ اس کے اندر پرکاش کیخلاف نفرت کا ایک ریلا اٹھ رہا تھا۔ بہ مشکل وہ اس ابلتے لاوے کو دبا رہی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا۔ دماغ کی رگیں چیخ جائیں گی۔

اچانک اس کے ذہن میں مولوی جی کا سائبان جیسا سراپا ابھر آیا۔ وہ چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھر کر چوکی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا مولوی جی کی طرف جا رہی ہوں ماتا جی' بہت دن ہوئے بی بی سے بھی نہیں ملی ہوں۔" ماتا جی نے سر ہلا دیا۔ انہیں پتا تھا وہ جب پریشان ہوتی تھی' مولوی جی کی طرف دوڑ جاتی تھی اور سچ تو یہ تھا کہ مولوی جی کی باتیں اسے بڑی تقویت دیتی تھیں بلکہ وہ جب آ کر وہ امرت جیسے لفظ ان کی سماعتوں میں بھی گھولتی تو ان کے اندر بھی ایسی شانتی اتر جاتی جیسے شام ہوتے ہی سمندر کی موجوں کی پیہم یلغار کا دم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ دھیرے دھیرے بہتی ساحل کی گود میں سر ڈال کر ٹھنڈی پر سکون ریت میں جذب ہونے لگتی ہیں۔

☆...☆...☆

"انسان کا ایک جزو حیوانی ہے جو اس کو حیوانوں سے ملاتا ہے اور ایک جزو روحانی ہے جو اسے رحمن سے ملاتا ہے۔ سو جب دوسرے رشتے کا تعلق قطع ہو جائے تو انسان صرف حیوان رہ جاتا ہے اور رحمان سے محروم' مگر ایک مسلمان کو یہ بڑی سعادت حاصل ہے کہ اسے روحانی سہارا میسر ہے۔ اس کا تعلق رحمان سے جڑا ہوا

ہے اور اٹوٹ ہے۔ یہ روحانی سہارا اسے بھٹکنے نہیں دیتا۔ اسے پستی میں گرنے سے روکے رکھتا ہے۔ وہ اگر رحمن سے اپنا تعلق پہچان لے تو پھر وہ اشرف المخلوقات کی تمام صفات سے بہرہ مند ہو جاتا ہے۔ وہ رحمن کی رحمت میں آجاتا ہے اور اس کے اندر سے تمام دوسرے باطل خوف مٹ جاتے ہیں۔ اس واحد لاشریک کے اقرار و اعتراف کا دل پر اخلاقی اثر پڑتا ہے۔ اطاعت، خشوع و استقلال، توکل اور اخلاص کی حالت صرف اسی وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ خیال ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں، تمام امیدوں اور پریشانیوں کا ایک ہی مرکز ہے۔ یہی وہ دروازہ ہے جس سے انسان کو اطمینان قلب اور اصل سہارا حاصل ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

"خوب سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

مادہ پرست لوگ سکون قلب کو اعلیٰ درجے کے ملبوسات، مکانات، دولت ثروت، حکومت، سلطنت میں ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ یہ دولت صرف اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ اسباب راحت ہوں تب بھی بغیر رجوع الی اللہ اور ذکر اللہ کے نہ تو ہم کو غم و اندوہ سے نجات ملے گی، نہ سکون خاطر نصیب ہوگا۔ یہ روحانی سہارا تو مسلمانوں کے قلب کو بھٹکنے، بکھرنے نہیں دیتا۔

آج مغرب اور مادہ پرست ملکوں میں اتنا فرسٹریشن، اتنا اضطراب اور نفسیاتی بیماریاں صرف اس لیے جنم لے رہی ہیں کہ ان کے پاس روحانی سہارا نہیں، صحیح عقیدہ نہیں ہے۔

مولانا خواجہ محمد شفیع دہلویؒ نے خوب فرمایا ہے کہ "عقیدہ غیر محسوس انداز میں ہمارے کردار کی تخلیق اور تعمیر پر نہ صرف اثر انداز ہوتا ہے بلکہ اسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا کردار ایک خاص نہج پر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ابن آدم کے ذہن کی گہرائیوں میں جڑ پکڑ کر کردار کی صورت میں برگ و بار لاتا ہے۔ اس لیے ایک سچے مسلمان کا کردار، ایک سچے مومن کا کردار بین طور پر اس سانچے میں ڈھلتا ہے اور یہ سانچا دوسرے سانچوں سے قطعی طور پر ممیز ہے۔ جیسا قالب ہوگا چیز اس سے ویسی ہی شکل اختیار کر کے نکلے گی۔ اس لیے صرف آپ ﷺ کی عادات، اخلاق اور اطوار اپنانے سے مسلم کردار حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ کے مسلم کردار کی تمنا ہو تو مسلم عقیدے کو اپنانا لازمی ہے۔

حضرت عمرؓ کو جس نے عمر فاروقؓ بنایا وہ "اسلام" تھا اور طارق بن زیاد سے جس نے کشتیاں جلوا دیں اور کہلوایا "ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" وہ اسلام تھا۔

جس نے خونخوار مغلوں میں تیمور اور بابر پیدا کیے وہ "اسلام" تھا ورنہ اس نسل میں ہلاکو اور چنگیز پیدا ہوتے تھے اور "آتش سوزاں" کا لقب پاتے تھے۔ تیغ بے نیام وہ یہ پہلے بھی تھے اسلام کے بجائو نے انہیں فاروق حق و باطل بنا دیا۔

بس اللہ لاشریک کی وحدانیت کا اقرار دلوں کو سکون بخشتا ہے۔ عقیدے کو راسخ کرتا ہے۔ حق و باطل میں تمیز پیدا کر کے کردار کی تکمیل کرتا ہے۔ معجزانہ طور پر ہمارے قلب کو سکون کی نعمت سے مالا مال کر دیتا ہے اور یہ وحدانیت کیا ہے۔ "کلمۂ طیبہ۔" اس کا ذکر۔

جو مضطرب ہے اس کی طرف التفات ہے

آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

"ایک امیر خدا کی ہستی کا اس شدت کے ساتھ منکر و مخالف ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے دیوان خانے میں ایک بڑے تختے پر یہ فقرہ موٹے حروف میں لکھوار کھا تھا کہ " خدا کہیں نہیں ہے۔'

(No Where)ایک مرتبہ وہ سخت بیمار ہوا۔ایک دوست اس کی عیادت کو آیا جس کے ہمراہ ایک بچہ بھی تھا۔دوست مصروف عیادت ہو گیا اور بچہ کمرے کی تصویروں سے دل بہلاتا رہا۔ناگاہ بچے کی نگاہ اس تختے پر پڑی جس کو اس نے اپنے معصومانہ انداز اور بلند آواز کے ساتھ اس طرح پڑھا(God is Nowhere) یعنی " خدا اب یہاں ہے" اس امیر آدمی نے جس وقت یہ الفاظ اصل عبارت سے ہٹا کر اس تغیر کے ساتھ سنے تو ان کے حقیقی مفہوم سے متاثر ہو کر اپنی بد عقیدگی سے فوراً تائب ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے بھی اسے صحت عطا فرمائی۔

تو پس حاصل کلام یہ ہے کہ کثرت سے ذکر اللہ کیا کرو۔اس سے قلب سکون پاتے ہیں کہ یہی اس کے در پر جھک جانے والا سر پھر کسی کے آستانے پر جھکنے کا محتاج نہیں رہتا۔یہ سر کٹ جانے کو ضرور تیار رہتے ہیں مگر جھکنے کو نہیں۔

یہی فنا ہے جس میں بقا کا راز مضمر ہے۔یہی اپنی بشریت کی شکستگی ہے جس میں اصل فتح اور فلاح ہے۔یہی وہ عاجزی ہے جس میں بلندی پنہاں ہے۔"

مولوی خضر محمد کا نورانی چہرہ اور مہربان چاندنی جیسے جملے کو یتا کے دل کے شوریدہ سمندر کو پر سکون ٹھنڈی ندی میں ڈھال رہے تھے۔ایک کلمہ پاک نے اسے کتنی بڑی نعمتوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ " آنند" کسے کہتے ہیں۔طمانیت قلب کیا ہے؟سکون کی منزل کسے کہتے ہیں۔

وہ حقیقتاً خود کو ان ٹھنڈے بادلوں کی طرح ہلکی پھلکی محسوس کرنے لگی جو اپنے اندر کا سارا بوجھ زمین پر اتار کر ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں۔

وہ بی بی کے پاس باورچی خانے میں بیٹھی انہیں ہندی ادب سے ٹکڑے سنا رہی تھی۔اس کی آواز بہت مترنم تھی۔بی بی کے کانوں کو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ابھی وہ دوسرا شعر سناتی کہ معاً پشت سے ایک بھاری مردانہ آواز نے ابھر کر اسے چونکا دیا۔

" السلام علیکم بی بی!" وہ طلحہ احمد تھا۔وہ اس مانوس آواز پر جھٹکا کھا کر پلٹی اور جیسے لمحہ بھر کیلئے طلحہ احمد کے سامنے کائنات ٹھہر گئی۔اس کی نظریں بھی اس مانوس چہرے سے ٹکرا کر لحظہ بھر کو نہ جھپک سکیں مگر جلد ہی اس نے بڑی سرعت سے نظروں کا زاویہ بدل دیا اور باورچی خانے کے دروازے پر جمایا ہوا ہاتھ ہٹا کر آہستگی سے پیچھے ہو گیا۔

" آئو آئو طلحہ ' کیسے آنا ہوا؟" مولوی خضر محمد نے ہاتھ دھو کر تولیا اٹھایا تخت کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے طلحہ احمد کا بھی خیر مقدم کیا۔وہ ان کی آواز پر پلٹ کر ان کی طرف بڑھ گیا۔

" میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" وہ تخت پر بیٹھ گئے تو طلحہ احمد موڑھا کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری' ہسپتال سے کب ڈسچارج ہوئے۔" بی بی بھی اسے دیکھ کر باورچی خانے سے باہر آ گئیں۔ ان کی نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ طلحہ احمد کے لبوں کی تراش میں بے اختیار مدھم مسکراہٹ جھلک کر معدوم ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا بی بی کو اس پلاننگ سے اور اس حقیقت سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ اس نے یونہی مولوی جی کی طرف دیکھا مگر وہاں گہری سنجیدگی تھی۔ وہ تولیہ تخت کے سرہانے پھیلا کر تکیے کے نیچے سے اپنی تسبیح نکال رہے تھے۔

"مومنہ' نے مجھے بتایا تو نہیں کہ تم ڈسچارج ہو گئے ہو۔"

"ڈسچارج ہوا نہیں بی بی! جبراً آ گیا گیا ہوں۔" اس کی نگاہ بھٹکتی ہوئی باورچی خانے کے اس گوشے کی طرف جا کر پلٹ آئی۔ وہ چوکی سے اٹھ کر باورچی خانے کی اندر کی دیوار سے بالکل لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہیں' وہ کیوں؟ مومنہ سے شکایت نہیں کی تم نے؟" سادہ سی بی بی پریشان ہو گئیں۔ ادھر کویتا کو اپنی پیشانی عجیب سی تپش سے جلتی محسوس ہونے لگی۔ گو کہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اسے لگ رہا تھا وہ اس کے چاروں طرف اپنی نگاہوں کا حصار کھینچ گیا ہو۔

"کی تھی شکایت اس سے بھی مگر وہ کہنے لگی کہ جس نے بھی تمہیں ہسپتال سے نکالا ہے۔ بالکل ٹھیک کیا ہے۔ میں اس کے اس کام سے بہت خوش ہوں۔"

"شریر کہیں کا۔" بی بی اس کی آنکھوں اور لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ دیکھ کر ہنس دیں اور ہلکے سے اس کے سر پر چپت لگا کر باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"اچھے خاصے ٹھیک ٹھاک لگ رہے ہو۔ مجھ بڑھی کو یونہی بے وقوف بناتے رہتے ہو۔"

"اری نیک بخت' عورت ذات کو بے وقوف بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" مولوی جی بے ساختہ شگفتگی سے بولے تھے۔ طلحہ احمد کھل کر ہنس پڑا جبکہ باورچی خانے کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر بی بی نے پلٹ کر مولوی جی کو مصنوعی پن سے گھورا پھر مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے کویتا کو دیکھا۔

"دو مردوں میں ہم بھلا جیت سکیں گے۔" کویتا ان کی آواز پر چونکی پھر کسی دھیان سے نکل کر ایک گہری سانس کھینچ کر نظریں جھکا لیں۔

"ٹھیک کہتی ہیں آپ' عورت ذات کا کام تو ہارنا ہی ہے۔ کبھی حالات سے' کبھی اپنے من کی آشا سے۔

موہ مہاد کھ روپ ہے تاہ کو مار نکار

پریت جگت کی چھوڑ دے تب ہو وے نار

ندی کا ناؤ کا بیٹھنا پلک ایک کی پریت

پل میں جات ہیں یہی جگت کی ریت

دو جیون میں کانٹھ بندھے جب ہو من کا میل

یا تو کھیلو انت تک یا مت کھیلو یہ کھیل

(ترجمہ)

محبت دنیا سخت تکلیف دہ ہے اس کو مار نکال

محبت دنیا کی ترک کر دے تب ہو گا سبکدوش

دریا میں کشتی پر بیٹھنا ایک ساعت کی محبت ہے

پل میں جدا ہو جاتے ہیں یہی دنیا کا طریقہ ہے

دو دلوں میں گانٹھ بندھے جب ہو دل کا ملاپ

یا تو کھیلو آخر تک یا مت کھیلو یہ کھیل

"ہاں سنائو، چپ کیوں ہو گئیں۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے سننا" بی بی نے یکدم کسی خیال میں کھو کر چپ ہو جانے والی کویتا کا کندھا دبایا۔

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ "آپ کو سمجھ آجاتی ہے ہندی بھاشا؟"

"ہاں کیوں نہیں، بڑی پیاری بولی ہے اور پھر تمہاری تو آواز میں بڑا جادو ہے۔ چاہے کوئی بھی زبان ہو۔ پیاری اور من موہنی آواز اسے پر تاثیر بنا دیتی ہے۔"

بی بی کی بات پر اس نے پلکیں اٹھا کر ان کے پر شفقت چہرے کو دیکھا۔ کچھ لوگ کتنی سادگی اور تمام تر خلوص سے آپ کی تعریف کر ڈالتے ہیں کہ دل بجائے مغرور ہونے کے گداز ہو جاتا ہے۔ سرور کی ندیاں سی بہتی محسوس ہوتی ہیں۔ احساس کمتری کے سیاہ بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ اس کی پلکیں آپوں آپ نم ہونے لگیں۔

بھگتی پر ان سے ہوت ہے من دے کیجئے بھائو

پرمارتھ پرتیت میں یہ تن جائو تو جائو

پریم بھائو اک چاہے بھیک انیک بنائے

چاہے گھر میں باس کر چاہے بن میں جائے

پریم کہانی بس بھری مت سنیو کوئی آئے

باتوں باتوں بس چڑھے دیکھت ہی ڈس جائے

(ترجمہ)

عبادت روح سے ہوتی ہے دل دے کر کرو محبت

نیک راستے کی آزمائش میں اگر یہ جسم جائے تو جائے

محبت تو سلوک ایک چاہیے خواہ بھیس بے شمار بنالو

چاہے گھر میں قیام کرو خواہ جنگل میں جائو

داستان محبت زہر بھری مت سنو کوئی آئے

باتوں باتوں میں زہر چڑھے دیکھتے ہی ڈس جائے

سکھ میں سمرن نا کیا دکھ میں کیا ہے یاد

کہے کبیر تا داس اس کی کون سنے فریاد

(ترجمہ)

آرام میں یاد خدا نہ کیا دکھ میں کیا ہے یاد

کہے کبیر اس مطلب پرست فرمانبردار کی کون سنے فریاد

آخری شعر سناتے ہوئے اس نے ہمہ تن گوش بی بی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک ہلکی سی سانس کھینچی۔

بی بی نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کے سبک سبک گندمی ہاتھوں کو تھام لیا۔" سچ کہتے ہیں کہنے والے کہ آواز کا تعلق براہ راست دل سے ہے۔آواز کی کمان سے نکلا ہوا تیر ٹھیک دل پر جا لگتا ہے۔"

" ہاں' ٹھیک دل پر لگے جا کر' بات تو تب ہے نا" وہ آہستگی سے کہتے ہوئے ہنس دی۔

اس کی مدھم آواز باورچی خانے سے نکل کر ہوا کے دوش پر لہراتی طلحہ احمد کی سماعت سے جا ٹکرائی تھی۔

پتا نہیں اب وہ دانستہ اس طرف متوجہ تھا یا بے دھیانی میں بھی اسی طرف دھیان تھا۔

اسے یوں لگا اس کے دل کی پر سکون سطح پر کوئی چمکیلی شے چھپ سے گری ہو اور پانی میں تلاطم برپا ہو گیا ہو۔ تو پھر یہ بھی سچ ہی ہے مبالغہ نہیں کہ یہ ٹھہرے ہوئے پانی میں تلاطم پیدا کر دیتی ہے۔

وہ کتنی دیر یونہی اپنے دل کی جھیل کے تلاطم کا شور سنتا رہا پھر یکدم جیسے اپنے ہی اس شور سے گھبرا کر موڑھے سے کھڑا ہو گیا۔

وہ مولوی خضر محمد کو غازی شاہ کا پیغام دینے آیا تھا۔ارادہ تو تھا کہ کچھ دیر مولوی جی کی محبت میں بیٹھے گا مگر جانے کیوں وہ جانے کا ارادہ باندھ بیٹھا۔

" بیٹھو کہاں جا رہے ہو۔قہوہ پی کر ہی جانا۔"

" نہیں مولوی صاحب! اب میں چلوں گا۔اللہ حافظ بی بی!" اس نے مولوی جی سے مصافحہ کیا پھر رخ موڑ کر باورچی خانے سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر بہ آواز بلند بولا۔اس کا لہجہ گو کہ سادہ سا تھا مگر اس میں بلا کی سرد مہری رچی ہوئی تھی جیسے احساسات اور جذبات میں یکلخت سرد سرد صحرا سا اتر آیا ہو۔وہ اپنی یہ کیفیت خود بھی نہ سمجھ پایا۔

بی بی باورچی خانے سے نکل کر اسے قہوے کیلئے روکتیں وہ بڑی سرعت سے داخلی دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

کویتا کے دل میں ایک سناٹا اتر آیا۔ وہ چوکی پر بیٹھے بیٹھے داخلی دروازے کی چوکھٹ کو گھور کر رہ گئی۔ کوئی کیا کرے۔ کوئی چپکے سے کسی کا جزو وجان بن جائے۔ اس کے من میں اتر جائے تو دوسرے کا اختیار تو چھن جاتا ہے نا۔

محبت موسم تو نہیں ہے کہ اس کے آنے کا وقت مقرر ہو۔ یہ تو کھردرے پودے پر اگ آنے والا وہ صحرائی پھول ہے جو اپنی خوشبو سے خود بھی بے خبر نا آشنا ہوتا ہے۔ اس پر جب ہوا چلتی ہے جھکڑ چلتے ہیں تو وہ لہرا کر اپنی مست خوشبو سے صحرا کو معطر کر جاتا ہے مگر کبھی کبھی صحرا میں اس کی خوشبو محسوس کرنے والا کون ہوتا ہے۔ صرف صحرا۔

وہ اچانک سر جھٹک کر چوکی سے اٹھ کر مولوی صاحب کی طرف آئی اور میز سے موٹی جلد والی کتاب اٹھاتے ہوئے بولی۔ " مولوی صاحب! میں یہ کتاب لے جاتی ہوں۔ پڑھ کر کچھ دن بعد لوٹا دوں گی۔"

اسے کشمیری زبان سے کافی حد تک آگاہی ہو گئی تھی۔ وہ اس روح آفرین کتاب کو پڑھنا اور اس کا ایک ایک لفظ ازبر کر لینا چاہتی تھی۔

وہ کتاب کو کسی قیمتی متاع کی طرح سینے سے لگائے مولوی صاحب کے گھر سے نکل آئی۔

☆...☆...☆

مومنہ کو مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ اس نے لاکھ احتجاج کیا کہ وہ یوں بند ہو کر گھر میں نہیں بیٹھ سکتی مگر مما اور نورین نے اس کی ایک نہ سنی۔ سبین بھی جدہ سے آ چکی تھیں۔

بخت بی بی نے خالص اپنے ہاتھوں سے پسا ہوا ابٹن بھیجا تھا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

" اب یہ بھی سب کرنا پڑے گا۔ اف مما' یہ سارا کچھ تو دیہات میں ہوتا ہے۔ وہاں کی عورتوں کیلئے۔ وہ ایک عرصے تک نہیں نہاتیں تو ابٹن سے سال بھر کی میل نکالتی ہیں۔"

" چل ہٹ بدتمیز!" نورین نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔" عائشہ! اسے پکڑ کر پورا ابٹن میں مل دو۔ سرجن صاحبہ کی ساری نفاست پسندی ایک طرف رہ جائے گی۔"

نورین کی بات نے اسے سچ مچ وحشت زدہ کر دیا۔" عائشہ! اگر تم نے ایسا کیا تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ جان بچانے کو کاؤچ سے اٹھی مگر صحت مند نورین کے توانا ہاتھوں میں محض بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ ہی سکی۔ کویتا نے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اس کے پورے چہرے پر ابٹن مل دیا۔

" ابھی غازی شاہ کو بلاتی ہوں۔ تیرا یہ روپ بھی وہ دیکھ لے۔" کویتا نے اسے ڈرایا' سچ سمجھ کر اچھل پڑی۔

" کیا آ... اسے یہاں بلاؤ گی۔ قتل نہ کر دوں تمہارا۔"

"" قتل تو تم غازی شاہ کا ہی کرتی رہنا"" سبین ہاتھ میں تھال اٹھائے اندر داخل ہوئی۔اس کے ہمراہ بخت بی بی اور مما بھی تھیں۔اس کے اس بے باک جملے نے اسے لجا کر رکھ دیا۔وہ دل ہی دل میں سبین کو صلواتیں سنا کر رہ گئی۔

"" اب یہ کیا اٹھا لائی ہو؟"" چمکدار کپڑے سے ڈھکے تھال بلکہ طباق کو دیکھ کر حقیقتاً ہی اسے چکر آ گئے تھے۔

"" یہ تمہارے سسرال سے آیا ہے اس کا سواگت کرو۔ چلو عائشہ اور نورین اس کی ہتھیلی پر پتا رکھو۔"" سبین نے یہ کہتے ہوئے تھال سے کپڑا ہٹایا۔

"" میں نے کہا تھا شادی سادگی سے ہو گی۔"" وہ منمنائی۔

"" ہاں تو سادگی سے ہی ہو رہی ہے۔یہ رسم اس سے زیادہ آج تک سادگی سے کسی کی نہیں ہوئی۔ چلو ہاتھ آگے پھیلاؤ۔بس... چپ بالکل چپ۔"" سبین نے اسے بولنے کو پر تولتے دیکھ کر گھرکا۔

"" کیسی بے شرم دلہن ہو۔میں تو اس موقع پر شرم کے مارے سر نہیں اٹھا پا رہی تھی اور تم ہو کہ مسلسل لڑے جا رہی ہو۔دیکھا بی بی!ایسی لڑاکا بہو مل رہی ہے آپ کو۔""

"" ایں ایں' کیوں لڑاکا ہونے لگی۔یہ تو میرے آنگن کا چاند ہے۔"" بخت بی بی کا دل اس لقب پر پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔انہوں نے پیار سے تھال سے لڈو کا ٹکڑا اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔پھر ہتھیلی پر رکھے پان کے پتے پر ذرا سی مہندی لگائی اور اسے خود سے لگا کر اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔

"" خدا تجھے سدا سہاگن رکھے۔میرے غازی شاہ کی زندگی بنا کر رکھے۔""

دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی ان دعاؤں میں سب کی آمین شامل ہو گئی۔

بہارو! پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے

ہواؤ! راگنی گاؤ میرا محبوب آیا ہے

کوبیتا شرارت بھرے انداز میں اپنی مہکی مہکی آواز میں گانے لگی۔سبین اور نورین تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگیں۔

او لالی پھول کی مہندی لگا ان گورے ہاتھوں میں

اتر آ اے گھٹا کاجل لگا ان پیاری آنکھوں میں

ستارو! مانگ بھر جاؤ میرا محبوب آیا ہے

میرا محبوب آیا ہے

☆...☆...☆

وہ پہلی بار پوری طرح شرم کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔پلکوں کی باڑھ پر منوں بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

نکاح والے دن غازی شاہ سرمئی رنگ کے شلوار سوٹ اور گہرے سرمئی رنگ کی واسکٹ میں ملبوس' سر پر صافہ باندھے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا گمان ہو رہا تھا جیسے حقیقتاً وہ آسمان سے اترا کوئی شہزادہ ہو اور اپنے پروں میں اپنی شہزادی کو سمیٹ کر لے جانے آیا ہو۔

اس کی سنہری آنکھیں ہیروں کی مانند جگمگا رہی تھیں۔ وہ سر جھکا کر مولوی صاحب اور بی بی سے دعائیں سمیٹ رہا تھا۔ پھر طارق احمد کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ اونچا لمبا دراز' وہ اپنے مقناطیسی وجود سے جیسے کائنات کی ہر شے کو مسمریز کرتا جا رہا تھا۔

دلہن بنی مومنہ کے پہلو میں جب غازی شاہ کو بٹھایا گیا تو مومنہ کا سر یوں جھک گیا جیسے لاج ونتی کا مہکتا پودا ہوا کے محبت آمیز لمس پر خود میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

نظارو! ہر طرف اب تان دو اک نور کی چادر

بڑا شرمیلا دلبر ہے چلا جائے نہ شرما کر

ذرا تم دل کو بہلاؤ میرا محبوب آیا ہے

میرا محبوب آیا ہے

☆...☆...☆

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

غازی شاہ کیلئے مومنہ طارق کا وجود ایک ایسا گھر تھا جس میں آ کر اس کی روح شادمانی اور طمانیت محسوس کرتی تھی جیسے کسی تھکے ہارے مسافر کو گھر پہنچ کر آسودگی میسر آتی ہے۔

ایک نارمل آدمی کی طرح اسے بھی ایک غمگسار' وفا شعار ساتھی کی طلب رہی تھی جس کے ہمراہ وہ اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے دکھ سکھ' خوشیاں غم شیئر کرتا رہے۔ ایک ایسے سچے دوست کی ضرورت تھی اسے بھی جس پر وہ ذاتی اور اجتماعی دکھوں پر جھنجلاہٹ نکال کر اس کی گود میں سر رکھ کر خوب رو سکے اور مومنہ طارق ایسی ہی وفا شعار' قابل اعتماد ساتھی' سچی ہمدرد دوست اور رفیق تھی جس کا وجود جس کی محبت غازی شاہ کیلئے روشنی کے مانند تھی اور وہ اس روشنی کو لئے بقیہ سفر طے کرنے کیلئے نئے سرے سے خود کو توانا محسوس کرنے لگا تھا۔ ولیمہ طارق ہاؤس کے لان میں ہی منعقد کیا گیا تھا۔ مگر تمام تر سادگی کو اس میں بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا تھا۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس مومنہ عورتوں کے گھیرے سے اٹھ کر اندر آ گئی تھی۔

"اب تھوڑا آرام کر لو۔ کھانا بھی تم نے نہیں کھایا۔ میں کچھ بھجواتی ہوں۔" سبین اسے کمرے کے دروازے تک چھوڑ گئی۔ اس نے ممنون نظروں سے بہن کو دیکھا اور اندر چلی آئی۔

کوپتا بھی اس کمرے میں تھی اور جالی سے لگی باہر لان میں اتری رونق اور روشنیوں کو تک رہی تھی۔ پتا نہیں اس کی نگاہیں کسی کی متلاشی تھیں شاید طلحہ احمد کی۔ اس پل اسے غازی شاہ کے پہلو میں کھڑا طلحہ احمد دکھائی دیا۔ سیاہ رنگ کے شلوار سوٹ اور لیدر کی سیاہ چپلیں پہنے وہ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود خاص دکھائی دے رہا تھا۔

بالکل اچانک اس کی نگاہیں جالی والے اس دریچے کی جانب اٹھی تھیں۔ نظروں کا تصادم ہوا۔ کویتا کے دل کے اندر گویا روشنی کا کوئی جھماکا ہوا تھا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کا پردہ کھینچ لیا۔

یہ احساس بڑا ہی فرحت انگیز ہوتا ہے کہ کوئی آپ کی پناہ تلاش کر رہا ہو۔ چپکے چپکے آپ کو اپنے دل کی مسند پر بٹھا کر پوجا کر رہا ہو۔

طلحہ احمد کے لبوں کی تراش میں بے اختیارانہ مدھم مسکراہٹ اُڈ کر معدوم ہو گئی تھی۔ دوسرے پل وہ غازی شاہ کی طرف پلٹ گیا تھا۔

" ایک روشنی تو انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اسے روشن رکھے ہوئے۔ یہ تیز ہوتی ہے تو زندگی کے رنگ بھی پھیکے اور مدھم پڑنے لگتے ہیں۔ اس روشنی کا نام " محبت " ہے۔" مومنہ کا ہاتھ اپنے کندھے پر محسوس کر کے وہ غیر محسوس طور پر چونک گئی اور ایک گہری سانس لے کر پلٹی۔

" جو روشنی تمہارے اندر ہے اسے باہر تلاشنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ اس روشنی کو باہر آنے دو اور دوسروں کو منور کر دو۔"

کویتا لحظہ بھر کے لئے جھینپ گئی۔ شاید یوں جذبوں کے کھل جانے پر۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سر جھکا گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے رخسار دہکنے لگے۔

" تم بہت خوش نصیب ہو مومنہ طارق! اور ہر کوئی ایسا خوش نصیب کہاں ہو سکتا ہے۔" اس نے مومنہ کا دلفریب چہرہ تکا پھر اس کا ہاتھ تھام کر مسکرا کر ہلکے سے دبایا۔" ضروری تو نہیں کہ آپ جس راستے پر چلنے کی آشا کریں وہیں منزل آ کھڑی ہو۔"

" مگر بہر حال منزل کیلئے سفر کا شعور تو لازمی ہے نا' بیچ سفر میں تو کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ راستوں کا تعین کبھی ٹھیک بھی ہو جاتا ہے اور ایک خوبصورت منزل آپ کی منتظر ہوتی ہے۔" مومنہ کا لہجہ تسلی آمیز تھا۔

" ہاں' اگر راستوں کا تعین ٹھیک ہو تب نا۔"

" کیا مطلب؟" مومنہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

" ہاں آں... سچ کہتے ہیں دانا کہ امید وہ خوش نما پرندہ ہے جس کے پیچھے تا عمر بھاگتے رہنے سے بھی کوئی نہیں تھکتا۔" وہ یاس بھرے انداز میں مسکرائی۔ پھر جیسے اس سحر کے طلسم سے نکلتے ہوئے بولی۔" مومو! خدا تمہیں سدا یونہی ہنستا بستا رکھے۔ تمہارے من کی تمام آشائیں پوری ہوں۔ غازی شاہ کے ہمراہ تم جیون کے ہر موڑ سے آنند اور خوشیاں سمیٹتی رہو۔"

" تھینک یو عائشہ!" مومنہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ خوشی کے بے پایاں احساس سے اس کی خوش نما آنکھوں کی زمینیں گیلی ہو رہی تھیں۔

"ارے مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔اتنا بہت سا وقت گزر گیا۔ماتا جی انتظار کر رہی ہوں گی۔" کویتا کو یکدم ماتا جی کا خیال آگیا' جو مومنہ کے ولیمے میں اپنے پیروں کے درد کے باعث شرکت نہ کر سکی تھیں۔صبح سے ان کی طبیعت میں بے کلی تھی اور پیروں میں بھی درد حد سے سوا تھا۔

مومنہ نے ماتا جی کی حالت کے پیش نظر اسے مزید رکنے پر مجبور نہیں کیا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کویتا کے ساتھ بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کرے۔اپنی اس بے پایاں خوشی کا لمحہ لمحہ اس سے شیئر کرے۔

" اتنی رات میں تم تنہا کیسے جاؤ گی؟ ٹھہرو' میں غازی شاہ سے کہتی ہوں۔وہ کوئی انتظام کر دے گا۔"

" تم چنتا مت کرو۔میں رکشا پکڑ لوں گی۔"

" نہیں بالکل نہیں۔اتنی رات گئے تمہارا تنہا رکشے میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اسے آنکھیں دکھاتی دروازے کی طرف بڑھی۔

نورین دکھائی دی تو اسے غازی شاہ کو بلانے کو کہا۔

" یہ کہواس کی دید کو من کر رہا ہے تمہارا' میرے کندھے پر تو ناحق بندوق رکھ رہی ہو۔" کویتا نے اسے چھیڑا۔

" چلو یہی سمجھ لو۔اپنی ملکیت کا دیدار کرنا کون سی معیوب بات ہے۔" وہ شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔پھر سامنے سے آتے غازی شاہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔وہ اندر آنے کے بجائے تذبذب کے عالم میں دروازے کے باہر ہی رک گیا

" کیا مسئلہ ہے؟" اس کے انداز میں تشویش تھی۔

" مسئلہ کوئی نہیں ہے۔غازی بھائی! آپ کی پتنی کو صرف آپ کا دیدار کرنا مقصود تھا۔" کویتا پٹ سے بولی۔

(یہ خواہش تو میری بھی تھی)غازی شاہ کے دل میں بے ساختہ یہ فقرہ مچلا تاہم وہ بولا نہیں۔ہاں' مومنہ کے دلفریب سراپا کو غور سے تکا۔

" بکواس کر رہی ہے یہ عائشہ' بات دراصل یہ ہے کہ پاپا سے یا کسی سے کہہ کر عائشہ کو گھر بھجوانے کا انتظام کر دیجئے۔اتنی رات کو وہ تنہا کیسے جائے گی؟ جبکہ اس کے محلے کے حالات بھی اس کیلئے کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

غازی شاہ نے ہلکے سے ہنکارا بھر کر سر ہلا دیا۔

" گاڑی باہر کھڑی ہے۔میں طلحہ سے کہتا ہوں۔وہ انہیں چھوڑ آئے گا۔آ جایئے عائشہ!" اس نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

کویتا کا دل طلحہ احمد کے نام سے ہی سینے کی چہار دیواری میں پھیل کر سکڑا تھا اور خون رگوں میں رک رک کر بہنے لگا۔

" جایئے' اس سے زیادہ آپ کی کیا سیوا کی جائے؟" مومنہ اس کی طرف گھومی اور اسے شرارت آمیز نظروں سے دیکھا۔

کویتا نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔

" اسے کہتے ہیں من کی مراد بر آنا۔"

" بڑی زبان چل رہی ہے تمہاری' اب تم ہسپتال آنا' تمہاری سیوا تو وہیں کروں گی میں!" وہ اپنا اسکارف اٹھاتی اسے گھورتی دروازے سے باہر نکل گئی۔

مومنہ کی مدھر ہنسی اسے دور تک سنائی دی۔ یونہی رک کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ دروازے سے لگی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

کویتا کو وہ حسن کا زندہ مجسمہ محسوس ہونے لگی۔ آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ اس کے سلکی بالوں میں لگے موتیا کے گجرے اس کی شفاف گردن اور رخساروں کو چھو رہے تھے۔ اس کے سراپا سے حسن کی عجیب سی شعاعیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ من پسند سچے ساتھی کی سنگت میں عورت کا حسن سمندر کی طرح لامتناہی ہو جاتا ہے۔ سمیٹے نہیں سمٹ پاتا۔

بے غرض سچا جیون ساتھی تو ٹھنڈی چھایا کے مانند ہوتا ہے جس کی چھاؤں میں آ کر عورت ذات پر سکون ہو جاتی ہے اور اسے مومنہ کے چہرے سے ایسی ہی طمانیت' ایسا ہی سکون دکھائی دے رہا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اس کی خوشیوں کی دعائیں مانگتی بخت بی بی اور مومنہ کی والدہ اور بہنوں سے مل کر باہر آ گئی۔

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر طلحہ احمد بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا اس کا منتظر تھا۔

اس نے اسکارف کو اچھی طرح اپنے چہرے کے گرد لپیٹ لیا اور پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

گاڑی طارق ہاؤس کے پورٹیکو سے نکل کر سڑک پر گویا پھسلنے لگی۔ کویتا نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

رات کی تاریکی آہستہ آہستہ بڑھتی فضا میں کسی بھوت کی طرح مسلط محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب ہولناکی کا احساس فضا پر چھایا محسوس ہو رہا تھا۔ سڑکوں کے کنارے اونچے اونچے خوشنما درخت اندھیرے کے باعث کسی دیو کی طرح ہیبت ناک دکھائی دے رہے تھے۔ جو تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے جا رہے تھے' مگر ایک کویتا کا دل تھا جو ٹھہرا ہوا تھا جیسے کسی جھیل میں چاند اتر کر ساکن ہو گیا ہو۔

" شیشہ بند کر دیجئے عائشہ! باہر خنکی بہت بڑھ گئی ہے۔" طلحہ احمد کی بھاری آواز نے اس ساکن جھیل میں ہلکے سے ارتعاش پیدا کیا تھا۔

"نہیں، ایسی خاص خنکی بھی نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو احساس نہیں ہو رہا۔" وہ آہستگی سے بولی اور شیشہ اوپر کرتے ہوئے ایک ہلکی سی سانس کھینچ کر بولی۔ "شاید اپنے اندر بہت تپش ہو تو بیرونی ٹھنڈ کا احساس ماند پڑ جاتا ہے۔"

طلحہ احمد نے ایک نظر بیک ویو مرر سے اس کے چہرے پر ڈالی پھر کسی احساس کے تحت لبوں کو باہم بھینچ لیا اور نظریں ونڈ اسکرین پر جما دیں۔

اچانک گاڑی میں ایک عجیب سی خاموشی پھیل گئی۔ ایسی خاموشی جو اپنے وجود سے متحرک رکھتی ہے۔ دلوں میں مدھم مدھم ارتعاش پیدا کیے رکھتی ہے۔

گاڑی کویتا کے بتائے ہوئے راستوں پر بھاگتی، اس کے گھر کے دروازے پر رکی تو کویتا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کو راستہ معلوم تھا پھر آپ کیوں مجھ سے پوچھتے رہے؟"

اس کی بات پر طلحہ احمد یکدم یوں جھینپ گیا گویا کوئی نوآموز چور رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا ہو۔ فوری طور پر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا بس یونہی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر جھکا کر اگنیشن سے چابی کھینچنے لگا۔

"آپ اندر جائیے تب تک میں یہاں کھڑا ہوں۔" وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور پچھلا دروازہ اس کیلئے کھولنے لگا۔

کویتا کو طلحہ احمد کا اس طرح معصومانہ انداز میں جھینپ جانا، جانے کیوں بہت بھایا تھا۔

وہ نیچے اتر کر ڈور بیل بجانے لگی۔ کچھ دیر بیل بجانے پر بھی دروازہ نہ کھلا تو اس نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ اچانک اسے احساس ہوا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے۔ بس یونہی بھڑا ہوا ہے۔ اسے حیرت ہوئی ماتا جی اتنی بے پروا تو نہیں تھیں۔

"کیا بات ہے؟" طلحہ احمد اس کے چہرے کے بدلتے رنگ محسوس کر کے اس کی طرف آ گیا۔ "دروازہ تو کھلا ہوا ہے!" اس نے نیم وا دروازے کو ہلکے سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔

"ہاں، یہی میں سوچ رہی تھی۔ ماتا جی اتنی رات گئے دروازہ کھلا چھوڑ کر کیسے سو گئیں۔" وہ تیزی سے کھلے دروازے سے اندر چلی گئی۔

"ماتا جی، ماتا جی، سو گئی ہو کیا؟" اندر کی غیر معمولی خاموشی سے گھبرا کر وہ صحن سے ہی انہیں زور زور سے پکارتی کمرے کی طرف بڑھی۔ دوسرے پل اس کی آنکھوں کے آگے ایک وحشت ناک منظر آ گیا۔

ماتا جی کاؤچ پر پڑی تھیں۔ ان کا ڈھلکا ہوا سر کاؤچ کے باہر لٹکا ہوا تھا۔ جس سے گاڑھا سیال خون رس رہا تھا اور فرش پر دور تک پھیل کر جم گیا تھا۔ کچھ کاؤچ میں جذب ہو چکا تھا۔ فرش پر بکھرا ہوا خون سرخ پینٹ کی طرح چمک رہا تھا۔ قریب ہی پتھر کی خون آلود مورتی پڑی تھی۔

ایک گھٹی گھٹی چیخ کویتا کے لبوں سے نکل کر باہر کھڑے طلحہ احمد کو چونکا گئی۔

☆...☆...☆

خون اس وقت زندگی کی علامت ہے جب یہ انسانی رگوں میں دوڑ رہا ہو۔ بہنے والا خون سوائے خوفناک اور وحشت ناک موت کے کچھ بھی نہیں۔

ایک چیخ کے بعد اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ماتا جی کا چہرہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر جم کر اس کے اعصاب کو شل کر گیا۔

کمرے میں داخل ہونے والے طلحہ احمد نے لحظہ بھر کے لئے تکلیف اور اذیت کے عالم میں آنکھیں میچ لی تھیں۔ پھر نڈھال قدموں سے آگے بڑھا اور ماتا جی کی نبض چیک کرنے لگا مگر کلائی کی یخ بستگی کو محسوس کرتے ہی اسے ان کے جسم سے روح کے نکل جانے کا احساس ہو گیا تھا۔

اداسی کی ایک شدید لہر اس کی آنکھوں سے روح تک میں سرایت کر گئی۔ اس نے چارپائی سے چادر اٹھائی اور ان کے مردہ جسم پر ڈال دی۔

عائشہ کاؤچ سے کچھ فاصلے پر دوزانو بیٹھی تھی۔ اس کا بدن ساکت تھا اور پلکیں بے جنبش ماتا جی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی خوشنما سیاہ آنکھوں میں ایسی وحشت تھی کہ ایک پل کے لئے طلحہ احمد کو اس کی طرف دیکھنے سے خوف اور دکھ کا شدید احساس ہونے لگا۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور غازی شاہ کا نمبر پنچ کرنے لگا۔

فوری طور پر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ اسے مومنہ اور غازی شاہ کو اس اندوہ ناک واقعہ کی اطلاع دینی چاہیے چونکہ یہ سراسر قتل کا کیس تھا جو ایک پتھر کی مورتی سے کیا گیا تھا۔ وہ خون آلود مورتی قریب ہی پڑی تھی جس سے یہ بات واضح تھی کہ یہ قتل کسی انتہا پسند ہندو نے کیا تھا مگر مسلمانوں کی پوزیشن کی وجہ سے وہ پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بھارتی درندے تو دومنٹ میں یہ قتل کسی مسلمان کے سر تھوپ کر اسے پھانسی پر چڑھا دیتے۔

وہ یہاں کے قانون سے اچھی طرح آگاہ تھا جو صرف اور صرف مسلمانوں کیلئے آہنی پنجہ تھا۔ بے گناہ مسلمانوں سے بھری جیلیں اور ٹارچر سیلز کی کہانیاں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔

اس نے عائشہ کے ساکن وجود پر ایک نگاہ ڈالی اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ غیر متوقع اور تکلیف دہ حالات اس کے اعصاب کیلئے بہت بھاری ثابت ہو رہے تھے اور اب ان سے نمٹنے کیلئے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت تھی۔

☆...☆...☆

غازی شاہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد مولوی خضر محمد کے یہاں پہنچا تو مومنہ، بخت بی بی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اسے دیکھ کر معصومانہ انداز میں مسکرائی گویا اسے چڑانا مقصود تھا۔ دراصل اسے ماہین نے غازی شاہ کا پیغام دیا تھا کہ طارق ہاؤس سے واپسی پر وہ غازی شاہ کے ہمراہ جائے گی۔ مگر وہ محض اسے ستانے کو

بخت بی بی کے ہمراہ چلی آئی تھی۔اسے ستا کر محض حظ اٹھانا چاہ رہی تھی۔ مگر غازی شاہ کا متفکر اور پریشان کن چہرہ دیکھ کر وہ بی بی کی گود سے جھٹکے سے اٹھ گئی۔اس سے پہلے کہ کوئی سوال کرتی۔وہ خود ہی بولا۔

" مومی! ڈاکٹر عائشہ کی والدہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ابھی طلحہ کا فون آیا تھا میرے پاس۔" کویتا کو سب ہی عائشہ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

" کیا... آ...؟" مومنہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔دوسرے پل اس کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔جسے دبانے کو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔بخت بی بی بھی گھبرا کر اس کی طرف لپکی تھیں۔

" تم چلو' میرے ساتھ اور پلیز خود کو کمپوز رکھو۔تمہیں ہی اسے سنبھالنا ہے۔" وہ کسی کام سے اپنی خواب گاہ میں گیا اور پھر اسی تیزی سے باہر آ کر داخلی دروازے کی طرف دوڑ گیا۔اس اندوہ ناک دھچکے پر مومنہ کو خود پر کنٹرول رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔تاہم غازی شاہ کی ہدایت پر خود کو سنبھالے رہی۔

طلحہ احمد شدت سے ان دونوں کا منتظر تھا۔مومنہ تو آتے ہی عائشہ کی طرف دوڑی اور اس کا کندھا جھنجوڑ کر اسے ہوش میں لانے لگی۔

غازی شاہ' طلحہ احمد کے ساتھ کاؤچ کی طرف بڑھا اور آہستگی سے چادر کا کونا اٹھا کر ماتا جی کا چہرہ دیکھا۔بے نور آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔مگر ان میں کوئی وحشت نہیں تھی۔لب یوں وا تھے جیسے مدھم مسکراہٹ کو چھو رہے ہوں۔یہ چہرہ موت کی خاموشی کے باوجود زندگی کی حرارتوں سے پر دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک عائشہ کی سسکیاں بلند ہوئیں۔وہ مومنہ کے سینے سے لپٹی اس تکلیف دہ حادثے پر ماتم کناں تھی۔پھر یکدم وحشت کے عالم میں مومنہ سے الگ ہوئی اور خون آلود مورتی کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔" میں پرکاش کی ہتیا کر دوں گی۔اسے نرک میں جھونک دوں گی۔اس نے میری بے قصور ماں کا خون کیا ہے۔"

وہ مورتی اٹھا کر پاگلوں کی طرح اسے دیوار پر مارنے لگی۔

" انارکسٹ ہندو! تو نے میری ماں کی ہتیا کی ہے۔میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔اس بھومی میں بھی اور حشر کے دن بھی۔" مومنہ اسے سنبھالنے لگی۔

" اسے لے جاؤ مومنہ! یہاں کسی بھی پل فوجی درندے آ سکتے ہیں اور یوں بھی یہ ہندو آبادی ہے۔" غازی شاہ کو عائشہ کے واویلا پر تشویش ہونے لگی۔مگر عائشہ مومنہ کا ہاتھ جھٹک کر کاؤچ پر پڑے ماتا جی کے بے جان وجود سے لپٹ کر زار زار رونے لگی۔

کمرے میں ایک دل دوز اداسی کی فضا تن گئی تھی جس میں عائشہ کی سسکیاں گونجتی اور دم توڑتی رہیں۔

مومنہ کی آنکھوں سے اشک بے آواز بہتے رہے۔وہ بہ مشکل خود کو کمپوز کرتی آگے بڑھی اور عائشہ کو نرمی سے اپنی بانہوں میں بھر کر کمرے سے باہر لے گئی۔

☆...☆...☆

موت سے بے شک کسی کو رستگاری نہیں ہے۔ جب اجل آ جاتی ہے نہ ہی ایک ساعت پیچھے ہوتی ہے نہ ہی ایک ساعت آگے۔ خواہ کوئی دولت میں قارون، تکبر میں فرعون، ظلم وجبر میں ہلاکو، شہ زوروں میں رستم، حسن میں حضرت یوسفؑ، صبر میں حضرت ایوبؑ، درازی عمر میں حضرت نوحؑ، عشق میں مجنوں، سخاوت میں حاتم، گریہ وزاری میں حضرت یعقوبؑ، جہالت میں ابوجہل، فلسفۂ اسلام میں امام غزالیؒ، صدق میں ابوبکر صدیقؓ، جہاد میں صلاح الدین ایوبیؒ سیاحت میں ابن بطوطہ، رتبۂ شہادت میں امام حسینؓ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی ترشی ہر ذی روح کیلئے ہے مگر موت کے ہمراہ بربریت کا ایسا مظاہرہ بہر حال ایک انسانی دل کیلئے تکلیف دہ تھا۔ عائشہ کی ماں کی اندوہناک موت کا غم مولوی خضر محمد کے پورے گھرانے کو پہنچا تھا۔ مومنہ اسی کو اپنے ہمراہ ہی لے آئی تھی۔ وہ سوئم تک اسی کے پاس رہی۔

ماتا جی چونکہ مسلمان ہو چکی تھیں۔ ان کو اسلامی طریقے سے سپرد خاک کیا گیا تھا۔

" یہ بہت بڑی سعادت ہے بیٹا۔ جو صرف اور صرف مسلمانوں کو نصیب ہوتی ہے۔ موت تو ہر ذی روح کو آنی ہی ہے مگر تمہاری ماں ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں۔ جنہیں شہادت کی موت نصیب ہوئی۔ ایک حسین موت نصیب ہوئی۔ ایسی شہادت کی تمنا تو ان جوانوں کے دل میں بھی امڈتی رہتی ہے اور وہ اپنی جان کو ہتھیلی پر لیے ہر وقت شہادت کی خواہش میں دم بھرتے رہتے ہیں۔" بخت بی بی نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

عائشہ نے شدت کرب سے لب دانتوں میں دبا کر آنسوئوں پر بند باندھنے کی ناکام کوشش کی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے جھرنوں کی طرح پھوٹ نکلے۔ وہ بخت بی بی کے سینے سے لگ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

انہوں نے اسے رونے دیا۔ خود ان کا دل بھی درد کی تپش سے جھلستا محسوس ہو رہا تھا۔

" زندگی میں آنے کا تو فقط ایک ہی راستہ ہے مگر جانے کے ہزاروں راستے ہیں۔ بھلا ہم کس کس راستے پر رکاوٹ بٹھا سکتے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو ہے ہی موت پر موقوف، اس سے کسی کو رہائی نہیں ہے۔" مولوی جی مسجد سے لوٹے تھے۔ روتی ہوئی عائشہ کے سر پر نرمی اور شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

طلحہ احمد اور غازی شاہ دروازے پر ہی رک گئے تھے۔ مومنہ نے ان کیلئے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں دوسرے دروازے سے بیٹھک میں چلے گئے۔

" مجھے یوں لگ رہا ہے۔ مولوی جی، جیسے یہ میری کوتاہی تھی۔ میں پرکاش کی دھمکیوں کے باوجود ماتا جی کی حفاظت نہ کر سکی۔ انہیں اکیلا چھوڑ آئی۔"

" نہیں، یہ تمہاری کم فہمی ہے بیٹا! کیا تم اس خدا سے زیادہ طاقتور ہو جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ کیا تم اپنی ماں کی اٹل موت کو ٹال سکتی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ اونچے اونچے قلعوں میں بند ہو کر خود کو موت کے پنجے سے بچا لیتے۔ نہیں بیٹا، قضا آسمانی قدرت یزدانی ہے۔ اس میں کسی بندۂ ناچیز کی نہیں چلتی۔" مولوی صاحب تخت پر بیٹھ گئے اور تسبیح تکیے کے نیچے رکھ کر بولے۔

" ایک دفعہ امیر مہدی کے عہد میں سخت قحط پڑا تھا۔ اس نے اپنے خزانے کا منہ فی سبیل اللہ کھول دیا مگر قحط کی مصیبت پھر بھی کم نہ ہو پا رہی تھی۔ وہ سخت اداس و ملول تھا اور ایک دن بستر پر حسرت زدہ سا لیٹا تھا۔ پاس بیٹھے خادم سے بولا کہ کوئی کہانی سناؤ کہ دل بھلے۔

خادم کہنے لگا کہ۔" ہند کی سرزمین کے کسی بیابان میں ایک شیر ژیاں رہا کرتا تھا۔ سب درندے جنگل کے اس کی خدمت میں حاضر رہتے۔ ایک دن لومڑی نے اس شیر سے کہا کہ تو ہمارا بادشاہ ہے اور ہم تیری رعیت۔ بادشاہ پر رعیت کی رعایت بہر صورت لازم ہے۔ اب مجھے ایک ضروری سفر درپیش ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میرا بچہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ تیرے سپرد کروں تاکہ تو اس کو اپنی پناہ میں رکھے اور کسی دشمن کا چنگل اس تک نہ پہنچنے پائے۔ شیر نے یہ بات قبول کی۔ لومڑی اپنا بچہ اس کے حوالے کر کے سفر پر روانہ ہو گئی۔ شیر نے اس بچے کو اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا تاکہ کوئی درندہ اسے گزند نہ پہنچا سکے۔ ناگاہ ایک عقاب اپنا طعمہ تلاش کرتا ہوا اڑتا پھر رہا تھا۔ اس کی نگاہ لومڑی کے بچے پر پڑی وہ شیر کی پیٹھ پر سے جھپٹا مار کر اس بچے کو لے اڑا۔

جب لومڑی سفر سے واپس آئی تو بچے کو نہ دیکھ کر شیر سے بولی۔" کیا تم نے عہد نہ کیا تھا کہ میں تیرے بچے کی حفاظت کروں گا۔"

شیر نے کہا۔" ہاں' میں نے ذمہ لیا تھا کہ کوئی جانور زمین کا اس کا بال بیکا نہ کر پائے گا۔ لیکن جو بلائے ناگہانی آسمان کی طرف سے نازل ہو تو میرا کوئی ذمہ نہ تھا۔"

امیر یہ کہانی سن کر رو رو کر التجا کرنے لگا کہ۔" بے شک' زمین سے جو کچھ فتنہ و فساد اٹھے تو اسے رفع کروں مگر قضائے آسمانی میں بندۂ ناچیز سے کیا ہو سکتا ہے۔"

" بس بیٹی! انسان بے اختیار ہے آنے والی بلا' مصیبت کو ٹالنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے یہ سوچ کر کہ تمہاری ماں نے کتنا بلند مرتبہ پا لیا ہے۔ اس پاپی دنیا سے کتنی پاک صاف ہو کر گئی ہے۔ اس زندگی کی طرف جو دائمی ہے۔" مولوی خضر محمد کی باتیں عائشہ کا دل بہلانے لگیں۔

بخت بی بی نے نرمی سے اسے خود سے لگا لیا۔ وہ جس ذہنی آزار سے گزری تھی اور گزر رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان سب کو تھا اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ اس کا سر تھپکنے لگیں۔

☆...☆...☆

کیا زمین پہ کم ہو گئی تھی بوئے وفا

کہ دور ہم سے ستاروں میں جا کے بیٹھ گئے

مومنہ نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے دیکھا وہ صحن میں شام کی خنکی سے بے نیاز جالی کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔

شاید اپنے اندر کے حبس اور گھٹن سے گھبرا کر وہ کھلی فضا میں نکل آئی تھی۔

مگر جو گھٹن اندرونی خلفشار سے جنم لے رہی ہو اس کا تدارک بیرونی فضا کیسے کر سکتی ہے۔ یہ تو عائشہ کے اپنے اندر کے خلفشار سے جنم لینے والی گھٹن تھی۔

وہ باہر آ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو عائشہ؟" اس نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا تو وہ مومنہ کی طرف پلٹی۔

"سوچ رہی ہوں بلکہ آج شدت سے تمام کشمیری مسلمانوں کے گھروں کا دھیان آ رہا ہے جو انتہا پسند ہندوئوں کے ہاتھوں پامال ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ جو بھارتی فوج کے درندوں کے ہاتھوں اذیتوں کو سہہ رہے ہیں۔ پہلی بار مجھے ان کے زخموں اور اذیت کا احساس اپنے دل اور روح پر تپکتا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ زخم کشمیری عورتیں مسلسل کئی سالوں سے اپنے کمزور وجود پر سہتی آ رہی ہیں۔ آخر کہاں اور کب ختم ہوں گی یہ ظلم کی راتیں؟ کہاں رکے گا ظلمت کا یہ کارواں؟" وہ مغموم لہجے میں بولی۔

مومنہ نے اس کا ہاتھ تھام کر دبایا۔ "ہر تکلیف کے بعد راحت ہے۔ ہر رات کی اخیر سحر پر ہوتی ہے اور میری طرح ہر مسلمان کو یقین ہے کہ اس آگ اگلتی، ظلم کی چکی میں پستی وادی کی بھی سحر ہو گی۔"

"شاید میں ابھی بہت کمزور ہوں۔ میرا ایمان تم جتنا پختہ نہیں ہوا۔ میرے اندر تمہارے جیسا یقین اور صبر نہیں آیا۔ تبھی تو میں اس طرح کی باتیں کرنے لگتی ہوں۔" عائشہ افسردگی سے مسکرائی۔

"نہیں عائشہ! انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ اسے اگر اپنے نفس پر اختیار کامل ہوتا تو وہ بشریت کے مقام پر فائز نہ ہوتا۔ بلکہ فرشتگی کی صف میں ہوتا۔ ہم انسانوں کا یقین اس لہر کے مانند ہے جو امڈ کر سر اٹھاتی ہے مگر دوسرے

پل بے یقینی کے ساحل پر سر پٹخ کر ریت میں جذب ہونے لگتی ہے۔ یہ کھیل عمر بھر چلتا رہتا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ مولوی صاحب کی باتیں سن کر ایسا ہی یقین کسی لہر کی طرح سر اٹھاتا ہو۔"

"ہاں بالکل، ان کی باتیں سن کر تو مجھے ڈھارس ملتی ہے مگر پھر..." ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے عائشہ نے عجیب بے بسی سے مومنہ کی طرف دیکھا۔

"اچھا چلو چھوڑو، آئو اندر چلو! یہاں ٹھنڈ بہت بڑھ گئی ہے۔" مومنہ نے اسے صحن میں پھیلی خنکی کا احساس دلایا۔

"مومو! میں آخر کب تک یہاں پڑی رہوں گی؟" وہ بجائے اندر جانے کے تخت پر بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں میں بے چارگی آمیز کرب جھلک رہا تھا۔ ذہن و دل میں انتشار برپا تھا۔ ایک بے یقینی اب تک تھی جو اس کی ماں کی موت کی تھی۔ باپ کی موت کے بعد ماتاجی کا ہی سہارا تھا جن کی ناگہانی موت اس کیلئے زلزلہ ہی تھی جس نے اس کے دل کی دنیا کو تہس نہس کر ڈالا تھا کہ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب کچھ بس کھنڈر ہی کھنڈر ہو چکا تھا۔ کچھ بھی قابل شناخت نہ رہا تھا۔ اور وہ اپنے منتشر خیالوں کے اس کھنڈر میں بے کل، مضطرب پھر رہی تھی۔ اسے اپنا آپ باد صرصر میں اڑتے تنکے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

مومنہ کے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے کندھوں پر محسوس کر کے اس نے اپنی نم نم آنکھوں کو اوپر اٹھا کر اسے دیکھا اور کرب سے لب بھینچ لیے۔ "مشکلیں اور پریشانیاں، رنج اور غم یہ سب ہمیں کمزور کرنے نہیں

بلکہ مضبوط کرنے آتے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ سے متعارف کراتے ہیں کہ ہمارے اندر حالات کو فیس کرنے کی کتنی صلاحیت ہے اور ہے بھی یا نہیں... یہ ہمیں صرف بیدار کرنے آتے ہیں پریشان کرنے نہیں۔'' اس نے نرمی سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ پھیلا لیا۔

'' یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ مولوی صاحب اور بی بی تمہارے اپنے بزرگ ہیں۔ کیا تم اس گھر کو صرف سرائے سمجھ رہی ہو جہاں کچھ دن رہ کر تمہیں چلے جانا ہے؟''

'' نہیں مومنہ! بات یہ ہے کہ میں وہاں اس لیے جانا چاہتی ہوں کہ وہاں ماتا جی کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔''

'' پاگل مت بنو عائشہ! وہاں جانا اور رہنا تمہارے لیے کسی طور ٹھیک نہیں ہے۔ ہم تمہیں دشمنوں کے حوالے تو کرنے سے رہے۔''

'' آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو مومو!... اگر میری موت ہو گی تو کہیں بھی آ جائے گی۔ کیا تمہیں وشواس نہیں ہے اس بات پر۔'' وہ مومنہ کی پریشانی بھانپ کر ذرا سا مسکرائی جواباً اُس نے اسے باقاعدہ گھورا۔

'' اب خدا نے یہ بھی نہیں کہا کہ آگ پر ہاتھ رکھ کر بچنے کی دعا کرو کہ ہاتھ نہ جلے۔ تدبیر کا راستہ خود قدرت نے ہی رکھا ہے۔ تدبیر سے ہی تقدیر سنورتی ہے اور توکل یہ ہے کہ اونٹ باندھ کر پھر تقدیر پر چھوڑ دیا جائے۔ اسے میدان میں کھلا چھوڑ کر تقدیر کو آزمانے نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ یہ تو توکل نہ ہوگا' نادانی ہو گی۔ چلو اب بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ نہ سوچا کرو اتنا۔ جانتی ہو طلحہ احمد نے مجھے سخت تاکید کرتے ہوئے کہا

تھا کہ میں تمہیں یہاں سے ہرگز نہ جانے دوں۔'' مومنہ بالآخر اسے کہہ گئی۔ وہ بات جو طلحہ احمد نے اسے کہی تھی۔ مگر اس تاکید کے ساتھ کہ وہ یہ بات اس کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے طور پر کہے۔

عائشہ کو یکدم اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پہلو سے جیسے کوئی متلاطم لہر اٹھی مگر اندر ہی کہیں دم توڑ گئی۔ جیسے سمندر کی بپھری ہوئی موج ساحل پر آ کر دم توڑ دے۔

بس لحظہ بھر اس کا خوش فہم دل اسی مانوس سی اتھاہ میں ڈوب کر ابھرا تھا۔ مگر دوسرے پل اسے خود پر اور اس خوش فہم دل پر ہنسی آ گئی جو لمحوں میں خوش فہمی کی خوش نما چادر بن لیتا تھا۔

آہ سچ ہے کہ صرف صحرا ہی انسان کو سراب میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ کسی کا کوئی لفظ' کوئی جملہ دل کو چھو کر دھوکا دے جاتا ہے۔

'' یہ طلحہ احمد کی بڑائی ہے کہ وہ بھی تم سب کی طرح خیر خواہ ہے۔'' وہ تخت سے اٹھ گئی۔

'' بات سنو!'' مومنہ ہلکے سے مسکرائی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔'' تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا نا کہ اب زبان شرم سے خاموش ہو جائے تو آنکھیں خود بخود بولنے لگتی ہیں۔ وہ راز کھولنے لگتی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے الفاظ کی نہیں احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ اپنے ہاتھ کا تسلی آمیز دباؤ اس کے کندھے پر بڑھاتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔

"اور یاد ہے یہ بھی کہا تھا کہ عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کے جسم کی ساری خوبصورتیاں خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ لیکن ناپسندیدہ مرد کیلئے عورت اپنی ساری جسمانی خوبصورتیاں کسی کچھوے کی طرح اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ایسا کسی شعوری کوشش کے تحت نہیں کرتی بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے۔"

"مومنہ..." عائشہ نے اس کی بات کاٹ کر اسے عجیب بے چارگی آمیز کرب سے دیکھا۔ مگر باوجود چاہنے کے زیادہ دیر تک نہ دیکھ پائی۔ اس کی خوش نما مسکراتی آنکھوں میں کچھ ایسی شرارت اور لپک تھی کہ عائشہ کو اپنا چہرہ ان دیکھی آگ میں دہکتا محسوس ہونے لگا۔ اس کی پلکیں رخساروں پر ہولے سے لرز کر جھک گئیں۔

"کتنی عجیب بات ہے نا کہ اکثر وہی باتیں تشہیر ہو جاتی ہیں جنہیں انسان خود سے بھی چھپاتا پھرتا ہے۔"

مومنہ نے اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کو ہلکے سے کھینچا اور ہنس دی۔

عائشہ نے اسے دیکھا کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ فقط کپکپا کر رہ گئے۔ اسے لگا اس کے دل کو سینے کی چار دیواری میں کوئی کوٹنے لگا ہو۔

"مجھے میری ہی نظروں میں مت گراؤ مومو' میں... میں..." اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں کے کناروں سے بے اختیار دو موٹے موٹے قطرے پھسل پڑے۔

"کہاں طلحہ احمد! اور کہاں میرا حقیر بے توقیر وجود۔ وہ تو دیوتا ہے جن کو صرف پوجا جا سکتا ہے۔ پانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میں بہت پاپن ہوں۔ بہت پاپن عورت' اس فرشتہ صفت انسان کے لائق نہیں۔" وہ آنسو روکتی مومنہ کو ششدر چھوڑ کر بھاگتی اندر چلی گئی۔

مومنہ فرط رنج سے وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ عائشہ اپنے اس احساس کمتری سے اب تک نہیں نکل پائی ہے۔ اب تک وہ خود کو بے توقیر اور حقیر سمجھتی ہے۔ وہ سخت آزردگی کی لپیٹ میں آ گئی۔

رات بھی وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی لاشعوری طور پر عائشہ کے بارے میں ہی سوچ جا رہی تھی۔ جب غازی شاہ نے اس کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"اگر میرے تصور میں گم ہو تو یہ یقیناً میری خوش قسمتی ہو گی۔ اگر میرے علاوہ کچھ اور سوچا جا رہا ہے تو یہ سراسر زیادتی ہے' میرے ساتھ۔"

وہ چونکی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی۔ "زیادتی ہی ہو رہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے میں نے مخل ہو کر اپنے حق میں بروقت کام کیا۔" اس نے گیلا تولیا ایک طرف ڈالا اور اس کی طرف قدرے جھکا۔

"ہوں' کون ہے وہ رقیب روسیاہ' جس کے تصور نے مجھ سے غافل کر دیا تمہیں کہ میں مجسم' سالم کا سالم تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہوں۔"

"غازی... میں عائشہ کیلئے بہت فکر مند ہوں۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ وہ ایک پاگل حساس لڑکی ہے۔"

"ایک منٹ' ایک منٹ!" غازی شاہ ہاتھ اٹھا کر جلدی سے اسے روکتے ہوئے بولا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ پاگل اور حساس میں کیا قدر مشترک ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں غازی!" وہ اداس ہو گئی۔ غازی شاہ کے سرخ ہونٹوں کی تراش میں مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

"اس سے زیادہ میرے لیے خوشی کی بات کیا ہو گی کہ تم سنجیدہ ہو اور میں یہی چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے حقیقتاً سنجیدہ ہی رہو۔ اچھا اچھا' اب ظالم بیویوں کی طرح مت گھورو کہ میں مسکین شوہر کی طرح کسی کونے میں دبکنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

"اتنے ہی مسکین ہو نا تم!" وہ مصنوعی پن سے گھورنے لگی۔

"اچھا چلو کہو' کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ اپنے کرتے کی آستین فولڈ کرتا ہوا تکیہ اٹھا کر بیڈ کراؤن سے لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

"میں عائشہ کیلئے بہت پریشان ہوں۔ وہ ذہنی طور پر بہت منتشر ہے۔ ایک بات کہوں غازی!" وہ بالوں کو لپیٹتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا لہجہ کسی خیال سے پرجوش ہوا۔

"آہا... ٹھیک کہتے ہیں کہنے والے۔ شوہر کی ایک بات میں کتنے ہی مطلب ہوتے ہیں اور بیوی کی ایک بات میں کتنے ہی مطالبے ہوتے ہیں۔"

"ابھی تو میں نے ایسا کوئی مطالبہ کیا نہیں ہے اور آپ سننے سے پہلے ہی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے ہیں۔" وہ اس کے ٹھنڈی سانس... کھینچنے پر برا مان کر بولی۔

وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"نادان بیوی! پہلے ہی ٹھنڈی سانس کھینچ لوں' کیا خبر سننے کے بعد سانس لینے کی بھی مہلت ملتی ہے یا نہیں۔"

اس کا انداز... شگفتہ سا تھا۔ سنہری آنکھوں کی سطح پر بڑی خوبصورت چمک تھی۔

مومنہ کو اس کا یہ روپ بہت مختلف اور خاصا دلکش لگا۔ ہمیشہ سنجیدہ' بردبار اور کم گو دکھائی دینے والے اس شخص کی ذات کا یہ پہلو اس پل بہت واضح طور پر مومنہ پر روشن ہوا تھا۔ وہ محجوب سی ہو کر اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے بولی۔

"دانا کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے مرد موسم بہار کی طرح ہوتا ہے اور شادی کے بعد موسم سرما کی طرح۔ مگر لگتا ہے آپ پر تو ایک ہی موسم ٹھہر گیا ہے۔" وہ سکول گرل کی طرح یکدم جھینپ گئی تھی جبکہ غازی شاہ کا قہقہہ برجستہ تھا۔

"تو کیا تم چاہتی ہو مجھ پر موسم سرما ہی ٹھہر جائے۔ آہ کس قدر ناشکری بیوی ہو کہ..." اس نے ایک متاسفانہ سانس کھینچی اور ہنس پڑا مگر دوسرے پل قدرے سنجیدگی سے بولا۔

"ڈاکٹر عائشہ کیلئے تو حقیقتاً میں بھی پریشان ہوں۔ اس کا ابھی اپنے گھر جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ جبکہ قاتل سے ہم بھی خوب واقف ہیں۔ اس کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

"یہی تو بات میں بھی اسے سمجھاتی آ رہی ہوں مگر مصر ہے۔ وہ پرکاش سے اپنی ماں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔" مومنہ فکر مندی سے بولی۔

غازی شاہ نے چونک کر دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں' اسے سمجھاؤ۔ یہ اس کی بہت بچکانہ سوچ ہے۔ بی بی سے کہو کہ وہ اسے سمجھائیں۔" غازی شاہ کو عائشہ کے خیالات سے خوف محسوس ہونے لگا۔

"اس کو اپنی ماں کی موت کو مشیت ایزدی سمجھ کر ہی قبول کرنا ہو گا۔ اسی میں عافیت ہے۔ اسے کہو یہ بزدلی نہیں ہے۔ یہ مصلحت ہے۔ ان حالات میں جب یہاں سرکار ہی مسلمانوں کی دشمن ہو۔ ان کا دین اور ان کا نام نشان مٹا دینے کے درپے ہو۔ ایسے حالات میں بہت سے جذبوں پر بند باندھنے پڑتے ہیں۔ صبر کے جام پینے پڑتے ہیں اور اسے مصلحت ایزدی سمجھ کر اپنا معاملہ اسی خدائے واحد کے ہاتھ میں سونپ دینے کا نام صبر' رضا اور توکل ہے۔ تم کیسی دوست ہو۔ اب تک اس کا دل نہیں بہلا سکیں۔" اس کے لہجے میں خفیف سرزنش تھی۔

"اگر آدمی اس طرح بہلاوؤں سے بہل جاتا تو دنیا کے آدھے مسائل ختم ہو جاتے۔" وہ افسردہ سانس بھرتے ہوئی بولی۔

"کچھ غم انسان اپنے دل میں کسی قیمتی متاع کی طرح رکھتا ہے۔ کسی سے شیئر نہیں کرنا چاہتا یا چاہتے ہوئے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ یہ غم صرف اور صرف اس کا اپنا ہوتا ہے اور وہ بھی شاید اسے خود تک رکھنا چاہتی ہے۔

تسلی کے دو لفظ آنکھوں سے بہنے والے آنسو تو روک دیتے ہیں مگر دل میں جلنے والے الاؤ کو تو وقت ہی دھیرے دھیرے بجھاتا ہے نا۔ جو زخم زہر بن جاتے ہیں ان کا تدارک کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" وہ بیڈ سے اترنے لگی کہ غازی شاہ نے اس کی نرم کلائی پکڑ کر اسے واپس بٹھایا۔

"کمال ہے۔ مجھے خبر ہی نہ تھی کہ میری بیوی صرف سرجن ہی نہیں گفتار کی غازی بھی ہے۔" اس کے انداز میں خفیف سی شرارت تھی۔

"کیا مطلب؟ میں آپ کو اپنی گفتارانہ صلاحیتوں کے کمالات دکھا رہی ہوں۔" اس نے اپنی خوش نما آنکھوں کو مصنوعی خفگی سے پھیلایا۔ "جناب یہ صرف میرے دل کی آواز ہے۔ کوئی لفاظی نہیں۔"

"اچھا... تو پھر اس دل کی آواز کی لے کو ذرا تیز کر کے کسی خوشگوار گفتگو کی طرف کچھ دیر کیلئے موڑ دو۔ ہم جیسوں پر احسان ہو گا۔" وہ اس کے خوبصورت چہرے پر نگاہیں جمائے جمائے بولا۔ اس کا انداز کچھ ایسا معصومانہ تھا کہ مومنہ بے اختیار امڈنے والی ہنسی نہ روک پائی پھر اس کا ہاتھ ہٹا کر بیڈ سے اتر گئی۔ فلاسک سے اس کیلئے دودھ گلاس میں ڈالتے ہوئے سوچا کہ وہ طلحہ احمد اور عائشہ کی بات کس طرح کرے۔

اس نے محسوس کیا۔ آج غازی شاہ صرف اور صرف اس کی محبت آمیز چھاؤں میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ جو اس کا حق بھی تھا اور پھر خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ غازی شاہ سے کس طرح کہے کہ وہ طلحہ احمد سے بات کرے۔ اسے عائشہ کے جذبوں سے آگاہ کرے۔

کبھی کبھی اسے لگتا طلحہ احمد تک یہ آنچ خود پہنچ چکی ہے اور وہ جان کر اغماز برت رہا ہے۔ مگر کبھی لگتا وہ ہر شے سے بے نیاز ہے۔ اس کے دل میں دنیا کی طرف سے کوئی رغبت ہے ہی نہیں، اور ہے بھی تو بہت محدود، ثانوی... اور جبکہ غازی شاہ کا کہنا تھا۔ وہ ایک اڑیل لڑکا ہے۔ اسے جو کام کرنا ہو گا تو اسے دنیا کی کوئی طاقت وہ کام کرانے سے نہیں روک پائے گی مگر جس شے پر اسے نگاہ نہیں ڈالنی ہو گی۔ کوئی لاکھ کہے وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور مومنہ نے سوچا۔ ”ایسے اڑیل لوگوں کے دل جانے کیسے ہوں گے۔“

دلوں کے بھید سے واقف ہونا ایک بشر کیلئے کہاں ممکن ہے۔ غازی شاہ کے ٹرانس میٹر سے کال آ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کچھ دیر کیلئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس خفیہ ٹرانس میٹر پر وہ عموماً تنہائی اور یکسوئی سے بات کرنا پسند کرتا تھا۔

☆...☆...☆

کشمیر کا حسن کبھی ہر آنکھ کو خیرہ کیا کرتا تھا۔ اس کے سر بفلک پہاڑوں، مسحور کن وادیوں، دلکش جھیلوں اور رنگا رنگ پھولوں کی منظر آفرینی میں آنے والا کھو جاتا تھا۔ جلال الدین اکبر بھی اس خوش نما خطے میں آیا تو اس کے حسن کی جھلملاہٹوں میں کھو کر بے اختیار پکار بیٹھا تھا۔

ایں سبزہ وایں چشمہ وایں لالہ وایں گل

آں شرح ندارد کہ بہ گفتار دو آید

مگر آج اس خوابوں کی سرزمین، جنت نظیر فلک بوس کوہساروں کی جادونگری کا حسن اس کی رعنائیاں، زیبائیاں بارود کی بو اور بھارتی فوج کے بھیڑیوں کے غلیظ قدموں کی دھمک سے مستقل آلودہ رہنے لگی ہے۔ وہاں بھارتی استبداد کے پنجے تلے دبی مسلمان آبادی کی دل دوز چیخیں، معصوم بچوں کی دلخراش آوازیں، عفت مآب خواتین کی اندوہناک سسکیاں گونج رہی ہیں۔

کشمیری مسلمانوں کی ہر صبح ایک خوف اور بربریت کے نئے نظارے سے ہونا اب ان کا مقدر بن کر رہ گیا ہے۔ مائیں اپنے دل کے ٹکڑوں کو گھروں سے رخصت کر کے ان کی واپسی تک خیر وعافیت کی دعائیں مانگتے نہیں تھکتیں۔

عائشہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہاں تو ہر کشمیری ماں کا دل کٹا پھٹا ہے۔ زخموں سے چور ہے۔ مگر وہ ان پر صبر کی پیوند کاری کیے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہیں مگر ان کا سینہ جوان بیٹوں اور اپنے سہاگ کی شہادتوں پر فخر سے تنا ہوا ہے۔ جس طرح بھارتی درندگی اور بربریت ہر روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی طرح ان کا ایمان یقین اور بھی مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے دل اس آگ میں تپ تپ کر کندن بن چکے ہیں... ان سچے ہیرے موتیوں جیسے دلوں کے آگے عائشہ کو اپنا غم بے حد حقیر اور ہیچ دکھائی دینے لگا۔

”کیا میں مجاہدہ نہیں بن سکتی بی بی؟“ اس روز وہ بے حد امید اور آس سے بھری معصومیت سے بخت بی بی سے کہہ رہی تھی اور دروازے میں داخل ہونے والا طلحہ احمد دروازے پر ہی ٹھٹک گیا۔

” پگلی! بھلا یہاں کی عورت جہاد سے الگ ہے۔“ بخت بی بی اس کا سر تھپکتے ہوئے بولیں۔ ” یہاں کی ہر مسلمان عورت اپنا تن من دھن اسلام کے نام پر لٹانے کو تیار ہے۔ ہر آن وہ جہاد میں شامل ہے۔“

” مگر میں عملی طور پر کچھ کرنا چاہتی ہوں بی بی!“ اس کے اندر عجیب تڑپ تھی جس سے وہ خود بھی نئی نئی آشنا ہوئی تھی۔ عجیب سے محسوسات ہو رہے تھے۔ فنا فی اللہ کے دائمی بقا کی خواہش جو فنا کے بعد ملتی ہے۔

” ہم سب کا کام دعائے خیر کرنا ہے ان مجاہدوں کے لیے دست دعا پھیلائے رہنا ہے جو اسلام کی بقا کیلئے اپنی جان کو ہتھیلی پر سجائے مصروف پیکار ہیں جو ہاتھ ان مجاہدوں کیلئے دعاؤں کیلئے بلند ہوا۔ وہ بھی جہاد میں شامل ہے۔ جو جسم ان کی خدمت کیلئے مصروف ہوا وہ بھی جہاد میں شامل ہے۔ تمہارا جذبہ قابل تحسین ہے بیٹی!“

” مگر یہ آگ کیسے بجھے گی جو میرے اندر سلگ رہی ہے؟“ وہ عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

” ہر آگ بجھنے والی اور بجھا دینے والی نہیں ہوتی۔ اس کا جلا رہنا روشنی کی علامت ہوتا ہے اور روشنی زندگی کی علامت ہے۔“ طلحہ احمد کی آواز گونجی تو بی بی کے ساتھ عائشہ بھی چونکی اور پلٹ کر دیکھا۔

” یہ آگ تو جتنا دہکتی ہے اور بھڑکتی ہے۔ اتنا ہی عروس جاں مہکتی ہے۔ اس کی تپش دلوں کو سلگاتی نہیں ہے بلکہ انہیں کندن بناتی ہے۔ اس کا سینے میں جلا رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

عائشہ ایک بے خودی کے عالم میں اسے دیکھے گئی مگر بے خودی کا یہ وقفہ مختصر تھا۔ وہ اپنے ہی کسی احساس سے گھبرا کر نظروں کے ساتھ سر بھی جھکا گئی۔

نیلے رنگ کے اسکارف میں اس کا چہرہ انوکھی آگ سے دہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ طلحہ احمد نے بھی نظروں کا زاویہ سرعت سے بدلا تھا پھر ابرو کو ہلکے سے جنبش دیتے ہوئے بخت بی بی سے بولا۔

” میں آپ خواتین کی گفتگو میں مخل ہونے پر معذرت خواہ ہوں۔ بس یونہی بے ارادہ یہ کہہ گیا۔“ وہ اپنے اس غیر اختیارانہ فعل پر شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔

” نہیں، طلحہ احمد! آپ نے تو مجھے ایک نئی روشنی دکھائی ہے۔ مجھے اس آگ سے ایک نئی زندگی ملتی محسوس ہو رہی ہے۔ ایک انوکھی توانائی۔“ عائشہ یہ کہتے ہوئے چوکی سے کھڑی ہو گئی پھر سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔

طلحہ احمد نے یونہی نظریں ذرا سی اٹھا کر اسے جاتے دیکھا۔ وہ قطعی نہ جان پایا کہ وہ کس روشنی کی، کس زندگی کی بات کر رہی تھی... یا شاید جان کر بھی انجان بن رہا تھا۔

☆...☆...☆

عائشہ ڈیوٹی روم میں آئی تو اسے اطلاع ملی کہ پرکاش اس سے ملنے آیا ہے۔ مومنہ نے اس کے متغیر چہرے کو دیکھ کر جلدی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

” نہیں عائشہ! تم اس سے نہیں ملو گی۔“

" کیوں؟ کیوں نہیں ملوں گی؟" اس نے مومنہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا جیسے کسی خیال کو دبا رہی ہو۔ آنکھوں میں سارے جہاں کی نفرت جھلکنے لگی تھی۔

" اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں' سوائے تماشا بننے کے۔"

"ہاں' تماشا تو ضرور بنے گا مگر صرف پرکاش کا۔"

" خدا کیلئے عائشہ!" مومنہ اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی مگر وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ڈیوٹی روم سے نکل گئی۔ اس کا رخ پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ جہاں پرکاش اپنی بائیک کے پاس کھڑا اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ دوسرے پل وہ چہرے پر نہایت مکارانہ اداسی سجاتا ہوا بولا۔

" مجھے ماتاجی کے مرن کی خبر مل گئی تھی پر چونکہ وہ مسلمان ہو گئی تھیں۔ اس کارن میں آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ سوچا تم جانے کیا سوچو اور غصہ نہ کر بیٹھو۔"

" مسلمان تو میں بھی ہو چکی ہوں' پھر آنے کی ہمت کیسے کر بیٹھے؟" وہ اپنے اندر غصے کا اٹھتا ابال دباتے ہوئے طنزیہ بولی۔

" تم سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔ مگر وہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔ یوں کھڑے کھڑے... اگر تم فارغ ہو تو میرے ساتھ چلی چلو۔" وہ اس کے طنزیہ لہجے اور جملے کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے بولا جیسے ان کے مابین

ہمیشہ سے ہی بڑے دوستانہ تعلقات رہے ہوں۔ اس کے اس ناٹک نے عائشہ کے اندر لگی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔

" تمہارے ساتھ چلی چلوں تاکہ کسی گوشے کنج میں لے جا کر میرا گلا دبا دو۔ میری بھی ہتیا کر ڈالو۔"

" کیا کہہ رہی ہو کویتا! چلو آئو' میرے ساتھ۔" اس نے پہلے ذرا حیران ہونے کی ایکٹنگ کی پھر اسے پچکارتے ہوئے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ بدک کر یوں پیچھے ہٹی گویا بچھو نے اس کی کلائی پر ڈنک مار دیا ہو۔

" بند کرو یہ ناٹک! تم کیا سمجھتے ہو۔ میں کچھ نہیں جانتی؟ یاد رکھو ماتاجی تو شہادت کے مرتبے پر فائز ہو چکی ہیں اور مجھے اس کا غم نہیں ہے۔ پر تمہیں میں معاف نہیں کروں گی۔ کمینے تجھے میں معاف نہیں کروں گی۔" وہ ایکدم پھٹ پڑی تھی۔

" عائشہ...!" مومنہ بھاگ کر آئی مگر عائشہ پر تو گویا خون سوار ہو گیا تھا۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح پرکاش پر پل پڑی اس کا چہرہ اور گریبان نوچنے لگی۔

پرکاش اس حملے کیلئے قطعی تیار نہیں تھا۔ ذرا سا لڑکھڑایا تاہم بڑی سرعت سے اس نے اپنے حواس سنبھال لیے۔

" تجھے میں مار ڈالوں گی۔ تو نے میری جنت اجاڑی ہے۔ مجھ سے میرا سائبان چھین لیا اور اب... اب مجھ سے پریم جتانے چلے آئے ہو۔ بے رحم' ظالم انارکسٹ ہندو' میں تمہارا خون پی جائوں گی۔ میں ساری جنتا کو بتائوں گی تو میری ماں کا قاتل ہے۔"

ڈاکٹر عائشہ اس پل اس بات سے بے نیاز تھی کہ وہ اپنے ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں ہے اور ایک ذمے دار ڈاکٹر ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے تو بس اس کی ماں کی خون آلود لاش تھی اور پرکاش کا مکروہ چہرہ۔ وہ اس کا خون کر دینے کے درپے تھی۔ ہاتھوں اور ناخنوں سے ہی اس کا قتل کر ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک مومنہ نے پرکاش کو جیب سے ریوالور نکالتے دیکھ کر زوردار چیخ ماری۔

"عائشہ، پیچھے ہٹو۔" مگر وہ جنونی دیکھ ہی نہ پائی۔ مومنہ نے خود ہی اسے اتنے زور سے اپنی طرف کھینچا کہ پرکاش کے ریوالور سے نکلنے والی سنسناتی گولی عائشہ کے سینے میں اترنے کے بجائے اس کے بازو کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔

مومنہ کے یوں کھینچنے پر عائشہ بھی توازن قائم نہ رکھ سکی تھی اور آہنی جنگلے سے ٹکرا کر پچھلی طرف گھاس کے قطعے پر جا گری۔ فائرنگ کی آواز سے پارکنگ لاٹ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار بھاگتا ہوا آیا۔ مگر اس اثنا میں پرکاش بائیک سنبھال چکا تھا۔

مومنہ نے دہشت کے عالم میں آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ ہی چت گری عائشہ کو دیکھا۔

ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ گولی اس کے جسم کے پار ہوتی۔ جھرجھری لے کر وہ جھٹکے سے اٹھ گئی۔

عائشہ کا چہرہ بالکل ساکت تھا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلے آسمان کو تک رہی تھیں۔ وہ پارکنگ لاٹ میں ہونے والی بھگدڑ اور ارد گرد جمع ہونے والے لوگوں سے بے نیاز تھی۔ شاید اب تک اسے اپنے نزدیک

موت کی آہٹیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔ وہ اس سے بھی بے نیاز تھی کہ اس کے بازو کی پھٹنے والی جلد سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔

اس تکلیف سے کہیں زیادہ اس کا دل اذیت سے دوچار تھا۔

پرکاش کا سامنا اور پھر اس کا یوں کھلے ڈلوں اس پر گولی چلا دینا گویا وہ اس کے قتل کی نیت سے ہی آیا تھا۔

مومنہ نے اس کا بازو ہلکے سے چھوا تو وہ پلکیں جھپک کر جیسے ذہنی طور پر بیدار ہونے کی کوشش کرنے لگی۔

" اٹھو، خون بہت بہہ رہا ہے۔ پاگل لڑکی، بال بال بچی ہو۔" وہ ڈاکٹر گیتا کی مدد سے اسے اٹھانے لگی اور اپنے گرد اکٹھا ہوتے ہوئے مجمع سے عائشہ کو نکال کر ایمرجنسی وارڈ میں لے آئی اور بیڈ پر لٹا دیا۔

عائشہ کے وجود پر اب بھی ایسا سناٹا طاری تھا۔ جیسے ہوا سے محروم چاند پر ہوتا ہوگا۔ وہ بس خشک بنجر آنکھوں سے مومنہ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے زخم کا معائنہ کر رہی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار نہ تھا جیسے اس حادثے کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

" اگر لمحہ بھر کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گولی جسم میں پیوست ہو جانی تھی۔" مومنہ اسے فہمائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

" اچھا ہی ہوتا، آتما کو بدن کے جنجال سے نجات مل جاتی۔" اس کے ہونٹوں پر دھیمی افسردہ مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

مومنہ نے اس کے زخم پر مرہم لگاتے ہوئے اسے گھورا اور کچھ کہنے کا ارادہ کیا کہ دروازے سے ڈاکٹر جگن ناتھ کے ہمراہ ایم ایس ڈاکٹر موہن اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کو اس حادثے کی اطلاع مل چکی تھی۔

'' بھگوان کی کرپا ہو گئی کویتا جی! میں تو اس حادثے کا سن کر پریشان ہو کر بھاگا چلا آیا۔'' جگن ناتھ کی حواس باختگی ان کے چہرے سے ظاہر تھی جو عائشہ کی حالت قدرے بہتر دیکھ کر آہستہ آہستہ دھوئیں کے غول کی طرح چھٹنے لگی۔

''ہاں' یہ خاصا پریشان کن حادثہ تھا۔ کھلی دہشت گردی تھی۔ آپ بے فکر رہیں۔ اس حادثے کی کارروائی ضرور ہو گی۔ مجرم بچ کر نہیں جا سکے گا۔ ہم آج ہی ایف آئی آر کٹوا دیتے ہیں۔'' موہن صاحب بولے۔

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان بکھیڑوں میں الجھنا نہیں چاہتی۔'' عائشہ جلدی سے بولی۔ وہ کسی بھی قسم کی پولیس کارروائی کے لیے تیار نہیں تھی۔

''مگر یہ آپ کا حق ہے۔ آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔'' ایم ایس صاحب کے چہرے پر تفکر کے سائے تھے۔ جس میں خفیف سی حیرت بھی شامل ہوئی۔

''حق کی بات چھوڑیئے۔ یہاں کس کو حق ملتا ہے موہن جی! بہر حال آپ کی بڑی مہربانی۔ میں اس قصے کو یہیں ختم کر دینا چاہتی ہوں۔'' اس کا انداز دو ٹوک تھا۔

''سوچ لیجئے ایسا نہ ہو کہ بھاگ جانے والا مجرم ایک بار پھر ایسی اوچھی حرکت کرنے کا سوچے۔'' جگن ناتھ اسے پر تشویش نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر کسی خیال کے تحت بولا۔ ''کہیں یہ کوئی آپ کا خاندانی جھگڑا تو نہیں تھا؟''

''جی ایسا ہی تھا۔ وہ میرا ریلیٹو ہے اور ہماری خاندانی رنجش ہے۔'' عائشہ بلا تامل سر ہلا گئی۔ جگن ناتھ نے ایم ایس موہن راج کی طرف دیکھا پھر ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں کوئی حق تو نہیں پہنچتا کہ آپ کے پرسنل افیئر کو ڈسکس کریں پر میرا ذاتی خیال ہے بلکہ مشورہ ہے کہ آپ سکیورٹی کے لیے پولیس کی مدد ضرور حاصل کریں۔''

مومنہ نے دیکھا جگن ناتھ کی اس بات پر عائشہ کے چہرے پر ایک استہزائیہ آمیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

''بھوش کے لکھے کو تو کوئی نہیں مٹا سکتا جگن جی! ہر منش کے انت کا ایک دن اس کے بھاگ میں لکھا جا چکا ہے۔'' پھر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''یو ڈونٹ وری اباؤٹ می۔ اب وہ دوبارہ ایسا وار نہیں کرے گا۔'' جگن ناتھ کندھے اچکا کر ایم ایس کے ہمراہ واپس ہو لیے۔

مومنہ نے بھی یہاں سے جانے کا سوچا۔ اس کے خیال میں اپنی اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر سارے ڈاکٹرز فرداً فرداً اس واقعے کی تفصیل پوچھنے آتے رہیں گے۔ عائشہ نے بے حد نقاہت محسوس کرنے کے باوجود اس کے خیال سے اتفاق کیا تھا۔

اس کے اندر غم کا ایک الاؤ دہکنے لگا تھا۔ گاڑی جونہی گھر کے راستے پر پہنچی اس کی آنکھوں کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ مومنہ کے کندھے سے لگ کر رو پڑی۔

"شکر کرو خدا نے تمہیں بچا لیا۔" وہ اس کا سر سہلانے لگی اور اسے رونے دیا تا کہ جی کا غبار نکل جائے۔

"ویسے جگن ناتھ کا مشورہ اتنا غلط بھی نہیں ہے۔ تمہیں ایف آئی آر کٹوانی چاہئے۔" اس نے سر اٹھایا تو وہ اپنے اسکارف سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"چھوڑو مومو! کیسی بات کرتی ہو تم بھی۔ یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی انصاف نہیں ہے۔ کوئی قانون نہیں ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بے گناہ مسلمانوں کو ذبح کر رہے ہیں اور جگن ناتھ کہہ رہے ہیں' میں قانون کی' پولیس کی مدد حاصل کروں اور سکیورٹی کے لیے۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے اداسی اور افسردگی سے ہنسی۔ "بلکہ میں تو کہتی ہوں یہاں انسان کے لیے انصاف ہے ہی نہیں۔ انسان کا انصاف دھوپ میں رکھی برف کی طرح ہے جو ذرا تیز دھوپ پڑی پگھل گیا۔ جب انصاف مانگنا ہی ہے تو اصل منصف سے کیوں نہ مانگیں جو انصاف کرنے اور دینے پر قادر ہے بلکہ مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ اس سے بھی انصاف نہیں اس کی رحمت مانگو۔ چونکہ ہم سب انسان پاپی ہیں' خطاکار ہیں' انصاف مانگیں گے تو انصاف ہی ملے گا اور ہماری خطائیں بھی ہمارے سامنے کر دی جائیں گی۔ ہاں رحمت مانگنے سے ہمارے پاپ اور خطاؤں کی ضرور بخشش ہو جائے گی تو بس جب آج اس نے اپنی رحمت سے بچا لیا ہے تو کیا وہ آئندہ نہ بچائے گا۔"

مومنہ حیرت زدہ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں اور لبوں کی تراش میں پھیلی افسردہ مسکراہٹ میں کتنا اعتماد تھا۔ کتنا یقین تھا۔ وہ بے عنوان سی خفت محسوس کر کے رہ گئی اور بے اختیار اسے خود سے لگا لیا۔

"سنو تو بی بی کو کچھ نہ بتانا۔" گاڑی گھر کے دروازے پر رکی تو عائشہ نے اسے تاکیداً کہا۔ "بس کہہ دینا ایک جنونی مریض نے گلاس توڑ دیا تھا جس کا کانچ لگ گیا۔" وہ بازو پر لگی پٹی پر اشارہ کرتے ہوئے بولی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

مومنہ نے پلکوں کے پار اترنے والی نمی کو انگلی کی پوروں سے پونچھتے ہوئے سوچا۔

بہر حال وہ اس واقعے کا ذکر مولوی صاحب سے ضرور کرے گی تا کہ وہ کوئی بہتر رائے دیں۔ ایک نادیدہ خوف سا اس کے سینے کی دیوار سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔ مگر دوسرے روز اسے موقع ہی نہ ملا۔ بھارتی درندے مولوی خضر محمد کو مقامی مسجد سے جمعہ کی نماز کے بعد گرفتار کر کے لے گئے جب وہ واعظ دے رہے تھے۔

"یاد رکھیں اپنی آزادی اور خود مختاری کو قائم دائم رکھنے کے لیے عزم' ہمت جرات اور قوت بازو سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے والی قوم کبھی محکوم اور مغلوب نہیں رہ سکتی۔

محکومیت اور مغلوبیت کے پنجے میں وہی جکڑے جاتے ہیں جو زندگی سے پیار اور موت سے فرار اختیار کرتے ہیں اور حاکم اور غالب اقوام سے پھر آزادی کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

مولانا مثنوی نے ایک بہترین حکایت بیان کی ہے۔اس سلسلے میں۔"

پھر وہ حکایت بیان کرنے لگے کہ۔:"ایک شخص نے طوطے کو پکڑ کر پنجرے میں بند کرر کھا تھا اور ہر روز اسے چوری کھلاتا' اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔لیکن قیدی طوطا آزاد فضاؤں میں بلند پرواز سے محرومی کے باعث دل ہی دل میں کڑھتا رہتا اور ہر وقت قید تنہائی میں باغ و بہار کو یاد کر کے خون کے آنسو روتا۔ایک بار اس کے مالک کو کسی دوسرے ملک کا سفر درپیش آیا گھر کے تمام افراد نے واپسی پر مختلف تحائف وہدیہ کے مطالبے کیے اور اپنی اپنی پسند کا اظہار کیا۔اس نے پنجرے میں بند طوطے سے بھی پوچھا۔"میاں مٹھو!تم بھی تو بتاؤ کہ دوسرے ملک سے تمہاری پسند کی کیا چیز لاؤں؟تمہاری کوئی خواہش ہو تو بتادو؟" اس نے سوچ کر جواب دیا۔

"بس میرا ایک کام کر دینا کہ وہاں تمہیں میرا کوئی بھائی ملے تو اسے میرا سلام عرض کر دینا۔چنانچہ وہ شخص دوسرے ملک پہنچا۔اپنا کام نمٹایا۔ایک دن اس نے قریب میں باغ کے ایک درخت پر بیٹھے ایک طوطے کو دیکھا تو اسے اپنے میاں مٹھو کا سلام پہنچایا۔طوطے نے اپنے غریب الدیار قیدی بھائی کا جو سلام سنا تو فوراً دم توڑ دیا اور درخت سے نیچے زمین پر آ گرا۔یہ دیکھ کر وہ آدمی حیران و ششدر رہ گیا اور اسے انتہائی قلق وافسوس ہوا۔جب یہ شخص واپس لوٹا ہر فرد اپنی مطلوبہ چیز پا کر نہایت خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔وہ شخص اپنے طوطے کے پاس گیا۔پنجرے میں لوہے کی سلاخ پر بیٹھے طوطے نے دریافت کیا۔

"حضور!آپ نے میرا سلام میرے بھائی کو پہنچایا کہ نہیں۔"

مالک نے جواب دیا۔"میں نے تمہارا سلام تمہارے بھائی تک پہنچایا لیکن مجھ سے اب تک یہ معما حل نہ ہو سکا کہ تمہارا سلام سنتے ہی وہ مر گیا اور درخت سے زمین پر گر پڑا۔" طوطے نے جونہی اپنے بھائی کے بارے میں یہ حیران کن خبر سنی تو فوراً اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی پھر وہ دم توڑ کر پنجرے میں ہی گر پڑا۔مالک کی حیرت وافسوس کا اب ٹھکانہ ہی نہ تھا۔کف افسوس ملتے ہوئے کچھ دیر بعد کوڑے کے ایک ڈھیر پر لے جا کر مردہ طوطے کو پھینکنے کے لیے پنجرے کو جھاڑا تو طوطا پھر سے اڑا اور سامنے ایک سرسبز پیڑ پر جا بیٹھا۔تب مالک نے اس راز کو سمجھا اور وہ خفیہ پیغام جو ایک آزاد پرندے نے اپنے اسیر بھائی کو بتایا کہ آزادی چاہتے ہو تو موت کو گلے سے لگاؤ اور عزت سے جینا چاہتے ہو تو مرنا سیکھو۔"

درحقیقت موت سے محبت ہی آزادی کے حصول کی بقا کے لیے ایسا طریقہ ہے جو جانور تک سمجھتے ہیں۔آج بھی آزادی اور غلبہ اسلام کے لیے جام شہادت پی کر موت کو اپنے گلے لگانے والے شاہین صفت مجاہدین اسلام یوں تو دنیا کی نظروں میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں لیکن خالق موت وحیات انہیں مردہ کہنے بلکہ مردہ گمان کرنے پر بھی پابندی عائد کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"اور اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے والوں کو مردہ گمان مت کرو۔بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس۔"

یہی شہادت کا جام پینے والے اسلام اور مسلمانوں کو کفر کے آہنی پنجے سے نجات دلاتے رہے ہیں۔یہی اسلام اور دین کے سپہ سالار ہیں۔"

ابھی ان کی اثر انگیز تقریر جاری تھی کہ اچانک مسجد میں بھارتی فوجی گھس آئے اور اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ ان میں چار فوجی مولوی خضر محمد کو بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے ایک بکتر بند گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

مومنہ ہسپتال سے لوٹی تو اس خبر نے اسے جذباتی کر دیا۔ اس کے اندر نفرت اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔

”کہاں جا رہی ہو مومنہ!“ بخت بی بی نے اسے جاتے دیکھ کر پکڑا۔

”میں ان درندوں کا منہ نوچ لوں گی۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ مولوی صاحب کو پکڑ کر لے جائیں۔ کیا قصور ہے ان کا؟ کس جرم میں پکڑا ہے انہیں؟“

”یہاں قصور کب دیکھے جاتے ہیں مسلمانوں کے۔ یہ تو اپنے من موجی ہیں جسے چاہا پکڑ لیا۔ جس کے گھر میں چاہا پل پڑے۔ ادھر آ کر بیٹھو تم۔ مولوی جی بہت برا منائیں گے۔“ بی بی اسے زبردستی پکڑ کر اندر لے آئیں۔

سڑکوں پر احتجاجی مظاہرے جاری تھے مگر مومنہ جانتی تھی ان مظاہروں پر فوج شیلنگ کرے گی، کھلی فائرنگ کر کے انہیں منتشر کر دے گی۔ کتنے اور شہید ہو جائیں گے، کتنے زخمی ہوں گے۔ ابھی کل ہی سری نگر کے علاقے نوشہرہ میں مجاہدین کے کیمپ پر حملہ کر کے تین مجاہدین کو شہید کر دیا گیا تھا اور ایک اور جگہ سات مجاہدین کو شہید کیا گیا تھا جس میں حزب المجاہدین کا ڈپٹی ایڈوائزر بھی شہید ہوا تھا۔ جس کا غم ابھی غازی شاہ کو کم نہ تھا کہ اب مولوی خضر محمد کو فوجی پکڑ کر لے گئے تھے۔

وہ غازی شاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا سرخ بٹن کا اشارہ ملنے کے باوجود جواب نہیں آ رہا تھا۔ اسے اور زیادہ تشویش ہونے لگی۔

”میں غازی شاہ کی طرف جا رہی ہوں بی بی!“ وہ اپنا بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ اس کے اندر گویا پنکھ لگ گئے تھے۔ بی بی جائے نماز سے اٹھ کر اس کی طرف آئیں اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پاگل ہو گئی ہے تو۔ ان حالات میں باہر نکلے گی جبکہ یہ درندے سڑکوں پر کھلی فائرنگ کر رہے ہیں۔“

”کیا خدا کی طاقت سے تو اپنی طاقت اور اپنے ارادے زیادہ مضبوط سمجھنے لگی ہے۔ کیا اوپر بیٹھا ہوا وہ اتنا بے بس ہے کہ صرف دعا سے وہ کچھ نہ کر سکے گا۔ ہمارا اختیار اس وقت اتنا ہی ہے کہ بیٹھ کر ان کے لیے خیر و عافیت کی دعا مانگیں۔ وقت اور حالات کے مطابق قدم اٹھانا دانش مندی ہے۔ مومنہ! ادھر آ کر آرام سے بیٹھو۔ غازی شاہ کو پیغام مل گیا ہو گا۔ وہ اتنا بے خبر نہیں ہے۔“ ان کے لہجے میں تحکم بھی تھا اور خفیف سی سرزنش بھی۔ وہ بے بسی سے تخت پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

دل میں غم و غصے اور نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور آدمی کچھ نہ کر سکتا ہو تو ایسی بے بسی دل کا ہی خون کرنے لگتی ہے۔ سلگانے اور جھلسانے لگتی ہے اور وہ بھی جھلس رہی تھی۔ بھارتی مظالم کے خلاف اس کا سینہ غم و غصے سے بھرا کوئی آتش فشاں ہو رہا تھا۔

☆...☆...☆

تیسرے روز بھی مظاہرے وقتاً فوقتاً جاری تھے کہ کرفیو لگا دیا گیا۔ مولوی خضر محمد کی کوئی خبر نہ مل پائی تھی۔

بخت بی بی نے تو ایک کمرے میں بند ہو کر خدا سے لو لگا لی تھی۔ یوں بھی ان کے دن کا آدھا حصہ عبادت میں گزرتا تھا اور آدھا گھر کے کام کاج میں۔

عائشہ اور مومنہ کی آنکھوں سے نیندیں اڑی ہوئی تھیں۔

غازی شاہ سے بھی کوئی رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ ایسے میں مومنہ کی بے قراری حد سے سوا ہو گئی تو اس نے غازی شاہ کی طرف جانے کا سوچا اور بخت بی بی کو بتائے بنا عائشہ کو رازداں بنا کر چپکے سے گھر سے نکل آئی۔ کرفیو کے باعث سڑکوں پر ہیبت ناک ویرانی محیط تھی۔ بس فوجی گاڑیوں کی گردش نظر آ رہی تھی۔ وہ ان کی ہوس زدہ نظروں سے بچ کر پہلے طارق ہاؤس پہنچی تا کہ پاپا سے کوئی مشورہ کر سکے۔ مما اسے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"کیا کروں مما! غازی سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں جمعہ کی نماز کے بعد سے اور اب تک کوئی خبر نہیں ملی ان کی۔ مجھ سے ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں جاتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ مما سے الگ ہوئی اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولی۔

"پاپا کہاں ہیں؟"

"وہ تو ممبئی گئے ہیں۔ کل تک آ جائیں گے۔"

"اچھا... پاپا نہیں ہیں۔" وہ مایوس ہو گئی۔ پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سانس بھرتے ہوئے بولی۔ "میں اب چلوں گی مما!"

"کہاں؟ کہاں جاؤ گی اس وقت؟" مما نے گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"غازی شاہ کی طرف۔"

"کیا بخت بی بی کو خبر ہے؟"

"نہیں۔" وہ نظریں چرا گئی۔ جواباً مما اسے سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھنے لگیں۔

"بہت خفا ہوں گی وہ۔ جانتی ہو وہ کیوں فکر مند ہیں تمہارے لیے؟"

"ہاں جانتی ہوں۔" اس پل اس کی پلکیں کسی احساس کے تحت جھک گئیں اور رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"اس کے باوجود... اس حالت میں تمہیں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح آرام کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی بھاگ دوڑ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اور یاد رکھنا یہ نقصان بہت بڑا ہو گا۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں مما!... کچھ نہیں ہو گا مجھے۔ آپ کی اور بخت بی بی کی دعائیں جو ساتھ ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی آمیز انداز میں دباتے ہوئے بولی اور مسکرا کر ان کے رخسار چوم کر باہر نکل گئی۔

مما کے لبوں سے بے اختیار افسردہ سانس خارج ہوئی۔ مولوی خضر محمد کی گرفتاری ان کے لیے بھی بے حد تشویش کن تھی۔

وہ غازی شاہ کی طرف پہنچی تو طلحہ احمد اسے دیکھ کر چونکا۔

"آپ... اس وقت؟"

"کیوں، کیا یہاں آنے کے لیے کوئی وقت مقرر ہے؟" وہ جھنجھلاہٹ سے بھری ہوئی تھی۔

"نہیں میرا مطلب ہے اس وقت حالات بے حد کشیدہ ہیں۔ آپ کو نہیں نکلنا چاہئے تھا گھر سے۔ یہ جگہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے اس وقت۔" پھر چپ ہو کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے غازی شاہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش تنے ہوئے تھے۔ ان میں ناگواری کے تاثرات بہت واضح تھے۔ مومنہ نے اسے دیکھتے ہی مولوی خضر محمد کی گرفتاری کی اطلاع دینی چاہی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، ہم بے خبر ہیں؟"

"تو پھر مجھ سے یا بی بی سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ ہم کس قدر پریشان تھے اور بی بی...!"

"نہیں بی بی ہر گز پریشان نہیں ہوں گی۔ میں جانتا ہوں۔" وہ قدرے ناراضی سے اسے ٹوک گیا۔ "اور تم کس قدر بے وقوف عورت ہو۔ ان حالات میں یہاں آگئیں۔ طلحہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں ایسے حالات میں گھر سے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔"

"حالات... یہاں حالات مسلمانوں کے لیے اچھے ہی کب ہیں؟" وہ کم سن ناراض بچے کی طرح بلبلا کر بولی۔ ایک لحظہ غازی شاہ کے بھینچے ہوئے لب مبہم انداز میں وا ہوئے تاہم دوسرے پل وہ لہجے میں ناراضی کا تاثر سموتے ہوئے بولا۔

"بہر حال تم واپس چلی جاؤ ابھی اور اسی وقت۔"

"کیا...؟"

"ہاں یہ میرا حکم ہے۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ مومنہ نے گھائل نظروں سے اسے دیکھا۔

طلحہ احمد نے بے ساختہ چہرہ دیوار کی طرف کر لیا اور دیواروں پر آویزاں پوسٹرز کی طرف دانستہ متوجہ ہو گیا۔

"تم نے سنا نہیں مومنہ! میں نے کیا کہا ہے؟" اب کے غازی شاہ کی سرمئی آنکھوں کے کانچ پر ناراضی بھی رقم ہونے لگی۔ وہ اس کے چہرے کی سرخی میں پھیلے غصے اور بے لچک لہجے پر بری طرح دکھی ہو گئی۔ گویا اس پل وہ کوئی بھی رعایت اسے دینے کو تیار نظر نہیں آرہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشے بے اختیار نم ہو گئے۔ وہ جھٹکے سے پلٹی اور دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

غازی شاہ لب بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا پھر ایک قدرے متاسفانہ سانس کھینچ کر رخ موڑا تو طلحہ احمد کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔

"کیا تم سرجن مومنہ کے ساتھ زیادتی نہیں کر گئے؟" اس کا لہجہ تادیبی تھا۔

"نہیں، ہر گز نہیں۔ میرا یہ رویہ حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق تھا۔" اس نے سر نفی میں ہلایا اور طلحہ احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ اس کا ابھی یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا اور مجھے یقین ہے۔ اس نے بی بی کو بھی اپنے گھر سے نکلنے کا نہیں بتایا ہوگا۔ ورنہ وہ اسے ہر گز نہ آنے دیتیں جبکہ میں بھی نہیں چاہتا کہ اسے کوئی گزند پہنچے۔ خاص کر اس حالت میں جب کہ وہ..." وہ کچھ کہتے کہتے یکدم لب دانتوں میں دبا کر چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک خوبصورت رنگ آ کر گزر گیا۔ وہ محض طلحہ احمد کا کندھا تھپک کر رہ گیا۔

طلحہ احمد اس کے چہرے پر پھیلنے والے اس رنگ کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ بہر حال وہ کم سن یا نادان نہیں تھا کہ خوشی کے وہ رنگ نہ پہچان لیتا جو غازی شاہ کو یقیناً ایک قلیل مدت کے بعد ملنے والی تھی اور جس کی جھلملاہٹ کا عکس ابھی سے اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"مولوی جی کے بارے میں ہمیں بالکل ٹھیک اطلاع ملی تھی طلحہ!" غازی شاہ کمرے میں پھیلی اس فضا کو کاٹتے ہوئے قدرے سنجیدگی اور رنجیدگی کے مشترکہ احساس کے ساتھ بولا۔

"ہاں سلطان کی اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔" طلحہ احمد نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"جانتے ہو سلطان نے ایک اور اطلاع بھی دی ہے۔ بے شک' شک ظاہر کیا ہے مگر اس کا شک بھی یقینی ہی ہوتا ہے۔"

"کیسی اطلاع...؟" اس نے چونک کر غازی شاہ کے پتھریلے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ہمیں یہ جگہ جتنی جلدی ہو سکے خالی کر دینی چاہئے۔ سلطان کے مطابق کسی وقت بھی یہاں فوج آ سکتی ہے۔"

"مگر کمانڈر! ہم یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتے ہیں جبکہ کئی ایسے زخمی اس وقت یہاں موجود ہیں جو علاج کے باوجود ابھی بھاگ دوڑ نہیں کر سکتے۔" طلحہ احمد کے چہرے پر الجھن اتر آئی۔

"ان تمام رفقاء کو میں پہلے ہی منتقل کر چکا ہوں۔" غازی شاہ بولا تو طلحہ احمد نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا تو دوسرے پل لب بھینچ کر ایک گہری سانس کھینچی۔

"مگر اس بار' دل چاہ رہا ہے ان کا مقابلہ کریں غازی!" طلحہ احمد کے اندر سے کوئی شوریدہ سی لہر سر اٹھانے لگی۔

"جذباتی مت بنو۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔" غازی شاہ نے اسے ٹوک دیا۔ اس کے بھینچے ہوئے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔ "ڈومزڈے تک میں خود کو ہر حال میں ان درندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"خدا تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے تاعمر' صرف ڈومزڈے تک کیا موقوف!" طلحہ احمد نے بے اختیار اپنے اس رفیق کے کندھے کو تھام لیا۔ ڈومزڈے کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک ابھر آئی تھی۔

غازی شاہ نے بے حد عقیدت مندانہ نظروں سے اسے دیکھا اور مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے بال بکھیر دیئے۔

''خدانے چاہاتو ہم اپنے خون کے آخری قطرے اور آخری سانس تک جہاد کرتے رہیں گے میرے رفیق! مگر یہ میری شدید تمنا ہے دعا ہے کہ خدا مجھے اس آپریشن تک ضرور زندگی عطا کرے۔''

''کچھ دن پہلے مولوی جی مجھ سے کہہ رہے تھے۔ غازی! میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ کشتواڑ ملٹری امیونیشن ڈپو سے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ وہ آگ اگل رہا ہے اور بھارتی سرکار بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر سر پٹخ رہی ہے۔ وہ سارا دھماکہ خیز مواد جو بے گناہ کشمیریوں پر استعمال ہو رہا ہے وہ جل کر بھسم ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مولوی جی ایسا ضرور ہوگا۔ یہ شعلے ضرور بلند ہوں گے۔ یہ خواب ضرور سچا ہوگا۔'' اس کی آواز میں کھنک شامل ہو گئی جیسے وہ تصور ہی تصور میں امیونیشن ڈپو سے شعلے بلند ہوتے دیکھ رہا ہو۔

''انشاءاللہ ایسا ضرور ہوگا۔'' طلحہ احمد کے بھی دل کی گہرائیوں سے صدا بلند ہوئی اور فضا میں عزم کے رنگ بکھیر گئی۔

☆...☆...☆

مومنہ گھر پہنچی تو عائشہ باورچی خانے سے نکل کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں نے بی بی کو بھی نہیں بتایا کہ تم باہر گئی ہو' کب سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ زہرہ آنٹی نے فون کیا تو مجھے پتا چلا تم طارق ہاؤس سے بھی چلی گئی ہو۔''

''میں غازی شاہ کی طرف چلی گئی تھی۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولی اور آنکھوں میں بھرے آنسوئوں کو چھپانے کے لیے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

''تم نے اسے بتایا کہ مولوی جی۔''

''اسے پہلے ہی خبر تھی۔'' وہ بیسن کا نل کھول کر منہ پر پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے سلگ کر بولی۔

''ہاں بی بی کہہ رہی تھیں کہ اسے خبر ہو چکی ہو گی۔ وہ اتنا بے خبر نہیں ہے۔''

''ہاں بس ایک میں ہی بے خبر ہوں۔'' ایک افسردہ سانس اس کے سینے کی تہ سے آزاد ہوئی۔ عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ تب اسے اس کی متورم آنکھیں نظر آئیں۔

''تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا غازی شاہ سے ملاقات نہیں ہوئی یا...؟'' اس کا دل لحظہ بھر میں ہزار وسوسوں میں گھر گیا۔

''مومی! کیا ہوا؟ بتائو نا پلیز! تم رو کیوں رہی تھیں؟ مولوی جی تو خیریت سے ہیں نا پلیز مومنہ!''

جواباً وہ بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رو پڑی۔ ''عائشہ! اس نے مجھے ڈانٹ دیا اور وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ میری کوئی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔'' وہ روتے ہوئے اسے بتانے لگی۔

عائشہ کی رگوں میں ٹھہر ٹھہر کر دوڑنے والا خون گویا رواں ہو گیا۔ اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تاہم اس کی افسردگی اور دل گرفتگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ہنسی کو اس نے ہونٹوں کے درمیان ہی دبا لیا۔

"پاگل! تم نے توڑا ہی دیا تھا۔ خیر اس نے ایسا کوئی غلط بھی نہیں کیا تمہارے ساتھ؟"

"کیا... اس نے غلط نہیں کیا؟" اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"تم بھی اس کی ہی سائیڈ لے رہی ہو۔ کیا وہ طلحہ احمد کم ہے کہ تم بھی..."

عائشہ کو اس وقت وہ ایک ذمے دار سرجن نہیں بلکہ ایک کم سن ناراض اور روٹھی ہوئی بچی محسوس ہوئی جس سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین لیا گیا ہو اور ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیا گیا ہو۔

"وہ تمہارا سب سے بڑا خیر خواہ ہے۔ ظاہر ہے کچھ سوچ سمجھ کر ہی تمہیں وہاں سے بھگایا ہوگا نا؟"

"مگر ایسی بھی کیا بے رخی۔" وہ سڑ سڑ ناک پونچھنے لگی۔

"ہاں کہ سلام تک نہ پہنچے۔" عائشہ محظوظ ہو کر کھلکھلائی اور اس کا سر اونچا کر کے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

"اسے کم از کم تمہیں آنکھوں کے راستے دل میں اتارنا تو چاہئے تھا۔ پلکوں پر بٹھانا چاہیے تھا۔ تمہاری سیوا کرنی چاہئے تھی۔ آخر کو تم ایسے خطرناک حالات میں دل ہتھیلی پر لے کر نکلی تھیں کہ پریتم کے قدموں میں جا کر ڈال دو گی مگر ہائے' اس نے ذرا بھی تو کرپا نہ کی۔ بڑا دشٹ نکلا۔"

"عائشہ کی بچی!" اس نے جھینپ کر اسے کشن اٹھا کر دے مارا۔ عائشہ نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔

"چلو آؤ کھانا کھالو۔ بی بی کو خبر ہو گئی کہ محترمہ کوئی معرکہ سر کر کے آئی ہیں تو تمہاری خیر نہیں۔"

"نہیں عاشی! بھوک بالکل نہیں ہے۔" وہ نرمی سے اس کی گرفت سے ہاتھ نکال کر کھڑکی کے پردے کھولنے لگی۔ پھر گہری سانس کھینچ کر صحن میں پھیلی نامانوس اداسی کو محسوس کرنے لگی۔

مولوی خضر محمد کے بنایہ چھوٹا سا مہکتا روشن گھر یکلخت یوں بے رونق ہو گیا تھا جیسے آسمان بنا چاند ستاروں کے۔

"ہاں بھوک تو آج مجھے بھی نہیں ہے۔ بخت بی بی نے بھی نہیں کھایا مومنہ! مولوی جی کو وہ لوگ کوئی گزند تو نہیں پہنچائیں گے نا۔" عائشہ آزردگی سے کہتی اس کے ساتھ کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"بی بی کہہ رہی تھیں اس سے پہلے بھی کئی بار مولوی جی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ پھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے طور پر ان کی اہانت کرتے ہیں۔"

"خدا کے فدائی کے لیے یہ اہانت نہیں ہے۔ یہ تو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے راستے کی معمولی تکالیف ہیں۔ مگر یہ عاقبت نااندیشن کافر نہیں سمجھ سکیں گے۔" مومنہ ہلکے سے مسکرائی پھر کھڑکی بند کرتے ہوئے بولی۔

"بی بی! کہاں ہیں؟"

"کمرے میں ہیں اپنے۔" عائشہ نے افسردہ سی سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

”پتا ہے عاشی! جب میں اور غازی چھوٹے تھے تو بی بی ہمیں بہت پیاری پیاری نظمیں اور گیت سنایا کرتی تھیں۔ ان کی آواز بہت پیاری ہے۔ ہمیں سنتے سنتے نیند آجاتی۔ میٹھی پر سکون نیند۔ آئو آج بھی ہم ان سے گیت سنتے ہیں۔“ وہ عائشہ کے ساتھ بخت بی بی کے کمرے میں چلی آئی۔

بی بی قرآن شریف جزدان میں لپیٹ رہی تھیں۔ ان دونوں کو آتے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے لبوں پر میٹھی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”سوئی نہیں ہو تم دونوں ابھی تک۔“ ان کا لہجہ معمول کے مطابق تھا مگر آنکھوں کے گوشوں پر نمی پھیلی ہوئی تھی جو دور ہی سے چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔

”نیند نہیں آرہی ہے بی بی!“ مومنہ نے ان کے کندھے سے سر ٹکالیا۔

”کیوں؟ نیند کیوں نہیں آرہی ہے؟ غازی یاد آرہا ہے؟ یہاں۔ وہ بھی تو کئی دنوں سے نہیں آسکا ہے۔“ انہوں نے اس کے بال بکھراتے ہوئے اسے چھیڑا۔ مومنہ نے دکھ کے شدید احساس سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”نہ، نہ مومنہ! ایک لفظ نہ کہنا۔ ایک آنسو نہ بہانا۔ خدا سے جب جنت کا سودا کر لیا ہے تو پھر رونا کیسا۔ دکھ کیسا؟ جو درجے وہاں ملیں گے، ان کے سامنے تو یہ سب ہیچ ہے۔“ انہوں نے اس کے کانپتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کے لہجے میں میٹھی میٹھی سرزنش تھی۔

عائشہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس کا دل بھی ملول تھا مگر وہ بی بی کے ہمت واستقلال کے اس پیکر کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتی اور سوچتی کہ اسے بھی مسلمان کشمیری عورت کی طرح یقین اور توکل کی ایسی ہی دولت مل جائے جس کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔

”آپ ہمیں کوئی گیت سنایئے نا بی بی! یاد ہے آپ بچپن میں مجھے اور غازی کو ہمیشہ لوری دے کر سلایا کرتی تھیں؟“ مومنہ اپنے آنسو حلق میں اتار کر دھیرے سے بولی اور ان کی گود میں سر ڈال دیا۔

”پگلی! اب تو بچی تو نہیں رہی۔“ بی بی ہولے سے ہنس پڑیں پھر عائشہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔ ”یہاں آئو عائشہ! ادھر میرے پاس آکر بیٹھو۔“

وہ اٹھ کر ان کے نزدیک آئی تو انہوں نے اپنے دائیں طرف اسے بٹھا لیا اور اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اسے خود سے قریب کر لیا۔

”ہاں آج ایک عرصے بعد میرا بھی دل چاہ رہا ہے کوئی گیت سنائوں۔“ ان کی آواز بے حد دھیمی تھی جیسے وہ اپنے آپ سے ہی مخاطب ہوں۔

”تو پھر سنایئے نا؟“ عائشہ بولی۔

بخت بی بی کچھ دیر کے لیے جیسے کہیں کھو سی گئیں۔ ان کی نگاہیں دیوار پر مرکوز ہو گئیں جیسے وہ وہاں کسی کو کھوج رہی ہوں۔ تلاش رہی ہوں۔ ان کا سفید چہرہ مدھم روشنی میں ایسا نورانی محسوس ہو رہا تھا جیسے چاند کے گرد مدھم مدھم سفید سا سحر انگیز اجالا، جو آنکھ کے راستے دل میں اترتا چلا جائے۔

عائشہ کی نظریں ان کے مہربان چہرے پر جم گئیں۔ چند لمحے توقف کے بعد بخت بی بی کی مدھم آواز ابھرنے لگی۔

''سینہ تیرا قرآں کے جواہر کا خزینہ
اور نطق تیرا دین کی شوکت کا نشاں ہے
ہر بندۂ مومن ہے تیرا منتظر دید
فرقت میں تیری میرا اقلیم محو فغاں ہے
ہر آنکھ تیری راہ میں مضطر' بے خواب
ہر قلب سسکتا ہوا فریاد کناں ہے
کس قاف کے کہسار میں محصور ہوا تو
کس دیو کے پنجے میں مقید تیری جاں ہے''

عائشہ کو لگا گویا کوئی میٹھا میٹھا دریا دھیرے دھیرے رواں ہو جو سنگلاخ چٹانوں اور ڈھلانوں کی مٹی کو سیراب کرتا جا رہا ہو مگر

خود اس دریا کے اپنے وجود کے اندر کوئی جوار بھاٹا ہو جو امڈتا جا رہا ہو۔

''کس دشت بلا خیز میں ڈالا گیا تجھ کو
مسجد بھی وہاں ہے تو بلا بانگ اذاں ہے
دی ہے تجھے کس گنبد بے در کی اسیری
جس کی نہ صدا ہے نہ کہیں اس کا نشاں ہے
کوئی تو بتائے کہ پریشاں ہے میرا دل
اک کشمکش جبر ہے بے بس میری جاں ہے
زہرہ سے کہو! پوچھے عطارد سے کہ وہ ماہ
کیا مشتری کے غم زدہ غازوں میں نہاں ہے
ہاتف کی ندا آئی' بس اب آگے نہ بڑھ اور
مانگ اس سے کہ جو ذات ہمہ دم ہمہ واں ہے
بے تاب نہ ہو اتنا تو بس اس پہ نظر رکھ
جو حافظ و دانائے ہمہ کون و مکاں ہے

گیت ختم کر کے انہوں نے ان دونوں کے سروں کو شفقت سے چوما۔ ان کی آنکھوں کے گوشوں میں موجود نمی کچھ بڑھی مگر لبوں پر ہنوز زندہ مسکراہٹ تھی۔

”مجھے بھی ایسا ہی یقین لا دیں بی بی! ایسا ہی سکون۔“ عائشہ سے رہا نہ گیا۔ اس کے لہجے میں تڑپ مچلنے لگی۔ ایک اضطراب ہلکورے لینے لگا۔

”یہ یقین اس واحد لاشریک کے حضور جھک جانے اور اپنے تمام معاملات اس کے سپرد کر دینے سے حاصل ہوتا ہے پگلی! جب خدا پر اعتقاد ہو اور موت ہر وقت یاد رہے تو دنیا کی مصیبتیں برداشت کرنا آسان لگنے لگتا ہے۔ دراصل جو دنیا کی حقیقت سے واقف ہو جاتے ہیں اور دنیا کو مادی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی تہ میں پیوست ہو کر اصلی ہستی تک پہنچتے ہیں اور اس کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ اس کے سوا ان کے نزدیک سب کچھ ہیچ اور بے سود ہے۔ جب وہ اس سے واقف ہو جاتے ہیں کہ اصل غم قلیل ہیں اور مسرتیں ان سے بھی قلیل تر تو بس ان مسرتوں کو قلیل جان کر ان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور غم و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ رہتے ہیں۔ غم کو اپنی ہستی کا ایسا ہی جزو لاینفک خیال کرتے ہیں جیسا کہ مسرت کو۔ اس لیے حوادث ان کی دل جمعی اور سکون خاطر کو نقصان نہیں پہنچاتے۔“ انہوں نے عائشہ کا چہرہ اوپر اٹھایا جو آنسوؤں سے نم تھا۔ پھر اس کے چہرے پر پھیلی بالوں کی لٹوں کو ہٹاتے ہوئے بولیں۔

”دنیا کی حقیقت کچھ نہیں ہے میری بچیو! یہ محض ایک پل ہے دار عاقبت کا... صاحب تمیز اس پل پر خانہ تعمیر نہیں کرتے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ۔ ”کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہل دنیا کو صبح و شام مختلف حالتیں بدلتی رہتی

ہیں۔ کوئی مرتا ہے اور اس پر لوگ روتے ہیں اور کوئی زندہ کہ اس کی عیادت ہو رہی ہے۔ کوئی مبتلائے مصیبت دنیا کا طلب گار ہے اور موت اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ کوئی غافل نادان غفلت میں پڑا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا حساب لینے والا غافل نہیں ہے اور پچھلے پہلوں کے کھوج پر جا رہے ہیں۔“

”بس دنیا میں ہر ایک شخص امید فردا کے دل خوش کن تصورات میں مگن ہے اور چاہتا ہے کہ آنے والا دن اس کے حق میں اچھے سے اچھا ہو۔ وقت گزرنے اور عمر کم ہونے کا اسے مطلق خیال نہیں ہے۔

ایک مرتبہ امیر مہدی نے ایک نیا محل تعمیر کروایا۔ خلیفہ نے فرمایا۔ ”کسی شخص کو اس محل کے نظارے سے منع نہ کیا جائے۔ ناظرین یا تو دوست ہوں گے یا دشمن۔ اگر دوست ہیں تو خوش و خرم ہوں گے اور ہمیں دوستوں کی خوش دلی مطلوب ہے اور اگر دشمن ہیں تو رنج اٹھائیں گے دل گرفتہ ہوں گے۔ ہر شخص کی یہی مراد ہوتی ہے کہ دشمن کو رنج پہنچے نیز وہ کوئی عیب ڈھونڈیں اور کوئی خلل کی بات بتائیں تو اس خلل کا تدارک کیا جا سکے اور نقص کو دور کر دیا جائے۔

ایک فقیر نے کہا۔ ”اس محل میں دو نقص ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے۔ دوسرا یہ کہ یہ محل ہمیشہ نہ رہے گا۔ خلیفہ اس کلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ محل غربا اور فقرا کے لیے وقف کر دیا۔“

اچانک ان کی آواز مدھم ہو گئی۔ اس میں بے پناہ نقاہت سمٹ آئی۔ وہ چپ ہو گئیں جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر کہیں رک کر پیاس سے خشک حلق کو مسوس رہا ہو۔

مومنہ نے انہیں جلدی سے بستر پر لٹا دیا۔ عائشہ نے پانی بھر کر دیا۔ پانی کے دو گھونٹ بھر کر انہوں نے گلاس واپس کر دیا۔ پھر ان دونوں کے چہرے پیار بھری نظروں سے تکتے ہوئے بولیں۔

''میری باتیں تم لوگوں کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔ ہاں' ذرا مشکل ہیں مگر آ جائیں گی۔ ایک دن ضرور آ جائیں گی۔ ایسا ہی یقین حاصل ہو جائے گا... بلکہ...''

''آپ سو جائیں بہت تھک گئی ہیں۔'' مومنہ نے جھک کر ان کا سر سہلایا۔

''ہاں شاید میں بہت تھک گئی ہوں۔'' انہوں نے اس کا نرم ملائم ہاتھ اپنے بوڑھے نحیف ہاتھوں میں تھام کر اپنے لبوں تک لے جا کر چوم لیا۔ نقاہت سے ان کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

''میرا دل چاہ رہا ہے میں تم دونوں سے بہت سی باتیں کروں' بہت سی۔ اپنی' مولوی جی کی' تمہارے اور غازی کے بچپن کی۔ ماضی کی' آنے والے دنوں کی' کشمیر کی آزادی کی' اس کے حسن اور دلکشی کی۔'' وہ بہ مشکل آنکھیں کھول کر ان دونوں کو تکنے لگیں پھر مدھم آواز میں بولیں۔

''جاؤ اب تم دونوں بھی جا کر سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' انہوں نے تکیے کے نیچے سے تسبیح نکال لی۔ پھر انگلیوں سے ہلکے ہلکے دانے گراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دونوں بے آواز کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆...☆...☆

صبح جہاں مولوی خضر محمد کی اچانک واپسی مسرت انگیز تھی وہاں بخت بی بی کا خاموشی سے اس دار فانی سے کوچ کر جانے کا صدمہ جاں گسل ثابت ہوا۔ رات کے جانے کس پہر وہ زندگی سے منہ موڑ گئیں۔

اسی صبح غازی شاہ کا خط بھی مومنہ کے نام آیا جو اس نے اپنے کسی رفیق کے ہاتھ بھیجا تھا۔

''پیاری مومنہ!

تمہارے جذبے سر آنکھوں پر مگر بہت سی ایسی وجوہات تھیں جو میں اس وقت تم سے بیان نہیں کر سکتا تھا اور تمہیں وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ تمہارے جاتے ہی حالات بہت خراب ہو گئے

تھے اور ہمیں بہت جلدی میں وہ جگہ چھوڑنا پڑی تھی۔ جس کی اطلاع ہمیں پہلے ہی مل چکی تھی۔ ہماری ان جگہوں پر اب بھارتی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے۔

جان غازی!

ہمارے ارد گرد زندگی تتلی اور پھول کی طرح نہیں کھلتی بلکہ جلتے شعلوں کی طرح رقصاں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں فطری تقاضے کبھی کبھار پس و پشت ڈالنے پڑتے ہیں۔ جذبوں کی لو نیچے کر کے احساسات کو مارنا پڑتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہیں میرے رویے سے تکلیف پہنچی ہو گی مگر اس کے باوجود یہ یقین ہے کہ تم مجھ سے

خفا ہونے کے باوجود خفا نہ ہو گی اور نہ ہی یہ بات بی بی کو بتائی ہو گی۔ یہ یقین تمہاری محبت نے ہی میرے اندر پیدا کیا ہے۔

مولوی صاحب کی رہائی پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ خدا ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔

اپنا خیال رکھنا مومی! میں بہت جلد تم سے اور بی بی سے ملنے آئوں گا مگر اس وقت میں اور میرے رفیق خصوصاً طلحہ احمد بھارتی آرمی کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔ ان کی نظریں ہم پر جمی ہیں۔ چند دن کشاکش سے گزریں گے۔ مولوی جی کو گرفتار کرنے کا مقصد بھی ہم دونوں کو منظر پر لانا ہی تھا۔ میں مزید چند ہفتے منظر عام پر نہیں آ سکوں گا۔ تم میرے لیے اور تمام مجاہدین بھائیوں کے لیے دعا کرتی رہنا۔ ہاں مومی! طلحہ احمد نے ڈاکٹر عائشہ کے نام سلام بھیجا ہے۔ یہ سلام تمہارے پاس امانت ہے اسے ضرور پہنچا دینا۔

کچھ جذبے چھپے رہتے ہیں۔ کبھی وہ عارضی طور پر کبھی عمر بھر۔ ان نازک کونپلوں کے مانند۔ جو پہاڑوں کے کناروں پر چشمے کے اطراف اگتے اور سیرابی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ طلحہ احمد کو میں نے کریدا تو پتہ چلا یہ بظاہر اڑیل، کم گو اور بے پروا، بے گانہ سا نظر آنے والا لڑکا تو بڑے چپکے چپکے عائشہ کی محبت کے احساس سے سیرابی حاصل کر رہا ہے۔ ہے نا پاگل!۔

ہاں سب مجھ جیسے تو نہیں ہوتے نا تمام تر جرات سے ہاتھ تھام کر استحقاق جما لینے والے۔ جان غازی! دل چاہ رہا ہے اس وقت اور بھی تم سے شرارت کروں۔ کوئی مہکتے جملے لکھوں مگر حالات اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ یہ سراسر خود غرضی ہو گی کہ ارد گرد سے کٹ کر اپنی ذات تک محدود ہو جائوں۔ اس وقت ہم سب

ایک بالکل نئی جگہ پر ہیں اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر میرے تمام رفقا آگ کے گرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ جبکہ میں ان تمام رفیقوں سے ہٹ کر ایک بوڑھے برگد کے مہربان تنے سے ٹیک لگائے تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور میرا یہ شریر رفیق طلحہ مجھے گاہے بگاہے شرارتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیال میں، میں اس وقت صرف تمہیں خط ہی نہیں لکھ رہا ہوں تم سے براہ راست مخاطب ہوں۔ ہاں مومی! کبھی کبھی تصور اتنا ہی جاندار ہو جاتا ہے اور مجھے کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو، سچ تو یہ ہے کہ جدائی میں تمہارا وجود مجھے اور زیادہ روشن دکھائی دینے لگتا ہے۔

میری پیاری رفیق حیات! مجھے فخر ہے تم پر کہ تم ایک خیر خواہ اور دست راست بیوی ہی نہیں ایک سعادت مند بہو بھی ہو۔ بی بی کی فرمانبرداری کرتی رہو۔ وہ تمہیں ہر طرح سے صحت مند اور خوش باش دیکھنا چاہتی ہیں۔ تمہیں ان کی ہر بات اور ہر مشورے پر عمل کرنا ہے۔ میں بہت جلد ملنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی تو میرا آنا ممکن نہیں ہے۔ ہم ایک آپریشن کی تیاری میں مصروف ہیں جس کی تفصیل میں ملاقات پر بتائوں گا۔ اب خط بند کر رہا ہوں تا کہ تمہارے مہکتے تصور سے باہر آ سکوں۔ بی بی کو بہت بہت پیار کہنا۔

والسلام۔

ان کی دعائوں کا متمنی

غازی شاہ

خط کے الفاظ مومنہ کی آنکھوں کے چمکتے پانیوں میں چکر کھانے لگے۔ اس نے اسی کاغذ پر چہرہ رکھ کر شدت کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ وہ اپنے اس مجاہد' وفاشعار' پیارے رفیق حیات کو کیسے بتاتی کہ بخت بی بی اب ان کے درمیان نہیں رہیں۔ وہ دعائوں کی ٹھنڈی چھایاان کے سروں سے اٹھ گئی ہے۔

مولوی جی کی واپسی کی خوشی اور بخت بی بی کی جدائی کا غم آپس میں گلے مل رہے ہیں۔

وہ خط بوجھل ہاتھوں سے تہ کرنے لگی۔ یہ کیسی خوشی تھی کہ آنسوئوں کی برسات میں منائی جا رہی تھی۔

'میرے رفیق! تمہارے الفاظ میرے دل کو چیر رہے ہیں۔ تم بے خبر ہو بی بی کی موت سے۔ یہ دکھ مجھے کاٹ رہا ہے۔ مولوی جی بھی تمہیں یہ خبر دینے سے معذور ہیں۔ جس طرح بھارتی درندے تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ ایسے میں تمہارا روپوش رہنا بہتر ہے۔' اس نے جیسے تصور میں غازی شاہ کو مخاطب کیا۔

خط اس نے کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھال کر رکھ دیا۔ یہ اس کے محبوب کا اس کے لیے زندگی میں پہلا نامہ شوق تھا۔ جس میں کچھ نہ لکھنے کے باوجود بہت کچھ لکھ دیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس خط پر نثار ہو جاتی۔ اس کے ہر لفظ کو کئی کئی بار پڑھتی اور گھنٹوں اس کے سحر میں جکڑی مسرور ہوتی رہتی مگر اب یہ احساس روح کو کانٹے کی طرح ادھیڑ رہا تھا کہ بخت بی بی کی دعائوں کا طالب' ان کی ذرا سی بیماری پر رات رات بھر ان کے سرہانے بیٹھنے والا بیٹا' ان کی موت سے بے خبر تھا۔

☆...☆...☆

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں

تو جدا ایسے موسموں میں ہوا

جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں

آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود

ایسا بے مثل عکس گر تھا وہ

سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا

ایسا انمول ہم سفر تھا وہ

اپنے دل میں سنبھال کر اس کو

آج ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اسے

ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی

آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے

اس کو کس روشنی میں دفنائیں

اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں

وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں

مولوی خضر محمد کے لیے یہ صدمہ کم نہ تھا۔ پینتیس سالہ رفاقت کی ڈور آن واحد میں ٹوٹ گئی تھی۔ رفیق حیات بھی ایسی قدم قدم پر حوصلہ بڑھانے والی جس کی موجودگی برکتوں اور مسرتوں کا باعث رہی اور اب عدم موجودگی سے ماحول پر ظلمت اور بے برکتی ٹپکتی محسوس ہونے لگی تھی۔ جو ایسے شجر سایہ دار کے مانند تھی جس کی چھاؤں میں آنے والے کو کبھی دھوپ کا احساس نہ ہوا تھا۔ اب آن واحد میں دھوپ نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

بڑی صبر آزما ساعتیں تھیں۔ مومنہ کو تو بارہا اپنا ضبط ٹوٹتا محسوس ہوا۔ وہ رونا چاہتی مگر آنسو پلکوں پر ٹھٹھر کر رہ جاتے۔ بی بی کی نصیحتیں یاد آنے لگتیں، مولوی خضر محمد کی باتیں اسے تھپکنے لگتیں۔

"یہ غم و خوشی اور تکالیف زندگی کی اصل غایت نہیں۔ اس کا منشاو مقصود تو یہ ہے کہ ہم ہمیشہ سرگرم عمل رہیں۔ ہم سب کو ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے بس! اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ کوئی کتنی دیر زندہ رہا، اہمیت اس بات کی ہے کہ کس طرح زندہ رہا۔ تم ایک مجاہد کی بیوی ہو۔ تمہیں تو عام عورت سے کہیں زیادہ مضبوط، دلیر اور صابر ہونا چاہئے۔ تمہیں بہت کچھ ابھی دیکھنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ زندگی کے نئے رنگ دیکھنا اور پرکھنا ہے۔ یہاں کے حالات سے لمحہ لمحہ گزرنا ہے۔ مغموم سوچیں ہمیشہ مغموم اور کمزور رکھتی ہیں۔ ہماری صلاحیتوں کو زنگ لگا کر انہیں ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ یقین کمزور ہونے لگتا ہے۔"

اس نے سر اٹھایا تو مولوی خضر محمد کے پر یقین چہرے پر نرم مسکراہٹ کی چاندنی بکھری ہوئی تھی جو گھپ اندھیرے میں روشنی کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی روشنی جو راستہ سجھاتی ہے جواباً وہ بھی مسکرانے لگی۔

ابھی کچھ دیر پہلے ایسا لگ رہا تھا گویا دل و دماغ کے سبھی راستے بند ہوئے جا رہے ہیں۔ بس خانہ دل میں غم زدہ ہوائیں سرسراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاید یہ یاس کی آخری اسٹیج تھی مگر یکایک اس کے بجھتے دل پر مولوی جی کے الفاظ نے کوئی پھونک سی مار کر شعلہ سا جلا دیا تھا۔ سوئے ہوئے احساسات بیدار ہونے لگے۔ نئی امنگ اور توانائی روح میں اترتی محسوس ہونے لگی۔

"جب سروں سے چھاؤں اٹھ جاتی ہے تو دھوپ کا احساس تو ہونے ہی لگتا ہے مگر جانتی ہو، پودوں کی طرح انسان کے لیے بھی یہ دھوپ اتنی ہی ضروری ہے۔

تم دیکھو ایک پودا مسلسل ایک ہی آب و ہوا میں رہے تو پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اسے صرف سایہ ملتا رہے تو اس کی جڑیں اندر ہی اندر گلنے سڑنے لگتی ہیں مگر جب ان پر دھوپ لگتی ہے تو جڑوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ پودے میں شادابی اور سیرابی آنے لگتی ہے۔ تو جتنی ضرورت سائے کی ہے، اتنی ہی دھوپ کی۔ یہ دھوپ چھاؤں تو انسان کی پرورش کرتے ہیں۔ اس کی صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔" اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"ہاں مولوی صاحب! مجھے بھی ایسا ہی لگنے لگا ہے کہ میں ایک عرصے سے کسی شیر خوار بچے کی طرح بی بی کی نرم آغوش میں محو خواب تھی۔ اب یکلخت ان کی گود چھن گئی تو بڑی ہو گئی ہوں۔ اپنے پیروں پر چلنے لگی ہوں۔" وہ پر عزم انداز میں مسکرانے لگی۔

"ہاں' میں غازی شاہ کی بیوی کو ایسا ہی باہمت اور باحوصلہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" مولوی خضر محمد اس کا سر تھپکنے لگے۔

"آج کے بعد آپ کو غازی شاہ کی بیوی کبھی کمزور دکھائی نہ دے گی۔ بلکہ بخت بی بی کی طرح بنے گی جو خود سائے کا متلاشی نہ ہو بلکہ دوسرے کے لیے سایہ دار شجر بنے۔" اس کے تراشیدہ ہونٹوں اور بھیگی پلکوں پر ہنوز مسکراہٹ برقرار رہی۔ مولوی صاحب نے شفقت سے اسے دیکھا پھر دھیان آنے پر بولے۔

"میری کل غازی شاہ سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بی بی کی موت کا بتا دیا۔" یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں ایک پل کے لئے میچ لیں اور تسبیح کے دانوں کو ہولے ہولے پھیرنے لگے۔

"دکھ تو ہوا ہوگا اسے یہ سن کر؟" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ "کچھ کہا اس نے؟"

"ہاں بشریت کا تقاضا ہے یہ تو۔" انہوں نے ایک نحیف سی سانس کھینچی۔

"کیا کہنا تھا اسے' اجتماعی دکھوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود کبھی کبھی انفرادی دکھ آدمی کو نڈھال کر دیتا ہے۔ بہر حال صد شکر کہ اللہ کے بندوں کی یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے' دائمی نہیں۔" انہوں نے کسی

خیال سے سر کو جھٹکا۔ اور افسردگی کے سحر سے نکلنے کی کوشش کی۔ تاہم ماحول پر کچھ دیر کے لیے بوجھل سا سکوت چھا گیا پھر اس سکوت کو مومنہ نے توڑا۔

"مجھ سے اس نے خط میں کسی آپریشن کا ذکر کیا تھا۔ مگر تفصیل نہیں بتائی۔"

"ہوں۔" مولوی خضر محمد فقط ہنکارا بھر کر رہ گئے۔ مومنہ نے کچھ کہنا چاہا پھر ارادہ ترک کر دیا۔ مولوی خضر محمد اس موضوع پر شاید کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہے تھے پھر اٹھ کر اندر چلے گئے جبکہ وہ وہیں صحن میں کیاری کے پاس بیٹھی رہی۔

اسے غازی شاہ کا انتظار شدت سے ہونے لگا۔ تاکہ وہ اس آپریشن کی تفصیل معلوم کر سکے اور خود بھی اس میں عملی طور پر شامل ہو سکے۔

"سچ ہے اہمیت اس بات کی نہیں کہ کوئی کتنی دیر زندہ رہا۔ اہمیت اس کی ہے کہ کس طرح زندہ رہا۔" اس کے اندر ایک نیا جذبہ کروٹ لے رہا تھا۔ ایک پر عزم سوچ جنم لے رہی تھی۔

☆...☆...☆

اس روز وہ عائشہ کے ساتھ ہسپتال جانے کو نکلی کہ اسے یاد آیا کہ غازی شاہ نے اسے اپنے خط میں ایک امانت بھیجی تھی جو اسے عائشہ کو دینا تھی۔

اس نے ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی روکتے ہوئے اس کی طرف رخ کیا۔

''عائشہ! تمہاری ایک امانت میرے پاس ہے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ وہ تمہیں دے دوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں کی تراش میں خوش کن مسکراہٹ پھیل گئی۔

''امانت' کیسی امانت؟'' عائشہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے ہنسی۔

''بھلا میری کون سی امانت تمہارے پاس آ گئی؟''

''بس دیکھ لو' آ گئی۔''

''بتا بھی دو۔ اب اتنا سسپنس مت پھیلاؤ۔''

''بتادوں...'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکی۔ ''مگر ڈر ہے کہیں بیٹھے بیٹھے تمہارا مارے خوشی کے دم نہ نکل جائے اور مجھے سنبھالنا پڑ جائے۔''

''مومو کی بچی! اب بک بھی دے۔'' جواباً وہ ہنسنے لگی پھر سنجیدگی سے بولی۔

''غازی شاہ نے اپنے خط میں طلحہ احمد کا سلام لکھا تھا جو تمہارے لیے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سلام طلحہ کی امانت ہے میرے پاس۔'' یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ہنکارا ابھر کر عائشہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بھی شرارت آمیز تبسم ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات نے اسے کوئی شرارت کرنے سے روک دیا۔

''یہ مذاق نہیں ہے عائشہ! اس نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ طلحہ احمد کو کریدنے پر پتا چلا کہ وہ...''

''پلیز...!'' دفعتاً وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپی اور اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے آہستگی سے ہٹا دیا۔

اس کی آنکھوں میں تحیر آمیز بے یقینی تھی مگر دوسرے پل وہ نظریں جھکا گئی۔ دل کے آس پاس وہی مانوس درد جاگنے لگا جسے وہ روز تھپکیاں دے کر سلاتی تھی مگر وہ کوئی چادر نہیں تھی کہ وہ اتار کر رکھ دیتی۔ یہ تو اس کے جسم سے کھال کی طرح لپٹا ہوا احساس تھا۔

''مسئلہ یہ ہے عائشہ کہ محبت کا پودا اپنی خوشبو سے ناواقف رہتا ہے مگر جب اس پر التفات کی ہوا چلتی ہے' توجہ کے جھکڑ چلتے ہیں تو وہ لہرا کر اپنی خوشبو سے خود بھی مانوس ہوتا ہے۔ طلحہ احمد کی زمین دل پر اگے اس پودے کے خوش نما پھولوں پر تمہاری محبت کی ہوا لہرائی ہے تو خوشبو پھوٹ نکلی ہے۔ کیا تم اس خوشبو سے منہ موڑ سکو گی' بولو...''

عائشہ کی لرزتی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ اس کی سیاہ زلفیں شانوں پر جھول رہی تھیں۔ اس پل اس کے چہرے پر یاسیت اور بے یقینی کی عجیب حزن آمیز دھند چھائی ہوئی تھی۔ طلحہ احمد کے ذکر سے اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ ایک گہری سانس کھینچ کر وہ کچھ کہے بنا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

ایک بار اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ''تم کسی سے محبت کرتے ہو تو اسے آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ لوٹ آئے تو اس کی پرستش کرو اور اگر واپس نہ آئے تو سمجھو وہ کبھی تمہارا ہوا ہی نہ تھا۔''

تو کیا اسے بھی طلحہ احمد کی پرستش کرنی چاہئے مگر پرستش تو وہ کرتی ہی آئی تھی۔ ایک مدت سے۔''

"عائشہ! اگر اس نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ جواب مانگا تو میں کیا کہوں گی؟" وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے لپکی۔ ڈیوٹی روم میں داخل ہوتے ہوئے عائشہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔

"اس نے سوال کب پوچھا ہے؟" ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے نازک ہونٹوں پر بکھر آئی۔

"تو تم یہ چاہ رہی ہو کہ وہ سوال نامہ بنا کر تمہارے ہاتھ میں تھما دے... یہ کہہ کر کہ سارے سوال لازمی ہیں۔ ہر جواب کے 20 مارکس ملیں گے اور پاس ہونے کے لیے 60 فیصد نمبر ضروری ہیں۔"

"نہیں' 33 نمبر ضروری ہیں۔" اس کی جھنجھلاہٹ اور گھورنے پر اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ یہ کہہ کر وہ مسکین سی صورت بنا کر سر جھکا کر جلدی سے ڈیوٹی روم میں چلی گئی۔

"بے ہودہ لڑکی!" مومنہ مکا تان کر اس کی طرف بڑھی مگر اس کے قریب آ کر یکدم ہنس پڑی۔

"پتا ہے میں طلحہ احمد کو کیا جواب بھیجوں گی؟" وہ بولی تو عائشہ کا دل سینے کی چار دیواری میں معمول سے ہٹ کر دھڑکا۔ کندھے پر لٹکتے بیگ پر اس کی انگلیاں ذرا سی کانپیں۔ اس نے مومنہ کا چہرہ تکا۔

دو جنوں میں گانٹھ بندھے جب ہو من کا میل

یا تو کھیلو انت تک یا مت کھیلو یہ کھیل

وہ گنگنا کر جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ عائشہ نے کندھے سے بیگ اتارا اور اسے مارنے کو دوڑی۔

☆...☆...☆

غازی شاہ اور اس کے ساتھی مجاہدوں کے لیے نئی جگہ ناکافی اور سہولیات سے عاری تھی۔ اس طرح کے حالات سے انہیں پہلے بھی کئی بار واسطہ پڑ چکا تھا اور یوں بھی مجاہدانہ زندگی میں سہولیات اور آسائش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہتھیلی پر جان لیے' موت کی آرزو کرنے والوں کے لئے دنیاوی عیش کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کے پیش نظر رضائے الٰہی اور آخرت ہوتی ہے۔

غازی شاہ اور اس کے رفیقوں نے "ڈومز ڈے" کے لیے اپنی اپنی کوششیں اور کارروائیاں تیز تر کر دی تھیں۔ ان کا سب سے بڑا مقصد انڈین آرمی کی اسلحہ کی سپلائی لائن کو منقطع کرنا تھا۔ کشتواڑ کے آرا اینڈ امیونیشن ڈپو سے ان کی مہم کا آغاز ہونا تھا۔

"پہلی بات یہ ہے کہ اگر اسلحہ وہاں سے اٹھایا جاتا ہے تو وہ تعداد میں اس قدر ہو گا کہ اسے ٹھکانے لگانا دشوار ہو گا۔" اس نے پہلی تجویز کو بہت غور و خوض کے بعد رد کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ تو ہے پھر۔" سب نے تائید کی مگر ایک نیا سوال سب کی نگاہوں میں تھا۔

"تم بتاؤ طلحہ احمد! تمہارا اس بارے میں کیا کہنا ہے؟" غازی شاہ کے سرخ ہونٹوں کی تراش میں اس کے لیے بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ گویا اسے یقین ہو وہ بہترین تجویز پیش کرے گا۔

"بہت سی باتیں اس ضمن میں قابل غور ہیں۔ میں اس بات سے متفق ہوں کمانڈر کہ اتنے بہت سے اسلحے کو ٹھکانے لگانا نہ صرف دشوار گزار بلکہ ناممکن ہی ہوگا۔ اس طرح ہم بہت جلد انڈین آرمی کی نگاہ میں آجائیں گے۔" طلحہ احمد نے پرسوچ انداز میں کہنا شروع کیا۔

"اسلحہ خانے کو کسی بھی طاقتور بم سے اڑادینا میرے نزدیک ایک بہترین حکمت عملی ہوگی۔ یہ کام مشکل اور خطرے سے پر ضرور ہے مگر اس میں اسلحہ خانے کی سو فیصد تباہی نظر آتی ہے جو کہ ہمارا مشن ہے۔" اپنی بات ختم کرکے اس نے غازی شاہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم یہی تجویز دوگے۔ تمہارے ذہن میں بھی بالکل یہی بات آئے گی۔" غازی شاہ نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور اس کا شانہ تھپکا۔

"جہاں تک خطرات اور مشکلات کی بات ہے تو اللہ کے سپاہی کے لیے کوئی راستہ مشکل نہیں ہے جو موت سے نہیں ڈرتے ان کے لیے کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی۔"

اس نے پنسل اٹھائی اور کاغذ پر لکیریں کھینچنے لگا۔ پھر وہ کاغذ درمیان میں رکھ کر پنسل کی نوک سے کچھ اہم لکیروں کی مدد سے انہیں ہدایتیں دیتے ہوئے بولا۔

"پہلے ہمیں کچھ ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔" اس نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں وضاحت کا آغاز کرتے ہوئے کہا اور کشتواڑ کی فوجی چھاؤنی اور اسلحہ خانے تک جانے کا راستہ لکیروں کی مدد سے

سمجھانے لگا۔ رفیقوں کا جوش جنوں گویا بے لگام ہونے لگا مگر غازی شاہ منصوبہ بندی کے بعد عملی اقدام کا مشورہ دے رہا تھا۔

"اس مہم کا آغاز وہاں کے گردونواح کا جائزہ لینے اور امیونیشن ڈپو کے پہرے داروں کی ڈیوٹیوں کے اوقات معلوم کرنے اور وہاں تعینات فوجیوں کی تعداد معلوم کرنے سے ہونا چاہیے۔" اس کی تجویز کو سب نے پسند کیا اور یوں مہم کے آغاز کا فیصلہ بھی ہو گیا۔

حریت پسندوں کی جدوجہد اور فدائی معرکوں سے کون واقف نہیں جو مسلسل کئی سالوں سے آٹھ لاکھ درندہ صفت فوج کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہے۔ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج کے سامنے نہتی یہ تحریک روزافزوں وسعت پا رہی ہے تو صرف اور صرف اللہ کی طاقت کے سہارے، عقیدے کی قوت کے بل بوتے پر ہی۔

دین کو سربلند دیکھنے کا جوش جنوں ان کے خون کو گرمائے رکھتا ہے۔ ان کے جسموں کو کٹنے کے باوجود جھکنے نہیں دے رہا ہے۔

یوں تو سب ہی دیکھتے ہیں خواب وخیال

ہم نے خواب شہادت دیکھا اور پھر بھلایا نہیں

یہ سب کا مشترکہ خواب تھا، تمنا تھی، آرزو تھی۔

غازی شاہ تحریک کے کمانڈر کی حیثیت سے اس اہم آپریشن کے تمام امکانات پر غور کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرف سے غافل نہیں تھا جبکہ اس کے سارے رفیق مجاہد کسی نہ کسی سمت مصروف پیکار ہو چکے تھے۔ گزشتہ دو روز میں بہت سی معلومات انہیں حاصل ہو چکی تھیں۔

''کشتواڑ کا آرا اینڈ امیونیشن ڈپو'' ظاہر ہے کوئی معمولی ڈپو نہیں تھا۔ اس پر ہزاروں کی تعداد میں گارڈز پہرا دیتے تھے۔ مختلف اوقات میں ان کی ڈیوٹیاں بدلتی تھیں اور بقول یوسف اور سلطان کہ کچھ خاص وقتوں میں ان کی دل بستگی اور عیاشی کا سامان بھی ہوتا تھا۔ یعنی وہ جگہ وقتی طور پر عیش کدے کا روپ بھی دھار لیتی تھی۔ یہ ایک اہم نقطہ تھا یہاں نشے میں بدمست ہو جانے والے ہندو گارڈز کو چوٹ دینے کے امکانات دکھائی دیتے تھے۔

☆...☆...☆

وہ سب اس وقت اپنی اپنی کارروائیوں سے فارغ ہو کر کیمپوں میں ادھر ادھر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ غازی شاہ اور طلحہ احمد کیمپ سے باہر برگد کے سوکھے درخت سے لگ کر بیٹھے تھے۔

''غازی! آج پورے 24 روز ہو گئے ہیں۔ بخت بی بی کے انتقال کو اور مولوی جی کی خلوت سے بہرہ مند ہوئے۔'' طلحہ احمد بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر تنے سے پشت لگاتے ہوئے بولا۔

غازی شاہ کی نظریں ایک پل طلحہ کی جانب اٹھیں پھر اسی ملگجے اندھیرے کو گھورنے لگیں۔ ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہ سے نکل گئی۔

طلحہ احمد کی بات سے یادوں کا کوئی ریلا سا ذہن میں اتر آیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں اور شفیق بانہوں کا گھیرا اپنے ارد گرد محسوس ہونے لگا۔ تھپک تھپک کر لوری دے کر سلاتی مہربان آواز کا ترنم ذہن کے گوشے میں کہیں اب بھی محفوظ تھا۔

اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں۔ طلحہ احمد کہہ رہا تھا۔ ''کیا تم سرجن مومنہ سے نہیں ملو گے جا کر...؟''

''مومنہ...!'' اس کے ذہن پر ایک دم ایسا اثر ہوا جیسے طلحہ احمد نے کہیں ٹھٹھرتے برف پوش علاقے میں آگ سی جلا دی ہو۔

''اب تو ان کے چھاپے بھی دم توڑ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے اب حالات خاصے بہتر ہیں۔''

''مگر میں ابھی مولوی جی کی طرف جانے کا رسک لینا نہیں چاہتا۔ کم از کم اس آپریشن سے پہلے۔'' اس نے رگوں میں دوڑتے لہو کی تندی کو گویا دبا یا تھا۔ احساسات کی لو نیچے کر لی اور قدرے آہستگی سے بولا۔

''مگر وہ یقیناً منتظر ہو گی تمہاری' تم نے ذکر جو کر دیا ہے اس سے۔ اس آپریشن کا۔'' طلحہ احمد کچھ مضطربانہ انداز میں بولا۔

''مجھے تم، میرے دوست، رفیق کم اور مومنہ کے بھائی زیادہ لگ رہے ہو اس وقت۔'' غازی شاہ نے بے ساختہ مسکرا کر اسے دیکھا۔

''اس نے بھائی والا رشتہ جو جوڑا ہے۔ دیور بھابی کا جوڑتی تو تمہارا پلہ بھاری ہوتا۔'' وہ برجستہ بولا۔

''چلو تو پھر مجھے بھی ڈاکٹر عائشہ سے کچھ ایسا ہی رشتہ جوڑنا پڑے گا۔'' غازی شاہ کے انداز میں شرارت تھی۔

طلحہ احمد اس بے ساختہ اور غیر متوقع جملے پر سکول بوائے کی طرح سٹپٹا کر رہ گیا۔

''یہ زیادتی ہے کمانڈر!'' اس کا انداز جھینپا جھینپا تھا مگر غازی شاہ ہنستا رہا۔ ''یوں بھی تم نے خط میں مومنہ سے ذکر کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''بھئی کہتے ہیں عشق اور مشک کبھی چھپتے نہیں ہیں۔''

''بکواس کرتے ہیں کہنے والے۔'' وہ ہنوز جھینپا ہوا تھا۔

''اچھا... وہ کیسے بھلا۔'' غازی شاہ کی سنہری آنکھوں میں شرارت کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اس کے چہرے کے نازک حصوں میں مسلسل ہنسنے سے سرخی گہری ہو گئی تھی۔

طلحہ احمد نے اسے مصنوعی خفگی سے دیکھا اور احتجاجاً وہاں سے اٹھنے لگا مگر غازی نے اسے اٹھنے نہیں دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اچھا چلو چھوڑو، یہ باتیں پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔'' اس کا لہجہ ہنوز شگفتہ تھا پھر جلدی سے بولا۔ ''چلو آج کچھ ترانے سنتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کیمپ سے باہر بیٹھے آگ تاپتے ابو عمیر کو آواز دی۔

''بہت دن ہو گئے ابو عمیر! تم نے ہمیں کوئی جہادی ترانہ نہیں سنایا۔'' وہ ابو عمیر سے بولا۔ دوسرے بھی اپنی اپنی آگ کی سلگتی لکڑیاں اٹھائے ادھر ہی چلے آئے۔

ابو عمیر ان کی اس تنظیم میں دو سال پہلے ہی شامل ہوا تھا۔ متناسب قد، پھرتیلے بدن کا یہ لڑکا ہر فدائی معرکے میں پیش پیش رہتا تھا۔ دشمنوں کے مقابلے پر اس کے سینے میں جیسے کوئی شعلہ سا موجزن ہو جاتا تھا۔ مگر ادھر یار دوستوں میں بیٹھتا تو شرارتی، ہنس مکھ نوجوان دکھائی دیتا۔ جب جہادی ترانا گاتا تو ایسی فضا بنا دیتا کہ سب کے دلوں میں ایمان افروز آگ شعلہ زن ہو جاتی۔ پہلو میں دل مچلنے لگتے۔

آج بھی غازی شاہ اور باقی سب کے اصرار پر وہ اپنی آواز اور ترانے سے ایسا ہی ایمان آفرین ماحول بنا رہا تھا۔

''کچھ دنوں بعد زمانے کی ہوا بدلے گی

ابر کڑکے گا، فضا رنگ وفا بدلے گی

ٹوٹ جائے گا ہر اک حلقہ زنجیر ستم

بے نواؤں کی ان آہوں سے فضا بدلے گی''

بہت دیر تک وہ یہ محفل سجائے بیٹھے رہے۔ ابو عمیر سب کے اصرار پر کئی ترانے سناتا رہا۔ اچانک غازی شاہ اٹھ کر کیمپ میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد طلحہ احمد بھی اٹھ کر اندر آیا تو وہ ایک پتھر پر بیٹھا اپنی رائفل کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے طلحہ مجھے ڈومزڈے سے پہلے مومنہ سے ایک بار ضرور مل لینا چاہئے۔“ طلحہ احمد کی چاپ اپنی پشت پر محسوس کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

اس کے چہرے پر اتنی گہری سرخی تھی جیسے کسی نے سرخ رنگ کا برش پھیر دیا ہو۔ کشادہ پیشانی پر لکیروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔

طلحہ احمد الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی طرف سے خاموشی پا کر اس نے سر اٹھایا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ان کے چھاپوں کا جوش دم توڑ گیا ہے۔ مجھے ایسے میں فائدہ اٹھا کر مولوی جی سے بھی مل لینا چاہئے۔“

طلحہ احمد کا چہرہ ایک پل کے لئے متغیر ہوا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کے نزدیک آیا اور گھٹنے فرش پر ٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”تو کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کمانڈر کہ ڈپو میں ڈائنامائٹ لگانے کے لیے تم داخل ہو گے؟“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”ہاں۔“ اس نے مبہم مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا اور رائفل ایک طرف رکھ دی۔

طلحہ احمد کی بے بسی اضطراب میں بدل گئی۔ وہ احتجاج کرنا چاہ رہا تھا مگر الفاظ اس کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ غازی شاہ اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

”اطمینان رکھو ایسے اور بھی کئی مواقع آئیں گے۔ ہماری مہمات جاری و ساری ہیں۔“ پھر اس کے کندھے پر تسلی آمیز دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سب کے احساسات اور جذبہ جہاد سے واقف ہوں۔ تمہارے دلوں میں بھی وہی شعلہ موجزن ہے جو میرے اندر ہے مگر میں مولوی جی کا خواب پورا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے موقع دو۔ میرے رفیق صرف ایک موقع۔“ اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

طلحہ احمد کے چہرے پر ہلکورے لیتا اضطراب دھیما پڑ گیا۔ اس نے اپنے کندھے پر رکھے غازی شاہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا اور ایک گہری سانس کھینچ کر محبت سے مسکرا دیا۔

”شکریہ میرے رفیق!“ غازی شاہ نے بحرِ عقیدت میں ڈوب کر بے ساختہ اپنا بازو اس کے گرد حمائل کر دیا۔

ایک دھیمی سوگوار مسکراہٹ طلحہ احمد کے ہونٹوں کے گوشوں میں پھیل کر منجمد ہو گئی۔

☆...☆...☆

مومنہ کے لیے زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ غازی شاہ سے نہ رابطہ ہو سکا تھا نہ اس کی صورت نظر آئی تھی۔ ایک ماہ ایک صدی بن کر گزرا تھا۔ گو کہ وہ جانتی تھی، اس کا محبوب شوہر جس سفر پر گامزن ہے وہاں عافیت کا ایک لمحہ مل جانا معجزہ ہی تھا۔

ہر طلوع ہونے والا سورج اسے کسی خوش آئند خبر کا یقین سا دلاتا مگر رات کی تاریکی دہشت ناک مایوسی کا احساس دلانے لگتی۔

اسے کشمیر کی آزادی اور غازی شاہ کی زندگی دونوں ہی عزیز تھے۔ اس نے ہسپتال سے ریزائن دے دیا تھا۔ اس پر عجیب اضمحلال چھایا ہوا تھا۔ گھنٹوں صحن میں بیٹھی اپنے محبوب کے تصور سے باتیں کرتی رہتی۔ اسے تصور میں پکارتی رہتی۔ آنے والے نئے بچے کے بارے میں سوچتی رہتی۔ بیٹھے بیٹھے خیالوں اور سوچوں کے جانے کتنے جنگل پار کر آتی۔ مگر جب عالم خود شناسی میں آتی تو خاموشی اور ویرانی کا صحرا اس کی آنکھوں کے آگے پھیلا دکھائی دیتا۔

"جناب! چشم تصور کی سندر وادیوں سے نکل آیئے۔ ایک بڑی اچھی خبر لائی ہوں۔" وہ اس کے آگے ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

"عرصہ ہوا کوئی اچھی خبر سننے کو کان ترس گئے ہیں۔ تم بھلا کیا اچھی خبر لا سکتی ہو..." اس نے خالی خالی نظروں سے عائشہ کو دیکھا اور ایک گہری سانس کھینچ کر تخت سے پیر اتار کر چپل پہننے لگی۔

"تمہارے پتی کا سندیسہ لے کر آئی ہوں۔ بولو کیا یہ اچھی خبر نہیں؟" عائشہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی اور بیگ سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اس کے آگے لہراتے ہوئے بولی۔ "پورا کا پورا پتر لے کر آئی ہوں اس کا۔"

مومنہ پہلے تو تحیر سے اسے دیکھنے لگی۔ دوسرے پل اس خط پر جھپٹی مگر عائشہ نے ہاتھ پیچھے کر لیا بلکہ خود بھی دور ہٹ گئی۔

"لیکھن پڑھن کی ہے نہیں کہی سنی نہ جات

اپنے جیا سے جانیو مورے جیا کی بات

وہ اسے ستانے کو ادھر ادھر بھاگتے ہوئے گنگنانے لگی۔

"عائشہ! عاشی کی بچی! دیکھ اس طرح مت کر۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

خوشی سے اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ بے بسی انتہا کی محسوس ہو رہی تھی۔ عائشہ کے ہاتھ میں موجود خط اسے کوئی قیمتی سے قیمتی متاع محسوس ہو رہا تھا۔

"دے دو عائشہ پلیز!۔" وہ تھک کر تخت پر بیٹھ گئی۔ عائشہ کو بالآخر رحم آ گیا۔ اس نے وہ خط اس کی گود میں ڈال دیا جسے جھپٹ کر اس نے مٹھی میں دبایا اور فوراً اندر چلی گئی۔

''کیا بات ہے؟ یہ کیسا شور ہنگامہ ہے؟'' مولوی خضر محمد مردان خانے سے باہر نکلے۔ مومنہ کو یوں بھاگتے دیکھ کر ذرا سا حیران ہوئے۔

''غازی شاہ نے پتر بھیجا ہے مومنہ کے نام مولوی جی! اس کا کوئی لڑکا ہسپتال میں آیا تھا مجھے پہنچانے۔'' عائشہ انہیں بتانے لگی۔ مولوی خضر محمد کے لیے غازی شاہ کی طرف سے کوئی پیغام ملنا مسرت انگیز خبر تھی۔

''خدا خیر کی خبر لائے۔'' انہوں نے بند دروازے کو دیکھا جہاں مومنہ جا کر گم ہو گئی تھی۔ پھر سر جھکا کر نکلے کی طرف بڑھ گے۔

☆...☆...☆

غازی شاہ کا خط پڑھتے ہی مومنہ کی ساری تھکن اتر گئی۔ اس نے ملنے کا دن اور وقت مقرر کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ وہ طارق ہاؤس میں اتوار کے دن ڈھلتی شام کو اس سے ملنے آئے گا۔ وہ اس کا انتظار کرے۔

'میں تو ایک ماہ سے سراپا انتظار بنی ہوں۔ میرے محبوب شوہر!' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے چشم تصور میں اسے مخاطب کیا اور خط قیمتی متاع کی طرح سنبھال کر رکھ لیا۔ یہ اس کے محبوب شوہر کا دوسرا محبت نامہ تھا۔

سچ ہی کہتے ہیں کہ وہ تعلق خاطر ہی کیا جس پر دوریاں' فاصلے اثر انداز ہو جائیں۔ اصل چیز تو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہے۔ دل میں رہنے والے اپنی غیر موجودگی میں بھی آپ کے قریب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ آپ جتنے بھی تنہا ہوں۔ ان کی موجودگی کا احساس آپ کو تنہا نہیں ہونے دیتا۔ تعلق خاطر میں سچائی' خلوص اور محبت نہ ہو وہ محض غرض پر مبنی' تن کی آسودگی کے لیے بندھ گئے ہوں تو ان کی موجودگی محض خودرو پودے کی طرح آپ کو کوئی چھاؤں نہیں دے سکتی۔

غازی شاہ کے تصور سے ہی اسے ایک ٹھنڈی خوشبودار چھاؤں کا احساس ہونے لگا۔

محبت طاق دل پر

جلنے والا

وہ چراغِ آخر شب ہے

کہ اس کی لو اگر مدھم بھی پڑ جائے

تو اندر کا اجالا کم نہیں ہوتا

محبت کرنے والوں کو خبر ہے

محبت وسوسوں اور واہموں کے درمیاں

کچھ دن یونہی بے خواب و بے خواہش

اسیری کاٹ سکتی ہے

ہمیشہ کے لیے لیکن

یہ محور سے نہیں ہٹتی

محبت ایک ایسا راستہ ہے

کہ جس پر واپسی ممکن نہیں ہوتی

☆...☆...☆

غازی شاہ کی آمد نے اس کے چہرے پر پھول کھلا دیئے تھے۔اس کے سراپا میں ایسی روشنی بھر دی تھی کہ دیکھتے ہی آنکھیں خیرہ ہونے لگتیں۔

مما اسے نظر لگ جانے کے ڈر سے نظر بھر کر نہ دیکھتی تھیں جبکہ اس کا خیال تھا یہ سب اس کے محبوب کا اعجاز ہے۔اس کی محبت اتنی حسین ہے کہ اس کے اندر اتر کر اسے بھی حسین بنا رہی ہے۔

”یہ فاصلے اور قربتیں تو یونہی بے معنی علت ہیں‘ بے حقیقت مہریں ہیں‘ میں تمہاری موجودگی کے احساس سے ایک پل بھی غافل نہیں رہا۔“ غازی شاہ کا لفظ لفظ پھول بن کر اس کے چہرے کو مہکا رہا تھا۔

جدائیاں ہی تو محبت کو عشق بناتی ہیں۔جب تعلق دل اور روح سے جڑا ہو تو فاصلے‘ قربتیں بے معنی ہو جاتے ہیں۔اس نے سوچا مگر کہا نہیں۔وہ صرف سننا چاہتی تھی۔اپنے محبوب کی آواز‘ اس کے لہجے کی محبت آمیز ٹھنڈک سے سیراب ہونا چاہتی تھی۔سو چپ رہی اور اسے سنتی رہی۔

اس کی قربت کا ہر لمحہ اس کے لیے قیمتی تھا اور مومنہ اسے قیمتی متاع کی طرح سمیٹ کر دل میں چھپا لینا چاہتی تھی۔وہ اسے اپنی مہم کے بارے میں بتانے لگا۔تاہم مکمل تفصیل بتانے سے گریز کیا تھا۔وہ جانتا تھا وہ چاہے جتنی مضبوط ہے مگر اندر سے وہی خدشوں وسوسوں سے بھری ایک کمزور ہستی ہے۔

رات کے کھانے پر اس قدر اہتمام دیکھ کر غازی شاہ نے اک ناراض سی نظر اس پر ڈالی پھر مما سے مخاطب ہوا۔

”میری عادت کیوں بگاڑنا چاہ رہی ہیں آنٹی۔ہم تو سادہ غذا کھانے والے لوگ ہیں۔“

”بھئی یہ سارا کچھ تو مومنہ نے ہی کیا ہے۔صبح سے کچن میں لگی ہوئی تھی۔میں نے کہا تھا کہ بھئی تمہارا میاں کھانے کو نہیں تم سے ملنے آرہا ہے۔“ مما جلدی سے وضاحت دینے لگیں۔

”اس کا خیال ہو گا کہ اس کا مجاہد میاں جانے کتنے دنوں کا بھوکا ہو گا۔سو اسے اب اتنا کھلا پلا دوں کہ وہ ایک دن میں ہی پہلوان ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔“ وہ آستین فولڈ کرتا ہوا بیسن کی جانب بڑھتے ہوئے اس پر ایک مسکراتی نگاہ اچھال گیا۔

"نہیں ایسا کوئی خیال نہیں تھا... میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ بھرے پیٹ والے عیش پرست آدمی دشمنوں پر قہر بن کر نہیں ٹوٹ سکتے بلکہ چوہوں کی طرح بل میں گھسے رہتے ہیں یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے خود لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔" وہ تولیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شگفتگی سے ہنسی۔

"پیٹ پر پتھر باندھنے والے اور روکھی سوکھی کھانے والے ہی دشمنوں کے لیے اصل خطرہ ہوتے ہیں چونکہ انہیں خریدا نہیں جاسکتا۔ انہیں زر' زن اور زمین سے بدمست نہیں کیا جاسکتا۔"

"ویری اسٹرینج' آنٹی! یہ میری زوجہ ہی ہے نا؟"

غازی شاہ مصنوعی حیرت سے پلکیں جھپکتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے مما سے مخاطب ہوا۔ مما ہنسنے لگیں۔

"میں تو اسے بہت بونگی سی کم عقل ہی چھوڑ گیا تھا۔"

"میں بھلا کب اونگی بونگی تھی؟" وہ احتجاجاً اسے گھورنے لگی پھر بچوں کی طرح بسور کر منہ پھلا لیا۔ مما ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئیں تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

"بزرگ کہتے ہیں عورت سے ہم چار چیزیں چاہتے ہیں۔ ایک' اس کے دل میں نیکی ہو۔ دوسرے اس کے چہرے پر حیا ہو۔ تیسرے اس کی زبان میں شیرینی ہو اور چوتھے اس کے ہاتھ کام میں لگے رہیں اور میں کہتا ہوں اس کے بعد اب اگر عقل کی تھوڑی سی کمی ہو تو یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"غازی...!" وہ بلبلا کر ہتھیلی کا مکا بنا کر اسے مارنے لگی۔

"بھئی باقی چار چیزیں تو ہیں نا تمہارے پاس۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ اسے گھورتے ہوئے یکدم کھل کھلا پڑی۔ "بہت برے ہو۔"

اس کے ہنستے چہرے کو دیکھتے دیکھتے یک بیک وہ سنجیدگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ کوئی خیال' کوئی احساس اس کے دل کو چھیدتا ہوا گزر گیا پھر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اس کے خوش نما چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ ایک مانوس سا اضطراب اس کی سنہری آنکھوں کی سطح پر پھیل گیا تھا۔

چند نوالے وہ بہ مشکل کھا سکا پھر اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

مومنہ ملازمہ کے ساتھ کچن کا پھیلاوا سمیٹ کر کمرے میں آئی تو وہ کھڑکی میں کھڑا پچھلے باغیچے میں پھیلے اندھیرے پر نظریں جمائے گنگنا رہا تھا۔

"ہم تو مقتل کی جانب چلے ساتھیو!

اب تمہارے حوالے چمن ساتھیو!

اسے اندر آتے دیکھا تو چپ ہو گیا اور ہلکے سے مسکرایا مگر جانے کیوں وہ مسکرا تک نہ سکی بس اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔

"کیا بات ہے؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ ذرا سا حیران ہوا۔

”ایسا لگ رہا ہے آپ مضطرب ہیں۔ کوئی سوچ ہے جو آپ کو بے کل کر رہی ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟“ وہ اس کے نزدیک چلی آئی۔ غازی شاہ کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔ اس نے کھڑکی کے باہر نظریں مرکوز کر دیں۔

”بی بی نے مجھے یاد تو کیا ہوگا؟“ وہ کہنا کچھ اور چاہتا تھا مگر کہہ کچھ اور گیا۔

مومنہ نے ایک سانس کھینچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ فطری کیفیات ہیں۔ کسی کو یاد کرنے سے کون روک سکتا ہے بلکہ خود کو بھی نہیں روکا جا سکتا۔ جذبات اور احساسات کی تو اپنی ہی ایک الگ دنیا ہے۔ انسان بڑے غیر محسوس طور پر اس دنیا کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ کبھی شعوری کوشش سے نکل جاتا ہے کبھی نہیں نکل پاتا۔“

غازی شاہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا پھر سر کو خفیف سی جنبش دے کر کسی خیال کو جھٹکا۔

”مومی! کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اپنا ہر جذبہ‘ ہر احساس صرف ایک ہی ذات کے نام کر لیں۔ اسی سے وابستہ ہو جائیں۔ اس ذات عظیم سے جہاں سے ہمیں توقع سے بڑھ کر چاہت ملتی ہے۔ جس کا تصور قلوب میں اطمینان بھر دیتا ہے۔ ایسا اطمینان کہ پھر کوئی بے کلی بے کل نہیں کر سکتی۔“ اس نے اس کے نرم ملائم ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

”بھلا کوئی مسلمان ہوگا جس کا تعلق اس ذات سے نہیں جڑا ہے؟“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔ ”اور سچ تو یہ ہے غازی! کہ اس ایک ماہ میں مجھے سہارا دینے والی بھی یہی ذات تھی۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں مومی!“ غازی شاہ کی آنکھیں یکلخت کسی جگنو کی طرح چمکیں۔ اس نے پر جوش انداز میں اس کے ہاتھوں کو دبایا۔ ”بس اسی سہارے کو تھامے رکھو‘ اسی پر نگاہ رکھو باقی سب فانی ہے۔ سب ہیچ ہے۔ انسانوں کے سہارے ایک دوسرے کے لیے محض خستہ اور دیمک زدہ لکڑی کے مانند ہوتے ہیں‘ کب موت کی دیمک انہیں چاٹ جائے اور وہ تڑخ جائیں۔“

مومنہ کے اعصاب کو بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے کھینچ کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”زندگی انسان کے لیے ہمیشہ بہت تھوڑی سی ہوتی ہے۔ ہر آنے والا لمحہ اس میں کمی کرتا جاتا ہے۔ زندگی کو یقینی خیال کرنا دراصل موت کی حقیقت سے انکار ہے مگر انکار کرنے والے بھی بہر حال موت کے شکنجے سے نہیں بچ سکتے۔ کیوں نہ ہم ہر آنے والے لمحے کو اپنا آخری لمحہ ہی تصور کریں۔“

”غازی! پلیز۔“ وہ اسے مزید بولنے سے ٹوک گئی۔ اس کا دل ایسی کیفیت سے دوچار ہوا جیسے کسی نے اسے بری طرح دبایا ہو مگر دوسرے پل سانسیں رواں ہو گئی ہوں مگر اس روانی میں عجیب بے سکونی تھی۔

اسے جانے کیوں وہ رات یاد آ گئی جب بی بی اس سے ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔

”مومنہ!“ غازی شاہ نے نرمی سے اسے تھاما۔ مگر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے لیے باغیچے کی کھلی فضا میں نکل آیا۔

رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں' پھولوں کی معطر خوشبو' سانس لیتے ہی پھیپھڑوں میں ایک تراوٹ بھر رہی تھی مگر مومنہ کو یکلخت سب کچھ بے حد اداس' ویران اور پورا ماحول ہی بے رنگ محسوس ہونے لگا۔

غازی شاہ نے گلاب کے پودے پر اگا ادھ کھلا گلاب توڑ کر اس کے ریشمی بالوں میں لگا دیا مگر اس کا دل نہ مہک سکا۔ کوئی چیز اس کی روح کو مسوسنے لگی تھی۔ اسے اپنی آنکھیں نم نم محسوس ہو رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ مومنہ کو جانے کیوں یہ مسکراہٹ بھی پھیکی پھیکی سی لگی۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر کھولیں۔

"نہیں مومو! جانے والوں کو الوداع اس طرح نہیں کرتے۔" اس نے بے حد نرمی سے اس کا بکھرا وجود سمیٹ لیا۔

ٹپ ٹپ ٹپ' کئی آنسو پلکوں کی مضبوط باڑ توڑ کر بالآخر بہہ نکلے۔

"تو کس طرح کرتے ہیں؟" اسے آنسوئوں پر اختیار نہ رہا۔

"مسکرا کر پوری حوصلہ مندی کے ساتھ۔" وہ مسکرایا۔

"پاگل کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں لوٹ کر آئوں گا؟" وہ اسے چھیڑنے لگا۔

"کیوں' کیوں نہیں ہے۔ خدا نہ کرے کہ..." اس نے تڑپ کر اس کا ہاتھ جکڑ لیا۔ "خدا تمہیں میری عمر بھی دے دے غازی شاہ۔" اس کا رواں رواں دعا گو ہو گیا۔

"نہیں مومنہ! تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ تمہارے وجود میں میری بقا ہے۔ تمہیں میری امانت کو سنبھالنا ہے۔ اس ننھے پودے کو تناور درخت بنانا ہے۔ اسے ایسی آہنی دیوار بنانا ہے جسے دشمن ہلا نہ سکیں۔ جو دشمنوں پر قہر بن کر ٹوٹ سکے۔ جس کے نام سے ان کی نیندیں اڑ جائیں۔ ان کی صفوں میں بے چینی اور ہلچل مچ جائے۔ ان کے قدم اکھڑ جائیں۔ جو زندہ رہے تو صرف دین اسلام کے لیے اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر کشمیر کو آزادی سے ہمکنار کرنے والوں میں شامل رہے۔ بولو مومنہ! اسے ایسا ہی مجاہد بنائوں گی نا۔ جس کا ایمان ہی اس کی دولت ہو۔ اس کا عقیدہ ہی اس کی قوت ہو۔ ہماری آنے والی نسلیں عالم اسلام کے لیے نئے سویرے کی نوید ہیں۔ انہیں اسلاف کی قربانیوں کو بھلا نہ دینے دینا۔ انہیں بقا کے راز سے واقف کرانا کہ فنا میں ہی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔"

اس کی آواز جوش سے بھاری ہو رہی تھی۔ اس نے فرط جذبات میں اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکا۔ "بولو' کیا یہ سارے سبق اسے سکھائو گی؟" اور مومنہ نے بھیگی بھیگی متورم مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ دونوں رات دیر تک جاگتے باتیں کرتے رہے۔ فجر سے کچھ دیر پہلے غازی شاہ جانے لگا تو اس نے اپنے بالوں میں اٹکا ہوا گلاب نکال کر اسے ہولے سے اپنے لبوں سے لگایا پھر اس کے کرتے کی جیب میں اٹکا دیا۔

"خدا حافظ!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی اور نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

وہ باہر نکل گیا تو وہ بھاگ کر ٹیرس پر گئی۔ بل کھاتی سڑک کے باعث وہ اسے دور تک جاتا دکھائی دیتا رہا۔ وہ ہاتھ فضا میں اٹھا کر لہراتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب بھی وہ کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ اس کا دل بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے کوئی بے آباد مکان۔ جس کے سارے مکین اپنا ساز و سامان اٹھائے وہاں سے کوچ کر گئے ہوں۔

وہ ٹیرس سے نیچے آ گئی اور لان کی ٹھنڈی گیلی گھاس پر ننگے پیر بے قرار روح کے مانند چکر کاٹنے لگی۔ فجر کی اذان ہونے لگی تو ہاتھ خود بخود دعا کے لیے بلند ہو گئے۔

بہت سی دعائیں اسے یاد تھیں جو بی بی بچپن میں اسے یاد کراتی رہتی تھیں مگر اس پل ساری گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ اس کے لب کانپ کر رہ گئے مگر وہ بہت دیر تک سجدہ ریز رہی۔

وہ سننے والا قادر مطلق لفظوں کا ہی محتاج کب ہے۔ وہ تو آنسوؤں کی زبان جانتا ہے۔ دل کا تڑپنا بھلا اس سے کب چھپا ہوتا ہے۔

اس نے بھی آنسوؤں کی زبان میں ساری دعائیں مانگ لیں۔

☆...☆...☆

سرفروشوں کا یہ قافلہ جمعے کی رات کو اپنی مہم کے آغاز کے لیے اپنے کیمپوں سے غازی شاہ کی قیادت میں روانہ ہوا۔

اسلحہ خانے کی بلند و بالا عمارت پر گمبھیر سکوت چھایا ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چند لمحوں بعد اس سکون کی تہ سے کوئی طوفان اٹھنے والا ہے۔ نہ کوئی جانتا تھا کہ یہ تاریک رات کچھ گھنٹوں بعد ہی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ کرنے والی ہے۔

کمانڈر غازی شاہ اپنے جذبہ ایمان سے سرشار خدا کے فدائی رفیقوں کے ہمراہ اس اسلحہ خانے پر قیامت صغریٰ لانے والا ہے۔

”میرے پیارے ساتھیو! ہم آج اپنے اللہ سے کیے عہد کو نئے سرے سے تازہ کرتے ہیں۔ خود کو اللہ کا سپاہی کہتے ہیں تو عملاً منوانے کا عزم کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں حالات روز بروز ہمارے لیے سخت تر ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر ہمیں حالات اور مشکلات کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ کر بیٹھ جانا نہیں ہے۔ حالات اللہ کے قبضے میں ہیں۔ وہ جب چاہے بدلے گا۔ ہم حالات کو نہیں بدل سکتے۔ ہمیں اصلاح کرنی ہے۔ دین کے مطابق خود کو ڈھالنا اور اپنی جماعت کو سیدھے راستے پر لے کر چلنا۔

میرے رفیقو! آج اسلام قربانیوں سے نئے سرے سے چمکنے لگا ہے۔ امت مسلمہ جہاد اور قربانی کا درس پھر سے زندہ کر رہی ہے۔ اس کا سفینہ تلاطم خیز موجوں میں بھی رواں دواں ہو گیا ہے۔ جس سے کفر گھبرا گیا ہے۔ ہندو بنیے ہوں یا یہود و نصاریٰ سب خوف زدہ اور پریشان ہیں۔ سب نے مل کر مسلمانوں کو مارنے اور

ان کی تلاطم خیز رفتار کو روکنے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر ہمارے قدم' ہمارا سفر اور بھی تیز تر ہو گیا ہے۔ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ جانیں اللہ کے نام وقف ہیں۔ یہاں خالص ایمان کا معاملہ ہے۔ یہ سفر جہاد کا سفر ہے۔ ہم مسافر ہیں۔ جنت' اللہ کا دیدار' دیدار نبیؐ اور صحابہؓ کا ساتھ ہماری منزل ہے۔

سفر کتنا لمبا ہو گا؟ کتنی نسلیں بیت جائیں گی؟ بس ہمارا کام تو اپنی موت تک ہے۔ اس عرصے میں ہمیں مستقیم رہنا ہو گا۔ اپنے آپ کو بچا کر گزاریں باقی امور سب اللہ کی طرف لوٹتے ہیں اور وہی فیصلے کرتا ہے۔ وہی نتیجے نکالنے والا ہے۔"

غازی شاہ کی ایمان افروز تقریر نے سب کے دلوں کو جذبہ جہاد سے گرما دیا تھا۔ ہر کوئی اس فدائی معرکے میں آگے رہنا چاہتا تھا۔

قافلہ اسلحہ خانے کی عمارت کے قریب پہنچا تو تقریباً بارہ بجے کا وقت تھا۔ غازی شاہ کے علاوہ سب اس کے حکم پر سو گز کے فاصلے پر اترائی میں چھپ کر بیٹھ گئے اور اپنی دوربینوں سے ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔

غازی شاہ سیاہ لباس میں ملبوس ہونے کے باعث رات کی تاریکی کا ہی حصہ بن گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا اسلحہ خانے کے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک دیوار کے نزدیک پہنچ کر وہ محتاط انداز میں ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

بڑے سے سیاہ گیٹ پر پہرا دیتا گارڈ اپنی مخصوص وردی میں کندھے پر جدید طرز کی اسٹین گن لٹکائے ٹہلتا دکھائی دیا۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

وہ دیوار کی آڑ میں ہو کر اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ درمیانے قد' دبلے پتلے جسم کا تھا مگر پھرتیلا معلوم ہو رہا تھا۔ گیٹ کے اوپر جلتے بلب کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ چہرے سے قطعی عام' معمولی شکل وصورت کا مالک تھا۔ مخصوص ہندو فوجیوں جیسی خباثت اور کرختگی نہیں تھی اور یہ بات ان کے حق میں جاتی تھی۔

غازی شاہ نے اپنے سیاہ لبادے کی جیب سے چند پتھر نکالے اور اسے جھاڑیوں کی طرف ایک ایک کر کے اچھالنے لگا۔ پتوں اور شاخوں یں کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی۔ ماحول کے سناٹے میں اچانک پیدا ہونے والا ارتعاش یقیناً گارڈ کو چوکنا کر گیا تھا۔

غازی شاہ نے دیکھا کہ اس نے گن کندھے سے اتار کر ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی ہے اور جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے پتھر پھینکنے کا سلسلہ بند کر دیا اور نہایت محتاط انداز میں ایک بار پھر دیوار کی اوٹ سے جھانکا۔

گارڈ اس کے نزدیک ہی پہنچنے والا تھا۔ اس نے اپنے قدموں کو مضبوطی سے فرش پر جما لیا اور بالکل ساکت ہو کر اس کے ہر لمحہ قریب آتے قدموں کی دھمک پر تمام تر توجہ رکھ لی۔

تین چار... ساتویں قدم پر گارڈ بالکل اچانک اس کے سامنے آگیا۔ مگر اس سے پہلے کہ چوکنا ہو کر اسے سنبھلنے کا موقع ملتا غازی شاہ نے چیتے کی طرح اس پر چھلانگ لگا دی۔

اگر اس کے قدموں کی چاپ کا اندازہ لگانے میں اسے معمولی سی بھی غلطی ہو جاتی تو وہ ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جاتا۔ مگر اس کی ماہرانہ صلاحیت اور خدا کی مدد اس کے ہمراہ تھی۔ گارڈ اس کے بازوئوں کے شکنجے میں اس طرح آکر بلبلانے لگا جیسے کوئی چڑیا عقاب کے پنجے میں۔

غازی شاہ نے اس کی گردن اپنے آہنی شکنجے میں اتنے زور سے کس لی کہ اس کی یقینی چیخ اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اس کا گن والا ہاتھ بھی قابو میں کر لیا تھا۔

اچانک اس کی گردن کی ہڈی سے ایک آواز آئی دوسرے پل اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ آنکھیں ابل کر باہر آگئی تھیں۔

غازی شاہ نے اپنے ہاتھ کی گرفت جونہی ڈھیلی کی وہ کسی ٹوٹی شاخ کی طرح لہرا کر زمین بوس ہو گیا۔ اسے شدید حیرت ہوئی اس کے معمولی زور پر اس کی گردن کی ہڈی چیخ گئی تھی اور آناً فاناً ہی اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اب وہ چت پڑا ابلی ہوئی آنکھوں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ گوشت سے پرہیز کرنے والے ہندو بنیے کی اس کمزوری نے اسے خاصا حیرت زدہ اور محظوظ کیا وہ تو اس کے اندازے سے کہیں زیادہ کمزور نکلا۔ محض اسٹین گن کے سہارے ہی بااعتماد دکھائی دے رہا تھا۔ کم عقل ہندو بنیئے سے نمٹ کر اس نے طلحہ احمد کو مخصوص اشارہ دے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد سلطان رینگتا ہوا اس طرف آتا دکھائی دیا۔

کوئی دو منٹ کے اندر ہی سلطان گارڈ کا لباس خود زیب تن کر چکا تھا اور اپنا لباس اسے پہنا چکا تھا۔ اس کا دوسرا رفیق مردار گارڈ کو کندھے پر ڈالے چلا گیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر غازی شاہ محتاط انداز میں گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پاس تین طاقتور ڈائنا مائٹ تھے جو اسے اندر مختلف مقامات پر سیٹ کرنے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ کام ایک گھنٹے میں ہونا تھا۔ اس کے بعد غازی شاہ اس اسلحہ خانے سے باہر نکل کر طلحہ احمد سے رابطہ قائم کر لیتا۔

☆...☆...☆

غازی شاہ نقشے کے مطابق دائیں طرف سے رینگتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ ڈیوٹی کی تبدیلی میں ایک گھنٹہ باقی رہتا تھا اور ایسے وقت اپنی اپنی ڈیوٹیاں بھگتانے والے پہرے دار اور گارڈز ان لمحات کو عیش و نشاط اور مستی کی نذر کرتے تھے۔ ان کی وحشیانہ محفل خوب رنگ پر تھی۔ تقریباً سب ہی بدمست تھے۔ ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا ایک خالی کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ درمیانے سائز کا کمرہ تھا جس کے چاروں طرف دیوار گیر الماری بنی ہوئی تھی۔ لکڑی کے فریم میں شیشوں کے دروازے فٹ تھے جن سے اندر موجود اشیاء صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ الماریوں میں کانچ کی کراکری تھی۔ ہر سائز کی پلیٹیں، مگ اور دوسرے استعمال کے کئی برتن جبکہ چند الماریاں ان کی مخصوص وردیوں سے بھری پڑی تھیں۔ اس نے وردی والی الماری کا انتخاب کیا اور بڑی پھرتی سے وردیاں ایک طرف ہٹا کر ڈائنامائٹ سیٹ کیا اور وردیاں اسی انداز میں اس کے اوپر رکھ کر الماری بند کر دی۔

اس کام میں چند منٹوں سے زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ اس کمرے سے نکل کر اس نے بے حد محتاط انداز سے دائیں طرف کا رخ کیا۔ اب اس کے سامنے ایک طویل راہداری تھی۔ اس نے ایک سیکنڈ توقف کیا پھر دائیں طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دیوار سے بالکل چپک کر چلنا شروع کیا۔ اچانک اسے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی۔ وہ جلدی سے ایک چوبی دروازے کی آڑ میں دبک گیا۔

دو بدمست فوجی باتیں کرتے ہوئے سامنے سے چلے آرہے تھے۔ ”پینا پلانا تو چلتا ہی رہتا ہے پر یہ اپنے راجن سردار نے تو آج حد ہی کر دی۔ ایسا لگتا ہے سویرے تک یہ گینڈا یونہی بدمست پڑا رہے گا۔“

”یہی تو ساری مصیبت کی جڑ ہے۔ اس راکشس کے ساتھ میری جب ڈیوٹی لگتی ہے میری مت ماری جاتی ہے۔ من کرتا ہے سالے کا نشے میں ہی گلا دبا دئوں۔“ دوسرا جو خود بھی نشے میں ہی معلوم ہو رہا تھا بگڑے لہجے میں بولا۔

”کشمیر کے حالات روز بروز خراب سے خراب ہوتے جا رہے ہیں لگتا ہے اب اکھنڈ بھارت ٹکڑے ہو کر رہے گا۔ اور ادھر اپنے راجن سردار کو رنگ رلیوں سے فرصت نہیں ہے۔“

”چل چھوڑ اپنا کیا ہے۔ اپنا کام تو ڈیوٹی بھگتنا ہے بس۔“ پہلا سانس بھر کر بے زاری سے گویا ہوا۔

وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن غازی شاہ کے سامنے سے گزر گئے۔ چوبی دروازے کی معمولی آڑ نے اسے ان کی نظروں سے چھپا لیا تھا۔ ممکن تھا وہ دونوں نشے میں نہ ہوتے یا باتوں میں مگن نہ ہوتے تو غازی شاہ ان کی

نظروں سے چھپ نہیں سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا وہ دونوں سیدھے جا کر اگر پیچھے پلٹتے تو وہ انہیں صاف دکھائی دے جاتا۔ مگر خدا کا کرنا ہوا کہ وہ بالکل سیدھے جا کر بائیں طرف کو مڑ گئے۔

اپنی روکی ہوئی سانس چھوڑتے ہوئے غازی شاہ اس آڑ سے نکلا اور گھٹنوں کو خفیف سی جھکائی دے کر سر جھکا کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے آخری کنارے پر ایک بڑا سا دروازہ تھا جو عموماً مقفل رہتا تھا مگر خوش قسمتی سے اس وقت اس کا کھلا ہوا تالا ہولڈر میں جھول رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا اندر کوئی موجود تھا۔ اس نے دروازے کی جھری سے جھانکا مگر اسے کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ وہ تیر کی تیزی سے پنجوں کے بل چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور بڑی بڑی چوبی پیٹیوں کے درمیان موجود جگہ میں چھپ گیا۔

یہ سراسر ایک جنونی حرکت تھی اور جنون بے لگام ہو جائے تو انجام کی پروا نہیں رہتی۔ عموماً بڑے بڑے معرکے جذبہ جنون میں ہی انجام دے دیئے جاتے ہیں۔ تیغ ہاتھ میں ہو اور جنوں لبریز ہو جائے تو دشمنوں کے سروں کا انبار لگ سکتا ہے۔

انہی کے فیض سے بازار عقل روشن ہے

جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

ایسا ہی جنون اس لمحے غازی شاہ کی رگ رگ میں بھر گیا تھا۔ اسلحہ خانے کو دھواں اگلتے دیکھنے کا خواب جاگی ہوئی آنکھوں میں پھر جھلکنے لگا تھا۔

آتشیں ہتھیاروں سے بھری ان پیٹیوں کو دیکھ کر اس کے تصور میں نہتے بے گناہ کشمیریوں کے چھلنی اور خون آلود بدن لہرا گئے۔ اس نے اپنے اندر اُمڈتے نفرت کے شعلے کو دبایا اور اپنے جنون کو گرد و پیش سے بے پروا' بے نیاز نہ ہونے دیا۔ وہ دم سادھے دبک کر قدموں کی دھمک سے اندر موجود فوجیوں کی تعداد کا اندازہ لگانے لگا۔

''کیا بات ہے۔ یہ تم دروازے کو کیوں گھور رہے ہو؟'' اچانک کسی کی آواز ابھری جو اپنے کسی ساتھی سے مخاطب تھا۔

''مجھے ایسا لگا جیسے کوئی ابھی ادھر سے گزرا ہو؟''

جواباً شک و شبے سے بھری ایک مہین آواز سنائی دی۔ غازی شاہ کا دل سینے کی دیوار میں لحظہ بھر سکڑا۔

''ابے تو گزرا ہو گا کوئی اپنا ہی۔'' پہلی آواز قدرے بھاری اور کھردری تھی۔ اب اس میں بے زاری بھی شامل ہو گئی۔

''کیوں نہ میں اپنا وہم دور کر لوں؟'' مہین آواز پھر ابھری۔

''دیکھ آنند!'' وہم دور کرنے میں وقت کھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی ڈیوٹیاں بھگتا چکے ہیں۔ اب آنے والے جانیں اور ان کا کام۔ یوں بھی کون مائی کا لال ہو گا جو شیروں کی کچھار میں گھسنے کا جوکھم مول لے گا۔ تیرا وہم ہے اور کچھ نہیں۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ بھلا کون یہاں گھسنے کی ہمت کر سکتا ہے۔'' مہین آواز والے کے تائیدی لہجے میں فخر بھی شامل ہو گیا۔ کچھ دیر کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں پھر غازی شاہ نے ان کے قدموں کی دھمک دروازے کی جانب جاتی سنی۔ دوسرے پل دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ تالے میں چابی گھمانے کی آواز آئی۔ اس نے مکمل اطمینان کر لیا کہ تالا لگ چکا ہے تب آہستگی سے سر اوپر اٹھایا اور کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر پھرتی سے اپنی کمر پر بندھے تھیلے سے بقیہ ڈائنامائٹ نکال کر اسے مختلف جگہوں پر سیٹ کرنے لگا۔

یہ ڈائنامائٹ بے حد طاقتور تھے۔ جو پھٹ کر یقیناً ناقابل تلافی نقصان کا سبب بنتے۔ یوں بھی بارود سے بھرے اس کمرے میں کہیں معمولی آتشیں دھماکہ بھی تہلکہ خیز ثابت ہوتا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ کھڑکی کی طرف آیا اور اس کا جائزہ لیا۔ کھڑکی کا فریم آہنی تھا۔ اس پر موٹی موٹی انچ لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ جس کی ہر سلاخ کم از کم دو انچ موٹی تھی اور ہر سلاخ چار چار انچ کے فاصلے پر فریم کے دونوں اطراف مضبوطی سے گڑی تھی۔ سلاخیں کاٹنے کا کام مشکل بھی تھا اور وقت طلب بھی۔

اس نے اپنے تھیلے سے مختلف اوزار نکال کر سلاختوں کو کاٹنے کا کام شروع کیا۔ یہ کام اسے بے آواز کرنا تھا جس پر پوری طاقت صرف ہو رہی تھی۔

وہ دوسری سلاخ کاٹ رہا تھا کہ کمرے میں یکلخت ملگجے اندھیرے کا سینہ روشنی کی لکیر نے چیر دیا۔ روشنی کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی آواز بھی اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کا حرکت کرتا ہاتھ رک گیا۔

"میں نے کہا تھا ناوجے! مجھے یونہی وہم نہیں ہوا تھا۔ کوئی مورکھ شیروں کی کچھار میں گھسنے کی حماقت کر چکا ہے۔"

مہین آواز کے ساتھ ایک مکروہ چہرہ غازی شاہ کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس کے پیچھے کھردری آواز والا تھا۔

یہ یقیناً ایک منحوس گھڑی تھی۔ بازی الٹ گئی تھی۔ غلطی تو بہرحال کہیں نہیں ہوئی تھی' یہی قدرت کا فیصلہ تھا اور یونہی ہونا لکھا تھا۔ خطرے کو دیکھ کر دل کو جکڑنے والے خوف کا جال دوسرے لمحے چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ ایک پھریری لے کر اس کے اعصاب نئے سرے سے زندہ ہو گئے۔ سر کو خفیف سی جنبش دے کر اس نے اوزار والا ہاتھ ڈھیلا کر کے پہلو میں گرا لیا۔

وہ دونوں ہتھیار سے لیس تھے جبکہ غازی شاہ کے پاس اس وقت ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ تھا۔ "حوصلہ" جو خدا کی ذات پر اعتماد سے معرض وجود میں آتا ہے۔ اسے اس پل کسی بھی قسم کا خوف محسوس نہ ہوا جو اس کے اعتماد میں دراڑ ڈال سکتا۔ اس نے اپنے اعصاب کو جس تیزی سے سنبھالا تھا' وہ یقیناً لائق تحسین تھا۔

"تو تم یہاں کوئی بڑا معرکہ سر کرنے آئے ہو۔ کشمیری مسلوں کے ٹھیکے دار بن کر... ہیں..." مہین آواز والے کے چوڑے جبڑے استہزائیہ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔ وہ غازی شاہ کو سر سے پیر تک یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی بہادر پہلوان اپنے مقابلے میں آ جانے والے ننھے بچے کو دیکھ رہا ہو۔ اس کے پیچھے کھڑا دوسرا فوجی بھی حقارت سے مسکرانے لگا۔ اس کے پیلے پیلے دانت اس کے سیاہ چہرے پر اور زیادہ نمایاں ہو کر اسے بدہیبت بنانے لگے۔

غازی شاہ یونہی بے جنبش کھڑا رہا تا کہ دونوں کو یہ بھرپور یقین دلا سکے کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑ لئے جانے پر خوف زدہ ہو چکا ہے۔

تاہم مہین آواز والا محتاط انداز میں اس کی جانب بڑھنے لگا۔

اس کے ذہن میں یقیناً یہ بھی ہو گی کہ اسلحہ خانے میں سخت نگرانی کے باوجود اندر گھس جانے والا شخص کوئی معمولی شخص تو بہرحال نہیں ہو سکتا۔ شاید اس خیال کے پیش نظر ہی وہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی کمر پر بندھے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس تھیلے میں کیا ہے؟" اس کا لہجہ درشت تھا۔ گویا وہ اپنے لب و لہجے سے ہی مخاطب کو مفلوج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

غازی شاہ نے کسی قسم کا جواب دینے کے بجائے کمر سے تھیلا نکالا او اسے فرش پر الٹ دیا۔ دونوں کی نظریں بیک وقت تھیلے سے گرنے والی چیزوں پر اٹھیں اور یہی موقع تھا جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہوئے چیتے کی طرح ایک جست لگا کر چوبی پیٹیوں کے پیچھے ہو گیا اور وقتی طور پر ان کے ہاتھ میں موجود گن کے دائرہ عمل سے نکل گیا۔

"بزدل چوہے' تمہاری یہ کوشش بے سود ہے۔" مہین آواز والا ایڑیوں کے بل گھوما اور بے ساختہ محظوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ بے معنی نہیں تھا نہ اس کا محظوظ ہونا۔

غازی شاہ بھی جانتا تھا کہ وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تو نہیں تھا کہ دشمنوں کے نرغے سے غائب ہو جاتا اور نہ کوئی جادوئی چھڑی اس کے پاس تھی کہ وہ اسے ہوا میں لہرا کر دونوں کو پتھر کا بنا دیتا۔ خطرہ اس کے سر پر ہنوز تھا۔ بچنے کی کوئی راہ نہ تھی مگر اس کے ذہن و دل کے کسی بھی گوشے میں اپنی حیات کی بقا کی تمنا نہیں جاگی تھی۔

اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی خیال تھا' ایک ہی آرزو دھمک رہی تھی۔ اسلحے خانے کی تباہی و بربادی کی... اسے دھواں بنا دینے کی۔

جو آگ اس کے سینے میں دہک رہی تھی دشمن اس سے بے خبر تھے۔ وہ اس کے اس عمل کو محض اس کے اپنے بچائوں کی تدبیر خیال کرتے ہوئے محظوظ ہو رہے تھے۔

”تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔ تمہارے بچائو کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہاری ہوشیاری تمہارے حق میں خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔“ مہین آواز والا چلا کر بولا۔

غازی شاہ کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ”میں ہندو چوہا نہیں ہوں کہ بل کی تلاش کروں گا۔ زندگی میرے لیے بے معنی ہے۔ میرا مقصد میرے لیے اہم ہے جو میری زندگی سے بڑھ کر مجھے عزیز ہے۔

میں تم سب کی موت بن کر آیا ہوں یہاں۔ دنیا کی زندگی ہم مسلمانوں کے لیے عارضی پناہ گاہ ہے۔ ہماری اصل زندگی آخرت ہے اور مجھے افسوس ہے کہ تم کافروں کے لیے نرک کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے۔“

اس کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ میں استہزائیہ رنگ شامل ہو گیا۔

یہ لہجہ اور انداز دونوں فوجیوں کو ورطہ حیرت میں دھکیلنے کو کافی تھا۔ دوسرے پل دونوں بے اختیار ہو کر ہنسے تھے۔ ”تم ہمیں کوئی پاگل دیوانے معلوم ہوتے ہو؟“

”ہاں تم ٹھیک سمجھے ایسا دیوانہ جو عالم دیوانگی میں تم لوگوں کو بھاری نقصان سے دوچار کرنے والا ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ مہین آواز والے نے اپنی اسٹین گن کی نال اس کی جاب کر دی مگر غازی شاہ جانتا تھا وہ فائر کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔ گولی اگر صحیح ہدف سے ہٹ کر کسی بھی چوبی پیٹی پر لگ جاتی تو اندر بھرا بارود پھٹ جاتا۔ اتنی عقل تو بہر حال وہ بھی رکھتے تھے کہ وہ پیٹیوں کے پیچھے ان کے کسی بھی صحیح نشانے کے دائرہ عمل سے باہر تھا۔

ان دونوں کو باتوں میں لگائے رکھنے کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ وہ طلحہ احمد سے رابطہ قائم کر لیتا اور دوسرا اپنی اندر کی نفرت کی آگ باہر نکال سکتا۔

اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس نے طلحہ احمد سے رابطہ قائم ہوتے ہی کہنا شروع کیا۔

”میرے رفیق میرے دوست! میں زندگی کی بازی ہار گیا ہوں۔ مگر فخر سے میرا دل لبریز ہے۔ میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ اب تم اپنا کام شروع کر دو اور دیکھو یہ میرا حکم ہے اور حکم ٹالنے کے لیے نہیں ماننے

کے لیے ہوتا ہے۔الوداع رفیقو! الوداع..."

دونوں فوجیوں کے چہرے لحظہ بھر کو فق ہوئے تھے۔ان کے دل یقیناً خوف سے سکڑے تھے مگر دوسرے پل انہوں نے اپنی حیرانی پر قابو پالیا۔ایک نے فوراً ہی وائرلیس پر رابطہ قائم کیا۔انہیں احساس ہو گیا کہ وہ جسے خبط الحواس شخص سمجھ رہے تھے وہ ان کے لیے قیامت ثابت ہو رہا ہے۔

وائرلیس پر رابطہ ہوتے ہی پوری عمارت میں زلزلہ آگیا۔ایک مجاہد کے ڈپو میں داخل ہو جانے کی خبر سب پر بم کی طرح پھٹی تھی۔کنٹرول روم حرکت میں آگیا مگر غازی شاہ اس سے کہیں زیادہ تیزی دکھا چکا تھا۔

وہ اب ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ فوجی بوٹوں کی دھمک سن رہا تھا۔

ان دونوں فوجیوں کو ابھی حرکت کرنے کا موقع ملتا' ایک کان پھاڑ دھماکہ ہوا۔دروازے سے نزدیک والا فوجی ٹینس کی گیند کی طرح فضا میں اچھلا اور چھت سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔اسے شاید تڑپنے کا بھی موقع نہ ملا تھا۔دوسرا کافی دور جا کر گرا تھا۔اس کا سر کھڑکی کی آہنی گرل سے ٹکرایا اور پھٹ گیا جبکہ غازی لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا تھا۔

یہ دھماکہ اسی کمرے میں ہوا تھا جہاں اس نے پہلا ڈائنامائٹ سیٹ کیا تھا۔ہر طرف بھگدڑ مچ گی۔بدمست نشے میں چور فوجیوں کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔موت کی دہشت نے ان کے حواس چھین لیے۔تجربہ کار اور نہتے کشمیریوں پر مظالم ڈھانے والے دہشت زدہ چوہوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے نظر آنے لگے۔

مزید اردو کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:
www.pakistanipoint.com

ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد دوسرا اور تیسرا دھماکہ ہوا جو اسلحہ خانے کی درودیوار کو ہلا گیا۔بارود سے بھری پیٹیوں میں آگ بھڑک اٹھی اور جیسے قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔

غازی شاہ نے خود کو دھنکی ہوئی اون کی طرح ہوا میں لہراتا ہوا پایا پھر اس کا سر کسی وزنی شے سے ٹکرایا۔اس کی سنہری آنکھوں کے آگے دھند پھیل گئی۔آگ کے بلند ہوتے شعلے اس نے اپنے ارد گرد محسوس کیے۔

بارود کی تیز بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔اس کا مطلب تھا اس کے حواس خمسہ ابھی سلامت تھے۔اس نے ہاتھ بہ مشکل اٹھایا اور اپنے سینے پر رکھ لیا۔اس نے محسوس کیا اس کی سانسیں اس کے سینے میں ابھی محفوظ تھیں مگر رک رک کر چل رہی تھیں۔اس میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔

آگ کا نارنجی شعلہ رقص کرتا ہوا اس کی طرف لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔سلگتی آگ کی تپش وہ اپنی رانوں پر محسوس کرنے لگا مگر یہ تپش اس مسرت پر حاوی نہ ہو سکی جو اس کا دل محسوس کر رہا تھا۔ہندو فوجیوں کی چیخ و پکار' آہ و بکا اس کی سماعتوں پر ساز کی طرح بج رہی تھیں۔وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔

مظلوم کشمیری مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنے کا منصوبہ بنانے والے غلیظ چیتھڑوں کی طرح فضا میں ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔عمارت کی دیواریں ملبے کا روپ دھار رہی تھیں۔چوبی پیٹیوں اور دیواروں کے حصے اڑتے پھر رہے تھے۔

ان کے لیے آج ہی قیامت کا دن تھا۔آج ہی صور پھونکا گیا تھا۔یہ صور غازی شاہ نے پھونکا تھا۔

اس کی بند ہوتی سانسوں اور آگ کی تپش سے سلگتی نم نم آنکھوں میں ایک عکس اتر آیا۔

وہ سنہری پروں والی پری کا... جو اسے بازوؤں میں بھرنے کو آسمان سے اتر کر اس کی طرف آ رہی تھی۔ اسے لوری کی آواز آنے لگی۔

اب اس کے ارد گرد کوئی آگ نہیں تھی۔ روح کو جھلسانے والی کوئی تپش نہیں تھی۔ وہ کشمیر جیسی ایک حسین وادی میں اتر گیا تھا جہاں اس کی پریوں جیسی ماں اسے لوری دیتی اپنی آغوش میں سمیٹ چکی تھی۔

☆...☆...☆

طلحہ احمد نے غازی شاہ کا پیغام ملنے کے بعد جس طرح ریموٹ کنٹرول پر اپنی گرفت رکھی اور اس کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اسے لگا اس لمحے وہ اذیت کے ایک پل صراط سے گزرا ہو۔ جس کے بعد اس کا دل خالی ہو چکا ہو۔

''طلحہ احمد' طلحہ احمد!'' اس کے رفیق اسے جھنجھوڑ رہے تھے۔ سرخ بتی کا اشارہ مل رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا یہ اشارہ نہ ہو' موت کا پیغام ہو۔ اس کے ساتھی' رفیق' دوست کی شہادت کا پیغام۔

''کم آن طلحہ احمد' آرڈر از آرڈر۔'' اس کے رفیق نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ یہ وقت جذبات کا نہیں ہے۔ یہ غازی شاہ کی محنت کو آخری رنگ دینے اور اس کے خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا وقت ہے۔''

اس نے جذبات کی لو نیچے کر لی۔ پلکوں پر لرزتے آنسو پی لیے۔

ایک ساتھی نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز دباؤ ڈالا تھا اور اس کی انگلیاں ریموٹ پر حرکت کرنے لگیں۔

اس کے بعد ان سب نے کان پھاڑنے والے دھماکوں کی آواز سنی۔ اور طاقتور دوربینوں سے شعلے اڈتے دیکھے۔ بلند و بالا عمارت کے حصے' تار تار مورچے اور مردار فوجیوں کے ہوا میں اڑتے حصے بتا رہے تھے کہ غازی شاہ نے اپنا کام خوبی اور کاریگری سے کیا تھا۔

☆...☆...☆

طلحہ احمد کیمپ کے ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے دل کو اپنے پیارے کمانڈر کے جملوں کی باز گشت سے سلگتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا ایک ہی آواز مسلسل اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور ابدی یاد بن کر اس کے دل میں سمٹ گئی تھی۔ اس کی روح کا حصہ بن گئی تھی۔

''الوداع میرے رفیق! الوداع۔''

غازی شاہ کی ذاتی ڈائری اس کے سامنے رکھی تھی۔ اس کا مخصوص قلم اس کے اندر ٹکا ہوا تھا۔ کل رات وہ اسی گوشے میں بیٹھا اسی ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ کیا لکھ رہا تھا' وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی جب بہت تھک جاتا تو قلم اور ڈائری سنبھال لیتا۔ ایسے میں کوئی اسے تنگ نہ کرتا اور مداخلت کرنے پر وہ برا مان جاتا تھا۔

ڈائری اور قلم کے علاوہ ایک رسٹ واچ تھی اور ایک سوکھا گلاب بھی تھا۔

یہ ساری چیزیں اس کے پاس امانت تھیں جو اسے مومنہ تک پہنچانی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔ وہ امانت کے ساتھ یہ خبر مومنہ اور مولوی خضر محمد تک کیسے پہنچائے گا۔

وہ جانتا تھا کل کے اخبارات رات کے اس ہولناک واقعہ کی خبروں سے بھرے پڑے ہوں گے۔ مسلمانوں کے دل خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔ بھارتی سرکار کو لگنے والا یہ دھچکا کوئی معمولی دھچکا نہ تھا۔ ہندو اپنی شرمناک شکست کے یہ زخم برسوں تک چاٹتے پھریں گے۔ مسلمانوں پر سختیاں بڑھ جائیں گی۔ وہ زخمی ناگ بن کر ڈستے پھریں گے اور ایک عرصے تک اس نقصان پر سر پیٹتے رہیں گے۔

ہوا کے زور سے اس کی پلکوں پر ٹھہری نمی تیرنے لگی۔ ٹھنڈک محسوس کر کے اس نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے باقی مجاہد رفیق کیمپوں کے اندر ادھر ادھر بالکل خاموش بیٹھے تھے جیسے کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔ خوشی کا احساس اس صدمے کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے پیارے کمانڈر کو کھو چکے تھے۔ ایسا کمانڈر جو کمانڈر کم' دوست اور دمساز زیادہ تھا۔ جو ناممکن کاموں کو ممکن بنانے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ جس کی لغت میں ناممکن کا لفظ نہیں تھا۔ جو بازی جیت گیا تھا مگر اپنے پیچھے اپنے احباب اپنے ساتھیوں کے لیے کسک چھوڑ گیا تھا۔

وہ ڈائری اٹھا کر اس کے وجود کی خوشبو محسوس کرنے لگا۔ اسے وہ مضبوط چوڑا سینہ یاد آنے لگا جو دشمنوں کی طرف سے کھلنے والی فائر میں بھی ہمیشہ آگے رہا تھا۔

اس کے مضبوط ہاتھ کا لمس ستانے لگا جو اس کی کمر کے گرد حمائل ہو جایا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی وہ اسے بچوں کی طرح اپنے وجود میں سمیٹ لیا کرتا تھا۔

اس کی بھاری گمبھیر آواز جو سارے مجمع کو ایک طلسم میں جکڑ لیتی تھی جس کی آواز کی گونج میں سچائی کھنکتی تھی۔ جس کی سنہری آنکھوں میں اس کے باطن کی چمک فروزاں ہو کر انہیں دو چمکتے ہیرے بنا دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اسے مافوق الفطرت ہستی لگتا تھا۔

اس کی مسکراہٹ... اس کا لہجہ' اس کا آنکھوں کو جنبش دینا۔ کیا کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔

ایک روشنی اس کے تصور سے ہی اس کے ذہن میں ابھر رہی تھی۔ ہاں وہ ایسی ہی روشنی تھا جو اجالا بن کر ان سب کی راہوں کو منور کر کے منزلوں کے نشان کی طرح راستہ سجھاتا رہتا تھا۔

وہ کہا کرتا تھا۔ ''موت تو ہر ذی روح کا مقدر ہے میرے رفیق! مگر اصل موت تو وہ ہے جو مر کر بھی اسے زندہ رکھے۔'' اور وہ خود ایسی ہی موت پا گیا تھا۔ دلوں میں بھی زندہ رہ گیا تھا۔

اس کی موت اندوہناک نہیں تھی۔ دل آویز تھی۔ وہ اکیلا نہیں مرا تھا۔ اپنے ساتھ کتنے بھارتی درندے مردار کیے تھے۔ ایک ناقابل تلافی نقصان کفر کی طاقتوں کو پہنچایا تھا۔ کتنے دلوں کو خوشی سے ہمکنار کر گیا تھا۔ کتنوں کے خواب اور تمناؤں کو سنوار گیا تھا۔

یہ موت نہیں تھی' فتح تھی اور فتح پر آنسو نہیں بہائے جاتے۔ طلحہ احمد!

اس کی شہادت کا سواگت کرو۔اسے خوشی خوشی محسوس کرو کہ وہ بیٹھا جنت کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا ہو گا۔وہ ایسی فنا کی طرف گامزن ہوا ہے جس پر بقا قربان ہے۔

اسلحہ خانے پر اس مست نوجوان نے عشق اور محبت کی ایسی جست لگائی کہ مقربین میں جا پہنچا ہے اور آن واحد میں علیین کا باسی بن گیا اور تم رو رہے ہو۔اس کی فتح پر اسے ملنے والے انعام پر رو رہے ہو۔دراصل تم جیلس ہو رہے ہو۔ہاں تمہیں حسد ہو رہا ہے... ہے نا! طلحہ احمد کے اندر بازگشت ہونے لگی۔وہ خود کو ہزاروں حیلوں سے بہلا رہا تھا اور بہل بہل کر بکھر رہا تھا۔

کسی نے اس کے کندھے کو ہلکے سے چھوا۔

”مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔ابو عمیر! سلطان! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ گھٹنوں میں سر دیئے دیئے کراہا۔مگر اس کے کندھے پر ہاتھ ابو عمیر یا سلطان کا نہیں تھا۔وہ کانپتا ہاتھ مولوی خضر محمد کا تھا۔

”ہیں تو اسے ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا تھا۔“ مولوی خضر محمد کی آواز سن کر طلحہ احمد نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ان کے لرزیدہ بدن کو ابو عمیر نے سنبھالا دیا ہوا تھا۔ان کا دوسرا ہاتھ طلحہ احمد کے کندھے پر تھا۔جسے ہٹا کر انہوں نے قریبی دیوار پر رکھ لیا۔اور اسی دیوار کا سہارا لیے لیے فرش پر بیٹھ گئے۔

”مگر یہاں... اس لڑکے نے اور ہی خوشخبری سنا دی۔“ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے طلحہ احمد کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگے۔ان کی سفید داڑھی آہستہ آہستہ بھیگنے لگی۔

”اس نے کچھ کھو کر سب کچھ پا لیا‘ عاشقوں کے اس بلند آشیانے کو پا لیا جسے کہتے بہت ہیں مگر پاتے کم ہیں۔ پاگل۔یہ تو خوشی کا مقام ہے۔تم رو رہے ہو۔“ مولوی خضر محمد نے اپنے دونوں بازو وا کر دیئے جس میں طلحہ احمد تڑپ کر کسی کم سن بچے کی طرح سمٹ گیا۔

مقام کرگس و شاہین ہے اپنے ظرف کی بازی
جو ٹھکرا دے صراحی کو اسے پیمانہ ملتا ہے

وہ لرزیدہ ہاتھوں سے طلحہ احمد کے بلکتے وجود کو تھپکنے لگے۔

☆...☆...☆

مومنہ طارق نہ سسی تھی نہ نوری تھی مگر اس نے سسی سے زیادہ اور نوری سے بڑھ کر اپنے محبوب کو چاہا تھا۔سو محبوب کی جدائی کی فطری اذیت سے بھی گزری۔

اسی انداز سے چل باد صبا آخر شب
یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
دل میں بھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب

وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب

کون کرتا ہے وفا عہد وفا آخر شب

لمس جانانہ لیے، ہستی پیمانہ لیے

حمد باری کو اٹھے دستِ دعا آخر شب

گھر جو ویراں تھا سر شام وہ کیسے کیسے

فرقت یار نے آباد کیا آخر شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اولِ صبح

اسی انداز سے چل بادِ صبا آخر شب

اس نے کاٹ میں سوئے ہوئے بچے پر نگاہ ڈالی۔ سرخ و سپید چہرے پر چمکتی دو سنہری آنکھوں کے جگنو ماں کو دیکھ کر اور چمکنے لگے۔ وہ ننھے منے ہاتھ پیر زور زور سے ہلاتے ہوئے ہمکنے لگا۔

اس کے سنہری ریشم جیسے بال پنکھے کی ہوا سے اڑ رہے تھے جسے وہ ہولے ہولے سہلانے لگی۔

”طلحہ احمد تم سے ملنے آیا ہے مومنہ!“ عائشہ نے اس کے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ چونکی اور ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”ہاں بھیج دو اسے۔“ اس نے اپنی سفید چادر کو اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ طلحہ احمد اس کی اجازت پا کر اندر داخل ہوا۔

”میں آپ کی عدت پوری ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ”میرے پاس آپ کی امانت تھی جو مجھے آپ تک پہنچانی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چھوٹا سا چرمی بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ پھر ذرا سی نگاہ اٹھا کر بے بی کاٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا میں... علی شاہ کو دیکھ لوں؟“

”آں... ہاں... ہاں، کیوں نہیں۔“ طلحہ احمد کو جواب دے کر وہ چرمی بیگ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

طلحہ احمد کاٹ کے نزدیک آکر رک گیا۔ اس کی نگاہیں بچے پر اٹھیں تو حیرت اور مسرت کے مشترکہ احساس سے جھپکنا بھول گئیں۔ وہ ہو بہو غازی شاہ کی صورت تھا۔ وہ بے اختیار جھکا اور اسے گود میں بھر لیا پھر یکدم چونکتے ہوئے بولا۔

”میں بلا اجازت اسے اٹھا لینے پر معذرت خواہ ہوں۔“ وہ اپنے بے اختیارانہ فعل پر جھینپا ہوا تھا۔

”نہیں طلحہ احمد! اس میں معذرت کی کیا بات ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

"کیا میں اسے کچھ دیر کے لیے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟" طلحہ احمد نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر اس کی اٹھنے والی استفہامیہ نگاہوں پر جلدی سے وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

"میرا مطلب ہے اس کمرے سے باہر، صحن میں کچھ دیر اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں ایسی معصومیت تھی کہ مومنہ اسے دیکھ کر رہ گئی اور سر ہلا دیا۔

وہ علی شاہ کو اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ دوبارہ اس چرمی بیگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیگ میں ایک سیاہ ڈائری تھی جس میں اس کا ایک قلم دبا ہوا تھا۔ ایک رسٹ واچ تھی اور گلاب کا ایک سوکھا پھول جو بے حد احتیاط سے پولی تھن بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں گلاب کے اس سوکھے پھول پر جم گئیں۔ یہ وہی پھول تھا جو آخری ملاقات پر غازی شاہ نے اس کے بالوں میں لگایا تھا اور جسے جدا ہوتے وقت اس نے اپنے بالوں سے نکال کر اور لبوں سے لگا کر اس کے کرتے کی اوپری جیب میں اٹکا دیا تھا۔

یادوں کا ایک ریلا سا اٹھا اور نگاہوں میں گزرا وقت ٹھہر گیا۔

اس نے پھول احتیاط سے نکالا اور اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں نمی پھیلنے لگی مگر پلکوں کی مضبوط باڑھ نے اس نمی کو باہر نکلنے سے روکے رکھا۔

"تم نے سچ کہا تھا۔ یہ فاصلے اور قربتیں تو یونہی بے معنی علت ہیں۔ بے حقیقت مہریں ہیں۔"

وہ کتنی دیر اسے لبوں اور آنکھوں سے لگاتی رہی پھر ڈائری کے اندرونی صفحے میں رکھ دیا اور ڈائری کے ورق پلٹنے لگی۔ جگہ جگہ غازی شاہ کی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ نے موتی پروئے تھے۔ کہیں خود کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔ کہیں اسے مخاطب کر کے لکھا تھا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا تو اس نے ڈائری بند کر دی اور قیمتی متاع کی طرح اپنے سینے سے لگا لی۔ طلحہ احمد، علی شاہ کو اٹھائے اندر داخل ہوا۔

"یہ شاید اس کے سونے کا وقت تھا۔ میں نے ناحق اسے پریشان کر دیا۔" اس نے سوئے ہوئے علی شاہ کو کندھے سے اتار کر کاٹ کے گداز بستر پر لٹا دیا۔

"نہیں اس کے سونے کا وقت تو نہیں تھا۔" اس نے بچے پر نگاہ ڈالی۔ "کچی نیند ہے، ابھی اٹھ جائے گا آدھے گھنٹے کے بعد۔" پھر ایک سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"شاید یہ بھی اپنے باپ کی طرح نہ سونے کی خبر دیتا ہے۔ نہ جاگنے کی۔" بظاہر وہ مسکرائی تھی مگر جانے کیوں فضا پر ایک مضمحل سی خاموشی کچھ دیر کے لیے چھا گئی۔ طلحہ احمد کو اپنا دل اسی فضا کا ایک حصہ محسوس ہونے لگا۔

"کیا بات ہے طلحہ احمد! تم شاید کچھ کہنا چاہتے ہو؟" وہ اس کا اضطراب محسوس کرتے ہوئے بولی تو طلحہ احمد کی نظریں اس کی جانب اٹھیں پھر کاٹ میں سوئے علی شاہ پر مرکوز ہو گئیں۔ ایک دو لمحے توقف کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"کیا میں علی شاہ کو باپ کا پیار دے سکتا ہوں سرجن مومنہ؟" پھر وضاحت کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "باخدا میں یہ بات کسی بری نیت سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ نہ میرے دل میں کوئی کھوٹ ہے' نہ گمراہ کن خیال۔"

مومنہ نے حیرت سے بغیر پلکیں جھپکائے طلحہ احمد کو دیکھا۔ اسے اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ شاید اس لیے کہ اس کے ذہن کے کسی بھی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ طلحہ احمد کوئی ایسی بات کرے گا۔ بے شک وہ بدکردار یا بدنیت نہیں تھا۔ اس کا باطن بھی اس کے ظاہر کی طرح شفاف تھا۔

اس نے سوچا شاید وہ غازی شاہ سے دوستی کا کوئی حق ادا کرنا چاہ رہا تھا۔

ایک گہری سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر وہ اپنے سینے پر رکھی ڈائری پر بازوؤں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے طلحہ احمد کو دیکھ کر یوں مسکرائی جیسے کوئی بچے کی بچکانہ بات سن کر مسکرائے۔

"کیا تم مجھ سے ہمدردی کرنا چاہ رہے ہو۔ تمہارے خیال میں' میں لائق ہمدردی ہوں۔" اس نے کہا تو طلحہ احمد تڑپ گیا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

"تمہارا جذبہ سر آنکھوں پر طلحہ احمد! میں نے تمہیں ہمیشہ بھائی کہا ہی نہیں' سمجھا بھی ہے۔ شہید کی بیوی ہونا میرے لیے کوئی کم اعزاز کی بات نہیں ہے۔" اس نے بے بی کاٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"میرے پاس زندہ رہنے کے لیے علی شاہ کے علاوہ یہ خوشی اور فخر بھی ہے کہ میں غازی شاہ کی بیوی ہوں۔ اس شہید کی بیوہ جو جنت کا حقدار ٹھہر چکا ہے۔ کیا میں اسی جنتی ساتھی کی بیوہ ہونے کے اعزاز اور خوش بختی سے منہ موڑ لوں طلحہ احمد!"

"بے شک یہ اعزاز واقعی کم نہیں ہے۔" طلحہ احمد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے عقیدت چھلک رہی تھی۔ اس کا دل بھی ایسی ہی عقیدت محسوس کر رہا تھا۔

"میری بات نے اگر آپ کو دکھ پہنچایا ہے تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

"نہیں طلحہ احمد! تمہاری اس بات نے مجھے کوئی دکھ نہیں پہنچایا۔ میں جانتی ہوں تم اپنے رفیق کی دوستی کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ حق تو تم نے ادا کر دیا طلحہ احمد! ان چیزوں کو سنبھال کر اور مجھ تک پہنچا کے۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گی۔" اس نے ڈائری کو سینے سے ہٹا کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"رفاقت وہی نہیں ہے جو دکھائی دے۔ رفاقت وہ بھی ہے جو محسوس کی جاتی ہے۔ قربتیں اور فاصلے روح و قلب کے تعلق میں بے معنی ہوتے ہیں' جدائیاں ہی تو محبت کو عشق بناتی ہیں۔"

طلحہ احمد سر جھکائے بے آواز کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے قدم گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مومنہ کے کمرے کے باہر دیوار کی اوٹ میں کھڑی عائشہ اس کے نقش پا کو دیکھتی رہ گئی۔ پھر آہستگی سے اپنی جلتی آنکھیں بند کر لیں۔ دو نمکین قطرے پلکوں پر چمک کر ٹوٹے اور رخساروں پر بہنے لگے۔

ختم شد